اٹھارہ سو ستاون کے راہ نما

(سوانحی خاکے)

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

اٹھارہ سو ستّاون کے راہ نما

(سوانحی خاکے)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110 066

پہلی اشاعت : جنوری 2009
تعداد : 550
قیمت : -/349 روپے
سلسلہ مطبوعات : 1309

1857 Ke Rahnuma (Swanhey Khakey)

ISBN : 81-7587-264-0

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، 167/8، سوناپریا چمبرس، جولینا، نئی دہلی۔110025
Paper used 70 Gsm TNPL

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 1857 کی 150 ویں سالگرہ کے موقع پر تیار کروائی ہے۔ 1857 کی بغاوت ہماری قومی تاریخ کا اہم ترین سانحہ ہے جس نے ہندوستان کی جنگ آزادی کو ایک نیا اور فیصلہ کن موڑ دیا۔ اس جنگ میں ہندوستانی آزادی کے متوالوں نے جو قربانیاں دیں ان کو یاد کرنا ہمارا خوشگوار علمی و ادبی اور قومی فریضہ ہے۔ اس کی ادائیگی کی ادنیٰ سی کوشش یہ کتاب ہے جس میں اٹھارہ سو ستاون کے ہیروز کے خاکے اردو کے مستند خاکہ نگاروں سے لکھوائے گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب پسند کی جائیگی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر علی جاوید
ڈائرکٹر

فہرست

دیباچہ

یہ چند صفحات انتخاب ہیں ان متعدد مضامین کا جو 1857 کے مجاہدین کے بارے میں لکھے گئے ان میں اکثر مجاہدین کے بارے میں معلومات بہت کم دستیاب ہے اور جو ہے بھی وہ پوری طرح مصدقہ نہیں ہے البتہ جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کو بعض محققین نے سند اور اعتماد کے ساتھ یکجا کر دیا ہے۔

ان مجاہدین کے بارے میں یہ بھی اہم ہے کہ ان کے حالات زندگی تفصیل کے ساتھ نہیں ملتے اور جو ملتے ہیں ان میں بھی اِدھر اُدھر کی باتیں یکجا ہو گئی ہیں البتہ ان الجھی ہوئی معلومات سے بھی کچھ باتیں واضح ہوتی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ 1857 کی جنگ کے آخری حصے میں ایک وفاقی حکومت کا دھندلا سا ہی تصور ابھرنے لگا تھا یہ ہندوستانی سیاست کی نئی کروٹ تھی اور اگر جنگ اتنی جلد نہ کچل دی گئی ہوتی تو شاید امریکی جمہوریت اور انقلاب فرانس کے طرز پر یہاں بھی کوئی نیا نظام پنپ سکتا تھا اسی سے جڑی ہوئی بات یہ بھی ہے کہ بہادر شاہ گو نام ہی کے بادشاہ رہ گئے تھے مگر ان کے نام پر کم و بیش سبھی متحارب عناصر کا اتفاق رائے تھا اور ان کی مدد سے آخر تک ایک عسکری وحدت قائم کرنے کی تجویز زیر غور تھی جس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

علاوہ بریں ایک اہم انقلابی تحریک تھی خواتین مجاہدین کی حیثیت سے مہارانی لکشمی بائی اور بی بی حضرت محل کا جنگ میں فعال کارکن اور مجاہد کی حیثیت سے شریک ہونا۔ ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ اس طرح منتخب ہو کر کسی مزاحمتی فوج کی رہبری کرنے کا کام خواتین نے اس سے پہلے بہت کم انجام دیا ہے مگر یہاں ہر طریقے کی مخالفتوں کا سامنا کرتے ہوئے رانی لکشمی بائی اور بی بی حضرت محل نے جنگ کی رہنمائی کی۔

تاریخ گواہ ہے کہ فتح و شکست کے بعد مورخین کا نقطۂ نظر بھی بدل جاتا ہے اور تاریخ کو حسب ضرورت ڈھال لیا جاتا ہے بہادر شاہ ظفر جیسے معزول شہنشاہ بے آبرو ہو جاتے ہیں اور کل

کے تاجر اور مہم باز اقتدار حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک اور اہم تبدیلی نقطۂ نظر میں ہوتی ہے ہندوستان کے مورخین نے اس ضمن میں غیر معمولی تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے اور زیادہ تر مورخین انگریزوں کے اشارے پر بیانات دیتے رہے اور عدالتوں میں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوتے رہے آج ان پر انگشت نمائی آسان ہے لیکن 1857 کے آس پاس اس کا تصور بھی ممکن نہ تھا اور اگر اس قسم کی کوئی جرأت کرتا تو مولانا امام بخش صہبائی اور محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر کی طرح جو اپنے دور کے مشہور صحافی اور ادیب تھے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا:

لیکن اپنے دور کی سچائیاں بھی کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طور سے ظاہر ہو کر رہتی ہیں اور بعد کے لکھنے والے کچھ نہ کچھ اندازہ لگانے میں تھوڑی بہت ہی سہی کامیابی حاصل کر لیتے ہیں گو ان اندازوں سے ان شہیدوں اور جاں باز عورتوں اور مردوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا جنھوں نے اپنے وطن اور اصول کی خاطر جان جیسی قیمتی شے داؤ پر لگا دی اور بازی ہار دی۔

لیکن ہار جیت کا کھیل ہندوستان میں جس جرأت اور ہمت سے کھیلا گیا اس کی نظیر عالمی تاریخ میں کسی اور جگہ ملنا دشوار ہے پوری صدی گزر گئی اور ان قربانیوں کی حقیقت چھپی رہی اور ان لوگوں کے نام اور کام پردۂ خفا میں رہے بہر حال وہ تصورات جو ان قربانی دینے والے مجاہدین کے پیش نظر تھے یا جو ان کے ذریعے منظر عام پر آئے وہ قابل لحاظ ہیں وہ اپنے طور سے کئی قدم آگے بڑھ کر قربانیاں دے رہے تھے اور اس اندھیرے میں چراغ جلا رہے تھے جو نہ صرف ان کے اپنے زمانے کو روشنی بخش رہے تھے بلکہ اس کے بعد بھی نہ صرف سیاسی نظام کو بلکہ پوری اجتماعی زندگی کو آب و تاب سے نواز رہے تھے۔

بہادر شاہ ظفر ایک کمزور اور بے طاقت فرماں روا سہی مگر انھوں نے اس آخری دور میں جس طرح انگریز حکمرانوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت دکھائی وہ اس دور کو منور کرنے کے لیے کافی ہے ان کے اہل و عیال کی قربانیاں اور اس دور کے بعض حکمرانوں کی یک جہتی ایسی مثالیں ہیں جو ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہیں گی۔

اس طرح پر وفاقی طرز حکومت کی بنیاد قائم کرنے کی کوششیں ہونے لگیں جو مناسب فضا نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں ایشیا اس وقت تک صرف ذاتی وجاہت اور شجاعت کی

بنیاد پر فرماں روائی کا قائل تھا کہ اسی اصول پر اکثر علاقوں میں حکومتیں قائم تھیں۔

سنجیدگی سے جائزہ لیا جائے تو مجاہدین آزادی ایک ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہے تھے زمانہ وہ تھا جب بارود کے نت نئے خزانے دریافت کیے گئے تھے آلات حرب مکمل طور پر بدل گئے تھے اور لڑائی کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے ہندوستان کے تمام والیان ریاست کسی نہ کسی طریقے سے خود اپنی شکست کے عہد ناموں پر دستخط کر چکے تھے اور ذہنی طور پر ہار تسلیم کر چکے تھے پھر بھی کہیں دبی ہوئی خودداری کی چنگاری تھی جو انھیں جاں نثاری کے لیے آمادہ کر رہی تھی بہادر شاہ ظفر کا پہلے مذبذب رویہ اور پھر جاں نثاری سے جنگ کی رہبری کے لیے آمادگی اس کی مثال ہے بیگم حضرت محل کا فرار ہونا، بخت خاں کا لاپتہ ہو جانا اور جنگ جاری رکھنے کا عزم اور تاتیا ٹوپے کی بدلتی ہوئی حکمت عملی اس کبھی نہ ختم ہونے والے آزادی کے جذبے کی نشانیاں ہیں جو ان کے بعد بھی زندہ رہا۔

یہ حیرت خیز بات ہے کہ آزادی کی اس لڑائی میں ایک خاموش مجاہدہ بھی محارب قوتوں کے درمیان ہو گیا کہ اس کی رسمی اور واضح شکل سامنے نہیں آئی دراصل اس سے قبل انگریزوں کی سبھی فتوحات کو علیحدہ علیحدہ کامرانیوں اور کامیابیوں کی شکل میں دیکھا جاتا تھا اور ان کی فوجی مہمات کو انفرادی راجا یا نواب کے خلاف فوجی کارروائی سمجھا جاتا تھا لیکن 1857 میں پہلی بار پوری ہندوستانی پلٹن کو یہ علم ہوا کہ انگریز پورے ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے ہیں اور بہادر شاہ ظفر کی جگہ تخت نشین ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں یہ غیر ملکی تسلط عام طور پر ہندو اور مسلمان رعیت کو منظور نہ تھا اور اسے سیاسی ہی نہیں ذہنی اور تمدنی غلامی سمجھا گیا۔ 1857 کی جدوجہد کا یہ پہلو ہنوز تحقیق و تفتیش کا محتاج ہے یہ گویا ہندوستان کی تہذیبی شکست تھی جسے عوام تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اس شکست کا ایک پہلو سور کی چربی اور گائے کی چربی سے بنے ہوئے کارتوسوں کی شکل میں سامنے آیا جو اس ذہنی غلامی کا مظہر تھا اس میں جانشینی کا سوال بھی شامل ہو گیا اور ہندوستان کے بااختیار راجاؤں اور نوابوں کو برطرف کرنے یا انھیں تخت نشین کرنے کے مسئلے سے جڑ گیا۔ گویا ہندوستان کا پورا تہذیبی اور سیاسی ڈھانچہ ہی اس طرح زد میں آ گیا سوال اب بہادر شاہ ظفر کے تخت و تاج کا نہیں تھا پورے ہندوستان پر قبضہ اور اقتدار حاصل کرنے کا تھا اس لحاظ سے بھی بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلانے کا حق کسی طور سے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کو نہیں پہنچتا۔

اس سلسلے کا آخری اہم نکتہ یہ ہے کہ اس جنگ آزادی میں خواتین نے نہ صرف اہم حصہ لیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کا کردار مرکزی کردار رہا خاص طور پر مہارانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل کے کردار اس قدر اہم رہے کہ ان کی جاں بازی اور شجاعت کا مقابلہ اور کوئی نہیں کر سکا مہارانی لکشمی بائی نے لڑتے لڑتے جان دی اور اس بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا کہ خود دشمن مورخین سے خراج تحسین پایا اور بیگم حضرت محل نے اس معرکے کو اس طرح فتح کیا کہ انگریز سپاہیوں اور جاسوسوں کی ساری کوششوں کو ناکام کر کے نیپال کے جنگلوں میں اس طرح گم ہو گئیں کہ ان کا پتہ نشان آج تک نہ مل سکا۔

یہ کوئی اتفاقیہ حادثے نہ تھے بلکہ ان کے پیچھے نہایت ماہرانہ جنگ کی رہنمائی کی لیاقت اور کارکردگی چھپی ہوئی تھی مہارانی لکشمی بائی کی جن خواتین مجاہدوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں ان میں مندرا قابل ذکر ہیں اور انہی میں وہ جاں باز مجاہدہ بھی تھی جس نے آخری دم تک انگریز فوج کا مقابلہ کیا اور جب شہادت پائی تو انتقام کے طور پر خود مہارانی نے اس کے قاتل پر حملہ کر کے خود اپنی جان نچھاور کر دی۔

یہ جاں نثاری اور آقا اور باندی کی یگانگت کی یادگار مثال ہے اور اس قسم کی مثالیں کئی ہیں انہی سے اثر قبول کر کے پروفیسر محمد مجیب اور مہیشور دیال نے 1857 کے واقعات پر جب ڈرامے لکھے تو ان خواتین مجاہدوں کے کردار کو بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا۔

یوں تو 1857 کی لڑائی ایک یادگار معرکہ تھی مگر اس آگ میں تپ کر آزادی کا جذبہ وقتی طور پر ہی سہی ابھرا ضرور اور اس سے اثر قبول کر کے ہندوستان میں وقتاً فوقتاً تحریک آزادی کے مجاہدوں کو کس بل ملا۔ فتح مندی اس جنگ کے اولین مجاہدوں کی قسمت میں نہ تھی مگر انھوں نے جس جرأت مندی اور ہمت سے اس جنگ کی بے سروسامانی کے ساتھ ابتدا کی تھی آخر کار وہ رنگ لائی اور ان کی قربانیاں رایگاں نہیں گئیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خوں غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اسلم پرویز

بہادر شاہ ظفر

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر پر گفتگو کے آغاز سے پہلے یہاں ایک انگریزی کتاب کا تذکرہ ضروری ہے جو حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے اور جس کا آج ہر طرف چرچا ہے۔ سنہ 2006 میں شائع ہونے والی اس کتاب کا نام "The last Mughal" ہے جس کے مصنف اسکاٹ لینڈ کے باشندے ولیم ڈیل رمپل ہیں۔ ڈیل رمپل کی یوں تو اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ہندوستان کے آخری مغل شہنشاہوں کی تاریخ اور تہذیب سے متعلق ان کی تین کتابوں City of Djinns (1994), White Mughals (2003) اور ان کی حالیہ کتاب The Last Mughal (2006) کو خصوصی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ The Last Mughal کا ذیلی عنوان The Fall of a Dynasty, Delhi 1857 ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتاب دراصل بہادر شاہ ظفر پر نہیں بلکہ 1857 کی دہلی پر ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ 1857 کی دہلی کے منظرنامے کا مرکزی کردار بہادر شاہ ظفر ہی تھے۔ 1857 کے دور کے برٹش حکمرانوں نے تو 1857 کی شورش کو ہماری زبان میں 'غدر' اور اپنی زبان میں Sepoy Mutiny کا نام دیا ہے لیکن ہندوستانیوں کے نزدیک 1857 برطانوی نوآبادیاتی حکمراں طاقت کے خلاف ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کا دوسرا نام ہے، جو بہرحال ناکام رہی۔ ڈیل رمپل نے دراصل اپنی کتاب The Last Mughal میں بالخصوص دہلی کے حوالے سے 1857 کے تاریخی واقعے کی تعبیر تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے

میں ڈیل رسیل کا موقف جو بھی ہے یہ ہماری بحث کا موضوع نہیں۔

شاہ عالم ثانی (بہادر شاہ ظفر کے دادا) اور اکبر شاہ ثانی (بہادر شاہ ظفر کے والد) کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک یہ تین مغل بادشاہ اس تاریخی جبر کا شکار تھے جس کا نقطۂ عروج بہادر شاہ ظفر ثابت ہوئے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ شاہ عالم ثانی ایک معذور کی سی اور اکبر شاہ ثانی ایک مجبور محض کی سی زندگی گزار کر رخصت ہوئے جب کہ ظفر طوفان میں گھری ہوئی اس شکستہ کشتی کے مسافر تھے جس کے پرخچے اڑ چکے تھے اور اب اس کشتی کا مسافر یعنی بہادر شاہ ظفر طوفان میں ہچکولے کھاتا ہوا کبھی طوفانی موجوں کی ایال پکڑ کر ان پر سوار ہونے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے اور کبھی سانس پھول جانے اور دم گھٹ جانے کی کیفیت سے باہر آنے کے لیے ان لہروں کے وجود سے ذہنی طور پر فرار حاصل کرتا اور کبھی بالآخر ان کی طرف اپنے نحیف ونزار چہرے پر لہراتی ہوئی سفید ریش دراز کا پرچم صلح ان کے سامنے لہراتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تماشے میں سارا کھیل تاریخی جبر کے اس نقطۂ عروج کا تھا جس کی نوک پر ظفر کی شخصیت رقص کر رہی تھی گویا بقول غالبؔ وہ اس کیفیت سے گزر رہے تھے:

بہ رنگِ شعلہ می رقصم بہ آتش

بسانِ موج می بالم بہ طوفاں

ایسے میں بہادر شاہ ظفر کو غدار سمجھنا ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوگی، ان پر ترس کھانا بھی ان کے ساتھ ایک ظالمانہ ہمدردی ہوگی۔ دراصل ان کی شخصیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ان کے ساتھ ایک تعلقِ خاطر (Empathy) استوار کرنے کی ضرورت ہے اور ان سطور میں ہم بہادر شاہ ظفر کے ساتھ یہی تعلقِ خاطر پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

بہادر شاہ ظفر چاہے اپنے آپ میں ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک نہ ہوں لیکن وہ جس تاریخی جبر کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے اس نے خود بخود انھیں ایک غیر معمولی شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اس شخصیت کا ایک داخلی اور دوسرا خارجی وجود تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی داخلی شخصیت بھی علاحدہ علاحدہ دو وجودوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ہندوستان کے شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی وہ

شخصیت جو شاہ عالم ثانی کے انگریزوں کا پنشن خوار ہونے کے بعد سے خود اپنے زمانۂ ولی عہدی تک اس کتھارسس کو اپنے وجود کے اندر جذب کرتی چلی آ رہی تھی جو ان کے دادا اور باپ کا مقدر بن چکا تھا اور جو خود ان کا بھی مقدر تھا۔ اس کتھارسس کے ساتھ وہ اپنی شاعری کے ایک معتدبہ حصے میں نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

تسمہ تسمہ کر دیا بس کاٹ کر عاشق کی کھال
وہ فرنگی زادہ کلکتہ جو سیکھا ناپنا

ان روزوں اس گلی میں جاسوس جا بجا ہیں
کہہ دو کوئی ظفر سے واں آج کل نہ جاوے

جہاں میں اور توڑ ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے

کھول دے صیاد تو کھڑکی قفس کی شوق سے
بلبلِ بے بال و پر ظالم کدھر اڑ جائے گی

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

بہادر شاہ ظفر کا دوسرا داخلی وجود وہ تھا جو ان کی چہیتی نوعمر بیگم نواب زینت محل کے جن کے قبضے میں تھا، داخلی سطح پر اور لاشعوری طور پر اس جن کے ساتھ بھی وہ نبرد آزما تو تھے مگر المیہ یہ تھا کہ یہ نبرد آزمائی حریفانہ نہیں حلیفانہ خطوط پر جاری تھی۔ بہادر شاہ ظفر کا خارجی وجود مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے راگ رنگ میں ڈوبی ہوئی ان کی وہ شخصیت تھی جسے لال قلعے کی پنشن یافتہ فرصت کی زندگی نے انھیں (ماسوا اکبر) اپنے پیش رووں سے بھی کچھ زیادہ ہی جلا بخش دی تھی ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ ہندوستان کی باغی فوج کے لیے ہندوستان کا دوسرا نام بہادر شاہ ظفر کی

شخصیت بن گئی تھی جس کے بینر تلے وہ انگریزوں کے مقابلے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ تو یہ وہ سہ رخی جنگ تھی جس میں بہادر شاہ ظفر ہمیں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اس اعتبار سے 1857 کی حشر خیزیوں کا سب سے بڑا جھکولا تو ظفر ہی کے حصے میں آیا۔ ایسی صورت میں انھوں نے کبھی بہادری کے پینترے بدل کردار کیے تو کبھی بزدلی اور کبھی مصالحت کے پینترے بدل بدل کردار روکنے کی بھی کوشش کی۔ وار کرنے کا عمل ان کے ساتھ کم اور روکنے کا زیادہ رہا۔ ایسی صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ 1857 کے ڈرامے کے اس کردار کو ہمارے فکشن کے نقاد ہیرو قرار دیں گے یا اینٹی ہیرو۔ لیکن یہ بھی طے ہے کہ جس ڈرامے میں اینٹی ہیرو ہوتا ہے اس کا کوئی ہیرو دوسرے سے ہوتا ہی نہیں اس لیے تماشائی اس اینٹی ہیرو ہی کو اپنا ہیرو مانتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس اعتبار سے 1857 کی جنگِ آزادی کے بڑے سے بڑے جیالے سے پہلے اگر بہادر شاہ ظفر کا نہیں تو کس کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شہر کے تاراج ہونے کے بعد قلعے سے فرار ہو کر ہمایوں کے مقبرے میں روپوش ہونا ایک حکمتِ عملی بھی تو ہو سکتا ہے اور اس حکمتِ عملی کو آج ہم برنارڈ شا کے مشہور پلے ARMS AND THE MAN کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس تاریخی جبر کا کیا کیا جائے جس کا ہرکارہ مرزا الٰہی بخش کے روپ میں وہاں پہنچ کر اس حکمتِ عملی کو ناکام بنا دیتا ہے۔ چناں چہ مرزا الٰہی بخش کی جوابی حکمتِ عملی بہادر شاہ ظفر کے ساتھ وہ کر گئی جو لال قلعے پر برستے ہوئے انگریز کی توپوں کے گولے نہ کر سکے تھے۔ اور اس طرح (انگریزوں کا باغی؟) مغل شہنشاہ انگریزوں کے ہاتھوں غداری کا مورد الزام قرار دیا گیا — 'چہ دلاور است وزدے کہ بہ کف چراغ دارد'۔ پھر انگریزوں کے نہیں بلکہ تاریخی جبر کے اس باغی کو ایسی سزا دی گئی جو 1857 کے بڑے سے بڑے باغی کو بھی نہیں ملی تھی۔ اسے دوسرے تمام باغیوں کی طرح نہ تو گولی سے اڑایا گیا اور نہ سولی پر چڑھایا گیا بلکہ ملک بدر کر کے جلاوطنی کی کرب ناک زندگی گزارنے کے لیے لے جا کر رنگون کی اجنبی سرزمین پر ڈال دیا گیا:

عدو زندہ سرگشتہ بہرا مت
بہ از خونِ او کشتہ بر گردنت

لیکن انگریزوں کی طرف سے بہادر شاہ ظفر کی جان، اس قدر کی پاس داری میں نہیں بخشی گئی کہ ہم عدو کے قتل کا بھی گناہ اپنی گردن پر کیوں لیں بلکہ اس لیے کہ انگریز انھیں اپنے

ہندوستان، اپنی دلّی اور اپنے لال قلعے سے دور بہت دور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے اور ایسا ہی ہوا بھی۔

ڈیل رمپل کے نزدیک 1857 کی دہلی ایک سلطنت کے زوال کا دوسرا نام ہے لیکن آج ہمارے لیے 1857 کی دہلی پانی پت کا وہ میدان ہے جہاں بہادر شاہ ظفر کے بینر تلے آزادی اور انقلاب کی پہلی (ناکام) جنگ لڑی گئی جس کے ٹھیک نوے سال بعد اس سے اگلی نسلوں کے ایک فرزند جواہر لال نہرو نے اسی لال قلعے پر بالآخر ہندوستان کی مکمل آزادی کا جھنڈا لہرایا۔

(2)

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ان کی ولادت ان کے والد اکبر شاہ ثانی کے زمانۂ ولی عہدی میں اکبر شاہ ثانی کی ہندو بیوی لال بائی کے بطن سے ہوئی۔ ظفر کی تاریخ پیدائش 28 شعبان 1189ھ مطابق 14 اکتوبر 1775 ہے۔ وہ منگل کے روز غروب آفتاب کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا جس کے اعداد 1189 ہوتے ہیں۔ اسی رعایت سے انھوں نے اپنا تخلص بھی ظفر رکھا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے جدامجد شاہ عالم (ابن اورنگ زیب ثانی) کا لقب بھی بہادر شاہ تھا اس لیے بہادر شاہ ظفر 'بہادر شاہ ثانی' کہلاتے تھے۔ عرش تیموری کے بیان کے مطابق بہادر شاہ ظفر کا عرف مرزا اکّن تھا۔

اکبر شاہ ثانی کے گیارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں تھیں۔ ظفر ان میں سب سے بڑے تھے۔ ظفر سے چھوٹے مرزا بابر اور ان سے چھوٹے مرزا جہاں گیر تھے جن کو بادشاہ ولی عہد بنانا چاہتے تھے۔ مغل بادشاہوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنا ولی عہد اور جانشین اس شہزادے کو مقرر کرتے تھے جسے وہ اس کا اہل سمجھتے تھے یا جسے وہ پسند کرتے تھے۔ کسی شہزادے کا محض فرزند اکبر ہونا ولی عہدی کی ضمانت نہیں تھا۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے سے جب مغل بادشاہ انگریزوں کے پنشن خوار ہو گئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اکبر شاہ ثانی سے ولی عہدی کے انتخاب کا حق بھی چھین لیا۔ چناں چہ اکبر شاہ ثانی کی ایک بیگم ممتاز محل نے، جو مرزا جہاں گیر کی والدہ تھیں، جب مرزا جہاں گیر کو ولی عہد نامزد کرانے کی کوشش کی تو انگریزوں نے ان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے فرزند اکبر مرزا ابوظفر ہی کو ولی عہدی کا مستحق سمجھتے تھے اور بالآخر وہی ولی عہد نامزد ہوئے۔

بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کا انتقال 1253ھ مطابق 1837 کو ہوا اور اسی کے ساتھ بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ بادشاہت اگر چہ برائے نام تھی لیکن شاہانہ تزک و احتشام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ شاہی رواج کے مطابق ساری رسمیں ادا کی گئیں اور یہ سکہ بھی کہا گیا:

بہ سیم و زر زدہ سکۂ شد بفضل الٰہ

سراج دین نبی بو ظفر بہادر شاہ

1857 میں جو خلفشار برپا ہوا اس نے نہ صرف بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا بلکہ پوری مغل سلطنت ہی کی بساط الٹ کر رکھ دی۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کی مدت بادشاہت صرف بیس سال رہی۔

بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں لال قلعے کا جو تہذیبی رنگ روپ تھا، جو معمولات شاہی تھے، قلعے کے جو محکمے تھے، جو سلسلۂ داد و دہش تھا، جو ٹھاٹ باٹ تھے اس پر لاتعداد مرقعے تالیف ہو چکے ہیں لہٰذا اس تفصیل میں یہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے مغلوں کی شاہی رواداریوں کو تخت مالی دشواریوں سے گزرتے ہوئے بھی نبھایا۔ انھیں کمپنی کی طرف سے صرف ایک لاکھ روپے ماہانہ پنشن ملتی تھی جس میں سے ان کی طرف سے مغلیہ خاندان کے ان افراد کے وظیفے بھی مقرر تھے جو لال قلعے کے مکین تھے۔ اس کے علاوہ دربارداری کا تزک و احتشام اور شاہی ٹھاٹ باٹ علاحدہ۔ چناں چہ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھیں طرح طرح کے جتن کرنے پڑتے تھے۔ شہر کے مہاجنوں سے قرض لینا، ذاتی اراضیوں کو فروخت کرنا یا رہن رکھنا وغیرہ۔

جب انگریزوں نے شاہ عالم ثانی کو کمپنی کا پنشن خوار بنا کر لال قلعے میں بٹھایا تو گویا انھیں جہاں بانی کے بکھیڑوں سے آزاد کر دیا تھا یا یہ کہیے کہ ایک طرح سے بے دخل کر دیا تھا۔ اب انھیں لال قلعے کی زیبائش سپاہ کے علاوہ کسی فوجی انتظام و انصرام کی بھی ضرورت نہ رہی تھی اور نہ ان کے مالی وسائل میں اس طرح کے اخراجات اٹھانے کی کوئی طاقت ہی تھی۔ جہاں بانی کے بکھیڑوں سے بے دخلی کی وراثت شاہ عالم سے اکبر شاہ ثانی کو اور پھر بالآخر ظفر کو منتقل ہوئی۔

چناں چہ بہادر شاہ ظفر کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ مغل حکومت کی بقا کے خواب تو دیکھ سکتے تھے لیکن وقت پڑنے پر بہت کچھ چاہتے ہوئے بھی ان کے پاس اس کی حفاظت اور دفاع کا کوئی سامان نہیں تھا۔

بہادر شاہ ظفر کی بیگمات کی صحیح تعداد کا پتا نہیں چلتا، مختلف ذرائع سے جو چند نام سامنے آتے ہیں ان میں شرافت محل بیگم، زینت محل بیگم، شاہ آبادی بیگم، اختر محل بیگم اور سردار محل بیگم کے نام شامل ہیں۔ دہلی اردو اخبار کی ایک خبر سے پتا چلتا ہے کہ زینت محل بیگم کا اصل نام کچھ اور تھا جس کا پتا نہیں چلتا۔ زینت محل کا خطاب انھیں بادشاہ کی طرف سے ان کے نکاح میں آنے کے بعد ملا تھا۔ زینت محل کے والد کا نام احمد قلی خاں تھا جن کا تعلق احمد شاہ درانی کے خاندان سے بتایا گیا ہے۔ زینت محل کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کی شادی 1840 میں ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال اور زینت محل کی انیس سال تھی۔

عرش تیموری کے بیان کے مطابق بہادر شاہ ظفر کے سولہ بیٹے اور اکیس بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں میں مرزا دارا بخت سب سے بڑے اور مرزا جوان بخت سب سے چھوٹے تھے۔ جواں بخت کی ولادت 1841 میں ہوئی تھی۔ ولی عہد کے انتخاب کا جو مسئلہ اکبر شاہ ثانی کو پیش آیا اور جس میں انھیں ناکامی ہوئی وہی صورت بہادر شاہ ظفر کے ساتھ بھی پیش آئی۔ زینت محل بیگم، بہادر شاہ ظفر کی سب سے کم عمر اور اتنی ہی چہیتی بیگم تھیں۔ اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد جب 1837 میں بہادر شاہ ظفر تخت نشیں ہوئے تو اسی کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے مرزا دارا بخت کو ولی عہد بھی نامزد کر دیا گیا تھا۔ اس وقت تک لال قلعے کے منظر نامے پر بیگم زینت محل نمودار نہیں ہوئی تھیں۔ مرزا دارا بخت کا انتقال بہادر شاہ ظفر کی زندگی ہی میں 1849 میں ہو گیا تھا۔ اس دوران 1840 میں زینت محل بیگم بہادر شاہ ظفر کے نکاح میں آ چکی تھیں اور 1841 میں مرزا جوان بخت کی ولادت بھی ہو چکی تھی۔ مرزا دارا بخت کے انتقال کے وقت مرزا جوان بخت گویا آٹھ سال کے ہو چکے تھے اور گمان غالب ہے کہ بیگم زینت محل کے ذہن میں مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنوانے کا خواب پلنا شروع ہو گیا ہوگا۔ مرزا شاہ رخ بہادر مرزا دارا بخت کے بعد بہادر شاہ ظفر کے دوسرے بیٹے تھے جو وزیر اعظم اور مختار عام کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن ان کا انتقال مرزا دارا بخت کے

انتقال سے دو سال پہلے ہی 1847 میں ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے تیسرے بیٹے مرزا کیومرث بھی جنھیں عرش تیموری اور مرزا غیاث الدین مصنف 'باغ شاداب' نے ولی عہد دوم بتایا ہے، 1857 سے قبل ہی کسی زمانے میں انتقال کر چکے تھے۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر کے چوتھے بیٹے مرزا فخرو ولی عہد نامزد ہوئے لیکن ان کا انتقال بھی جولائی 1856 میں ہیضے کی بیماری میں ہو گیا۔ مرزا فخرو کے انتقال کے بعد جب ولی عہدی کا مسئلہ، جو اب ایک جھگڑے کی شکل اختیار کر چکا تھا، دوبارہ شروع ہوا تو بیگم زینت محل کے ایما پر بہادر شاہ ظفر نے مرزا جواں بخت کو ولی عہد نامزد کرانے کی کوشش کی لیکن انھیں یا زینت محل بیگم کو آخر تک اس میں قطعی کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اس لیے کہ انگریز اس تجویز کے سراسر خلاف تھے۔

(3)

بہادر شاہ ظفر کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے اور یہ اعزاز پوری تحریک میں صرف انھی کے حصے میں آیا کہ ایسے حالات میں جب انگریز ساحل بنگال سے حشر برپا کرتے ہوئے جمنا پار کر کے دہلی تک پہنچ گئے تھے اور اس وقت گویا وہ شہنشاہ دہلی کے حلق میں انگلیاں ڈالے کھڑے تھے تو بھی میرٹھ کی باغی فوج 11 مئی 1857 کو لال قلعے کی دیوار کے نیچے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بقول ظہیر دہلوی (داستان غدر) یہی کہتی ہوئی جمع ہوئی:

''حضور بادشاہ سلامت آپ دین دنیا کے بادشاہ ہیں، آپ کو حق تعالیٰ نے بائیس صوبوں کا مالک کیا ہے، تمام ہندوستان آپ کا محکوم اور فرماں بردار ہے، ہندوستان کی رعیت آپ کی رعیت میں شمار ہوتی ہے، ہم لوگ آپ کے پاس فریادی ہیں، امیدوار انصاف ہیں۔''

لیکن جیسا کہ کہا گیا کہ جہاں بانی کی ڈور تو ان کے ہاتھ سے کب کی ان کے دادا شاہ عالم ثانی کے زمانے ہی سے چھوٹ چکی تھی ان کے پاس ملکی دفاع کے انتظام و انصرام کا بھی کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لامحالہ بقول ظہیر دہلوی ان کا پہلا ردعمل اس یورش پر یہی ہوتا تھا:

''میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا، میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں گا، میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا، میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں مجھ سے کسی طرح توقع استطاعت کی نہ رکھو۔''

(4)

1857 کے ہنگامے کی ابتدا تو دراصل 26 فروری 1857 کے آس پاس اس وقت ہو چکی تھی جب بیرک پور کی 19 نمبر پلٹن نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 26 مارچ 1857 کو منگل پانڈے کے خون میں جوش آیا اور اس نے میجر ہڈسن کو اور اسکے ساتھ ہی لیفٹننٹ واگھ کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا۔ اپریل کے مہینے میں میرٹھ، انبالہ اور لکھنؤ میں بہت سے انگریزوں کے مکان جلا دیے گئے۔ 6 مئی کو میرٹھ میں پھر تو سے سپاہیوں کو آزمائش کے طور پر چربی والے کارتوس دیے گئے۔ پچاس سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا جس پر ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ اس پر 10 مئی کو میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہو گیا، جیل کی دیواریں گرا دی گئیں اور ہندو مسلم سپاہ انگریزوں کا خاتمہ کرنے پر تل گئیں۔ 10 مئی کی رات ہی میرٹھ کے سپاہی علم بغاوت بلند کرتے ہوئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے اور 11 مئی 1857 کو پیر کے روز آٹھ بجے صبح یہ لوگ نعرے لگاتے ہوئے دہلی میں داخل ہوئے۔ 22 فروری سے 11 مئی تک تقریباً ڈھائی مہینے ملک کے مختلف مقامات میں جن میں 11 مئی کے بعد سے دہلی بھی شامل تھی، فوجی بدنظمی اور انگریزوں کے کشت و خون کی وارداتیں ہوتی رہیں لیکن بہادر شاہ ان معاملات سے یا تو بے خبر رہے یا زیادہ باخبر نہیں تھے۔

11 مئی 1857 سے 14 ستمبر 1857 تک جنرل بخت خاں کی قیادت میں دہلی میں انگریزوں سے مقابلہ جاری رہا۔ اس دوران انگریزوں کے جاسوسوں کا جال شہر اور لال قلعے میں پوری طرح پھیل چکا تھا۔ آخرکار 14 ستمبر 1857 کو انگریزوں کی فوجیں دہلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئیں، 19 ستمبر ہفتے کے روز بادشاہ نے بھی قلعہ چھوڑ دیا اور ضعیف العمر بادشاہ اپنی بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ نظام الدین چلے گئے۔ تین روز تک بہادر شاہ ظفر اور ان کا خاندان بے سروسامانی کی حالت میں ہمایوں کے مقبرے میں روپوش رہے۔ بخت خاں، بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا تاکہ دہلی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بھی یہ جنگ بہادر شاہ ظفر کے جھنڈے تلے جاری رکھی جا سکے۔ دوسری طرف انگریز بادشاہ کے دہلی سے فرار ہونے کے خطرے

کے پیش نظر بادشاہ کو جلد سے جلد گرفتار کر لینا چاہتے تھے، انھیں ڈر تھا کہ اگر بادشاہ فرار ہو گئے تو وہ اس ہندوستان گیر تحریک کا مرکز بنے رہیں گے۔ دوسری طرف انگریزوں کے وفادار اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ بادشاہ کو گرفتار کرا کے وہ انگریزوں کے حلقۂ مقربین میں داخل ہو جائیں۔ چناں چہ اس طرح مرزا الٰہی بخش کی معرفت جاں بخشی کی ضمانت پر بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ جب ہڈسن بادشاہ کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر اس نے انھیں سانڈرس کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں قید کر دیا گیا۔ دہلی کو خیر باد کہنے تک وہ اسی مکان میں رہے۔

1857 کے ہنگامے میں بھی بہت پہلے بہادر شاہ ظفر اپنے آپ کو جن لاچاریوں میں گھرا ہوا پاتے تھے اس کا منطقی نتیجہ بھی یہی تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانے اور مغل سلطنت کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کا جس کے درپے انگریز کب سے تھے، ایک ہی راستہ تھا کہ وہ 1857 کی یورش میں باغیوں کا ساتھ دیتے جو انھوں نے بالآخر کیا۔ اس میں ان کی طرف سے ابتدا میں جو تھوڑی رد و کد ہوئی وہ صرف اس لیے تھی کہ میرٹھ کی باغی فوج کا لال قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچنا انھیں اولاً کوئی مقامی ہنگامہ معلوم ہوا جو انگریزوں کی طاقت کے مقابلے ان کے نزدیک ایک انتہائی نادانی کا اقدام تھا۔ لیکن جلد ہی انھوں نے یہ باور کر لیا کہ یہ تو ایک ملک گیر تحریک تھی جو شاید وہ کام کر سکے جو ان کی معذور بادشاہت نہیں کر سکتی تھی۔ چناں چہ ایسے وقت میں جب انگریزوں کی تلوار ان کے سر پر لٹک رہی تھی باغی فوج کی قیادت قبول کرنا ظفر جیسے ضعیف العمر اور لاچار بادشاہ کے لیے کوئی معمولی اقدام نہیں تھا اور اس اقدام کی سب سے اذیت ناک سزا بھی تو انھی کو ملی۔

1857 کی بغاوت ناکام ہوئی، بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے شہر دہلی کے ایک مکان میں قید کر کے رکھے گئے۔ ان پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا۔ ان کے مقدمے کی کارروائی لال قلعے کے دیوان خاص میں عمل میں لائی گئی، یہ کارروائی یورپین فوجی کمیشن کے تحت کرنل ڈیوس کی صدارت میں 27 جنوری 1858 کو شروع ہوئی اور 9 مارچ 1858 کو یہ مقدمہ کمپنی کے حق میں اور بادشاہ کے خلاف فیصل ہوا۔ اس

مقدمے میں جس بات پر بار بار زور دیا گیا اور جسے بالآخر ثابت بھی کر دکھایا گیا وہ یہی تھی کہ نہ صرف یہ کہ بادشاہ اس بغاوت میں پوری طرح ملوث تھے بلکہ بغاوت کے عمل میں آنے سے پہلے بھی باغیوں کے ساتھ ان کا ربط و ضبط تھا۔ چناں چہ مقدمے کے آخر میں جج نے اپنے بیان میں ایک جگہ لکھا ہے:

"ہم بادشاہ کو جو تمھارے کٹہرے میں کھڑے ہیں، ان سے ساز باز کرتا پاتے ہیں۔ وہ پہلا نصب العین جس کی طرف وہ (باغی) چلے، وہ پہلا شخص جس سے انھوں نے التجا کی، یہی دہلی کے فرضی بادشاہ ہیں۔ یہ دیکھ کر معمولی عقل والا بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں پہلا ربط و ضبط تھا کیا ہوا مگر بادشاہ کی شرکت بعد میں ہوئی۔"

انگریز عدالت نے جس بات کو یہاں بہادر شاہ ظفر پر فرد جرم عائد کرتے ہوئے بیان کیا ہے، ہم ہندوستانیوں کے لیے جن کا ہندوستان کی آزادی کا یہ خواب 1857 کے پورے نوے سال بعد 1947 میں پورا ہوا، کسی سپاس نامے سے کم نہیں۔

(5)

مقدمے کے فیصلے کے لگ بھگ سات ماہ بعد رنگون کے سفر کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بہادر شاہ ظفر اور دوسرے سیاسی قیدیوں کی سواری کے لیے تین پالکی نما گاڑیاں اور چار گھوڑے خریدے گئے۔ لیفٹننٹ اومنی کو قیدیوں کا نگراں مقرر کیا گیا۔ گھوڑ سواروں کا ایک دستہ اور ایک فوجی بٹالین ان کے ہمراہ کی گئی۔ اس طرح 17 اکتوبر 1858 کی شام چار بجے سابق شہنشاہ دہلی اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی نے دہلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ دہلی سے الہ آباد کے لیے روانہ ہوا۔ دہلی کے کمشنر نے اس امر کی اطلاع تار کے ذریعے گورنر جنرل کو پہنچا دی۔ اومنی کو یہ ہدایات ملیں کہ وہ گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے سفر کے دوران اپنی روزانہ کارروائی کی رپورٹ بھیجا کریں۔ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اومنی نے اس سفر کی ڈائری لکھنی شروع کی۔ وہ جس جگہ بھی جاتے فوراً اپنی جائے قیام کے بارے میں گورنر جنرل کو اطلاع دیتے۔ اس ڈائری کا مضمون ایک ہی طرح کا ہوتا تھا بس مقام اور تاریخ بدلی ہوئی ہوتی تھی۔ مثلاً 29 اکتوبر 1858 کو وہ اطلاع دیتے ہیں:

"میں گورنر جنرل کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کہ
قیدیوں کی گاڑی آج صبح میری نگرانی میں یہاں تک پہنچ گئی ہے اور کل صبح چھ بجے مرزا پور
کے لیے روانہ ہو جائے گی۔" (انگریزی سے ترجمہ)

سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ جس کا محافظ انگریزی فوجی دستے کی کڑی نگرانی میں اپنی آخری منزل کی طرف جا رہا تھا اس کا نام ناتھو لا افسر تھا۔ مختلف مقامات پر قیام کرتا ہوا 13 نومبر 1858 کو یہ قافلہ الٰہ آباد پہنچ گیا۔[1] دہلی سے شاہی خاندان کے چار افراد یعنی محمد بہادر شاہ ظفر، نواب زینت محل بیگم، شہزادہ جواں بخت اور شاہ عباس تو باقاعدہ جلا وطن ہو کر سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے روانہ کیے گئے تھے لیکن 17 اکتوبر دہلی سے روانہ ہو کر چار دن کم ایک ماہ میں سیاسی قیدیوں کا یہ قافلہ 13 نومبر کو الٰہ آباد پہنچا۔ بظاہر دہلی سے الٰہ آباد تک کا سفر اتنا طویل نہیں سوائے اس کے کہ احتیاط کے طور پر یہ قافلہ الٰہ آباد کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ایسے الٹے سیدھے راستے سے الٰہ آباد پہنچا ہو جو کسی کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ امکان غالب ہے کہ یہی حکمتِ عملی رنگون تک کے سفر میں آگے بھی اختیار کی گئی۔ ان کے ہمراہ شاہی خاندان کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ بحیثیتِ مجموعی سیاسی قیدیوں کی یہ جماعت تیرہ افراد پر مشتمل تھی جن کے نام اس طرح ہیں:

1. بہادر شاہ ظفر
2. مرزا جواں بخت
3. مرزا شاہ عباس
4. زینت محل بیگم
5. زمانی بیگم (زوجہ جواں بخت)
6. رقیہ بیگم (ہمشیر زمانی بیگم)
7. ممتاز بیگم (والدہ زمانی بیگم)
8. تاج محل بیگم (زوجہ بہادر شاہ ظفر)
9. رحیمہ
10. سلطانہ
11. عشرت
12. طہارت
13. مبارک النساء (والدۂ شاہ عباس)

الٰہ آباد میں بادشاہ اور ان کے ساتھیوں کا قیام صرف تین روز رہا۔ یہاں حکومت کی جانب سے بادشاہ کے طبی معائنے کے لیے ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری ایڈمنسٹن نے گورنر جنرل کی طرف سے ایس۔ ایم۔ ہیڈوے کو اس سلسلے میں یہ مراسلہ روانہ کیا:

"گورنر جنرل چاہتے ہیں کہ آپ کی کمیٹی محمد بہادر شاہ کا غور وخوض سے طبی معائنہ کرے اور اس کی ایک رپورٹ گورنر جنرل موصوف کو بھیجی جائے۔ ساتھ ہی آپ مندرجہ ذیل امور پر اپنی رائے بھی تحریر فرمائیں:
کیا آپ کی کمیٹی بادشاہ کی موجودہ صحت، ضعیف العمری اور ان کی دہلی سے یہاں تک کی مسافت کے بعد طبی نقطۂ نگاہ سے ان کا فوراً ہی رنگون بھیجا جانا یا رنگون کے مخصوص مکان میں ان کا ٹھہرایا جانا یا آب وہوا کے لحاظ سے صوبہ پیگو میں ان کے قیام کو غیر مناسب تو نہیں سمجھتی۔" (انگریزی سے ترجمہ)

اس خط کے جواب میں ڈاکٹروں کی کمیٹی نے ہیڈ وے کی معرفت گورنر جنرل کو یہ جواب بھجوایا:

"ان (بہادر شاہ) کی عام جسمانی حالت، ان کی صحت، ضعیف العمری اور طویل مسافت کے بعد بھی اس سے بدرجہا بہتر ہے جو آپ خیال فرماتے ہیں۔ لہٰذا کمیٹی بادشاہ کا رنگون بھیجا جانا، یا ان کا رنگون کے مخصوص مکان میں ٹھہرایا جانا یا صوبہ پیگو کی مخصوص آب وہوا میں ان کا بھیجا جانا طبی نقطۂ نگاہ سے قطعی غیر مناسب نہیں سمجھتی۔"
(انگریزی سے ترجمہ)

15 نومبر 1858 کو گورنر جنرل کی منظوری کے بعد ڈاکٹر جونسن، سابق بادشاہ دہلی کے ذاتی ڈاکٹر مقرر ہوئے اور اس امر کی اطلاع ہیڈ وے کو دے دی گئی۔ سکریٹری ایڈمنسٹن نے سیاسی قیدیوں کی الہٰ آباد سے روانگی سے قبل گورنر جنرل کی ہدایت کے تحت لیفٹننٹ اومنی کو ایک اور خط لکھا جس میں انھوں نے اومنی کو بتایا کہ گورنر جنرل کی یہ ہدایت ہے کہ ان لوگوں میں سے، جو بادشاہ کے ساتھ دہلی سے آئے ہیں، جو لوگ رنگون جانا پسند کریں انھیں جانے دیا جائے لیکن انھیں اس بات سے آگاہ کر دیا جائے کہ ان پر بھی وہی تمام پابندیاں ہوں گی جو دوسرے قیدیوں پر عائد ہوں گی۔ یہ بات ایک بار پھر واضح کر دی گئی کہ بہادر شاہ ظفر، زینت محل بیگم، جواں بخت اور شاہ عباس کو بہر حال رنگون ہی جانا ہے۔ اسی روز ایڈمنسٹن نے ایک خط پیگو کے گورنر کو بھی روانہ کیا، جس میں دہلی کے سیاسی قیدیوں کے بارے میں بعض اہم ہدایات دی گئی تھیں۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:

"گورنر جنرل کی ہدایت ہے کہ ان قیدیوں کے ساتھ مہذب طرزِ عمل روا رکھا جائے۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی بے حرمتی نہ ہو۔ ان تمام باتوں کا بھی خیال رکھا جائے جو ان کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔

چاروں سیاسی قیدیوں کے ساتھ گیارہ افراد ہیں، جن کی فہرست اس خط کے ساتھ بھیجی جارہی ہے۔ یہ تمام لوگ وہ ہیں جنھوں نے اپنی مرضی سے سیاسی قیدیوں کے ساتھ آنا پسند کیا ہے۔ ان تمام لوگوں کو بھی قیدیوں کے ساتھ اسی عمارت میں رکھا جائے گا اور ان کے اخراجات بھی گورنمنٹ ہی برداشت کرے گی۔ ان کا خرچ ہر اعتبار سے فیاضی کے ساتھ اٹھایا جائے لیکن ان کو نقد رقم کے طور پر کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ ان کے کل اخراجات کا علاحدہ سے ایک ماہانہ بل بنا کر دفتر امورِ خارجہ کو بھیجنا ہوگا۔"

(انگریزی سے ترجمہ)

ان تمام باتوں سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کو سیاسی قیدی بنا کر تو رکھا گیا لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ ضعیف العمری کی وجہ سے ان کی صحت کا بھی پورا خیال رکھا جاتا تھا چنانچہ طبی معائنے کی رپورٹ کے بغیر انھیں الٰہ آباد سے رنگون کے لیے نہیں روانہ کیا گیا۔ اسی طرح بادشاہ کے جو متوسلین آخر وقت بادشاہ کا ساتھ دینے کو تیار تھے، انھیں بھی اس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ بادشاہ کے ساتھ رنگون جاسکتے ہیں، جہاں ان کے رہن سہن کا خرچ گورنمنٹ برداشت کرے گی۔ ان حقائق کی روشنی میں بہادر شاہ ظفر کی اس داستانِ غم پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے جو بعض صاحبِ طرز ادیبوں نے بڑی رقت کے ساتھ قلم بند کی ہے۔

15 نومبر 1858 کو چار سیاسی قیدیوں اور ان کے گیارہ ہمراہیوں کا جو قافلہ الٰہ آباد سے رنگون کے لیے روانہ ہوا وہ ان افراد پر مشتمل تھا:

الف: بہادر شاہ	ب: جواں بخت
ج: شاہ عباس	د: زینت محل
1. احمد بیگ (خادم)	2. سلطانہ
3. عشرت	4. مبارک النساء بیگم (والدۂ شاہ عباس)
5. نواب شاہ زمانی بیگم	6. نیازو (باندی)

7. حرمت بائی (باندی)	8. لطفن (باندی)
9. عبدالرحیم (خادم)	10. حسینی (باندی)
11 صندل (باندی)	

ادمنی نے بادشاہ کی ضعیف العمری کا خیال کرتے ہوئے دو مرد خادموں، احمد بیگ (بادشاہ کے لیے) اور عبدالرحیم (بیگم زینت محل کے لیے) کو خاص طور پر رنگون چلنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ ان تمام افراد کی فہرست تیار کر کے اس خط کے ہمراہ بھیج دی گئی تھی جو پیگو کے کمشنر کو قیدیوں کی رنگون کے لیے روانگی کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو الٰہ آباد تک بادشاہ کے ساتھ آئے لیکن جنھوں نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا ان کو الٰہ آباد کے قلعے میں محصور کر دیا گیا۔ جو افراد رنگون کے لیے بادشاہ کی روانگی کے بعد الٰہ آباد کے قلعے میں محصور کیے گئے ان کے نام یہ ہیں:

1. مرزا قیصر	2. مرزا خضر	3. جواں بخش (خواجہ سرا)
4. تاج محل بیگم (زوجۂ ظفر)	5. ممتاز دلہن بیگم (جواں بخت کی ساس)	6. رقیہ سلطان بیگم (جواں بخت کی سالی)
7. رحیمہ	8. طہارت	9. کیمیا
10. وفادار	11. راحت	12. جمیت
13. مبارک		

19 نومبر 1858 کو طلوعِ آفتاب کے وقت سیاسی قیدیوں کا قافلہ الٰہ آباد سے مرزا پور پہنچ گیا۔ مرزا پور سے گنگا کے راستے اگلے سفر کی تیاری کی گئی۔ ایک فوجی کشتی میں جس کا نام 'سورما فلیٹ' تھا، قیدیوں کو سوار کر دیا گیا اور اس کشتی کو ایک فوجی اسٹیمر سے جوڑ دیا گیا۔ اس اسٹیمر کا نام تھا 'لیمز'۔ یہ اسٹیمر اسی روز یعنی 19 نومبر 1858 کو دوپہر دو بجے دریائے گنگا کے راستے کلکتے کے لیے روانہ ہو گیا۔ مرزا پور سے روانہ ہو کر یہ اسٹیمر 22 نومبر کو بکسر، 23 نومبر کو دینا پور، 25 نومبر کو مونگیر، 27 نومبر کو راج محل، 28 نومبر کو رام پور بلیا، 29 نومبر کو دمودر گلی، یکم دسمبر کو کھلنا اور 4 دسمبر کی صبح نو بجے ڈائمنڈ ہاربر پہنچ گیا۔ ڈائمنڈ ہاربر پر قیدیوں کو کشتی سے اتار کر انھیں انگریزی جنگی جہاز میگوائرا میں سوار کر دیا گیا۔ 4 دسمبر ہی کو ساڑھے گیارہ بجے دن کو یہ جہاز ڈائمنڈ ہاربر

سے روانہ ہو کر اسی روز شام کو کیڈگری پہنچ گیا جہاں سے دوسرے روز یعنی 9 دسمبر 1858 کو جا کر یہ جہاز رنگون کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور سیاسی قیدیوں کو رنگون میں اتار دیا گیا۔

(6)

بہادر شاہ ظفر اپنے قافلے کے ساتھ 9 دسمبر 1858 کو رنگون پہنچے۔ چار روز کے بعد یعنی 13 دسمبر کو پیگو کے کمشنر میجر اے۔ پی۔ فائل نے حکومتِ ہند کے سکریٹری جی۔ این۔ ایڈمنسٹن کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں سکریٹری کے 12 نومبر 1858 کے خط کا حوالہ دیتے ہوئے جوالہ آباد سے قیدیوں کی روانگی سے دو روز قبل لکھا گیا تھا، قیدیوں کے رنگون پہنچنے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی سیاسی قیدیوں کے حالات بھی بیان کیے۔ اس خط کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

> "میں جناب کو آپ کے خط نمبر 4546 مورخہ 12 نومبر کی وصول یابی کی اطلاع دیتے ہوئے جواباً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایم ایچ۔ جے۔ بینگو انڑا چار شاہی قیدیوں اور ان کے گیارہ مرد و زن ملازمین کو (جیسا کہ جناب کی منسلکہ فہرست میں درج ہے) لے کر 9 دسمبر 1858 کو رنگون پہنچ گیا۔
>
> فی الحال قیدیوں کو رنگون کے مین گارڈ (Main Guard) میں رکھا گیا ہے جہاں ان کے قیام کی مناسب گنجائش ہے۔ ان کے تحفظ کے لیے نمبر 68 پیادہ رجمنٹ کا ایک دستہ تعینات کر دیا گیا ہے۔ آپ کے (زیرِ جواب) خط میں قیدیوں اور ان کے ملازمین سے متعلق جو ہدایات درج ہیں ان پر سختی سے عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔
>
> میں نے لیفٹننٹ اومنی کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ احکام کے مطابق روزنامہ ڈائری لکھیں..... رنگون سے میری غیر حاضری کے دوران ہو سکتا ہے کہ ڈائری کا خلاصہ بھیجنے میں دیر ہو جائے لیکن اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ زیادہ دیر نہ ہونے پائے۔"

سیاسی قیدی جب رنگون پہنچے تو اس وقت تک ان کے قیام کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوا تھا اس لیے ان کو مین گارڈ کے احاطے میں ٹھہرایا گیا۔ ان میں کچھ لوگوں کے لیے خیمے نصب کیے گئے اور ان خیموں کے چاروں طرف پردے کے لیے قناتیں لگا دی گئیں۔ باقی لوگوں کو مین گارڈ کی بلڈنگ میں پارٹیشن کر کے ٹھہرا دیا گیا۔ اسی اثنا میں قیدیوں کے لیے مکان کی تعمیر کا کام شروع

ہو گیا اور 29 اپریل 1859 کو وہ اپنی نئی قیام گاہ میں منتقل ہو گئے۔ سیاسی قیدیوں کے لیے تعمیر ہونے والا یہ مکان مین گارڈ سے بالکل قریب تھا۔ یہ برما کے عام لکڑی کے مکانوں کی طرح تھا جو سطح زمین سے کافی اونچائی پر بنایا گیا تھا۔ یہ مربع شکل کا احاطہ 100X100 فٹ تھا۔ اس کے چاروں طرف دس فٹ اونچی احاطے کی دیوار کھنچی ہوئی تھی اس میں سولہ فٹ مربع (16X16) کے چار کمرے تھے، ان میں سے ایک کمرے میں بہادر شاہ ظفر کو، دوسرے میں نواب زینت محل بیگم کو، تیسرے میں جواں بخت اور اس کی بیوی کو اور چوتھے میں شاہ عباس اور اس کی والدہ مبارک النساء بیگم کو رکھا گیا تھا۔ ان کے لیے غسل خانے اور پاخانے کا انتظام علاحدہ تھا۔ ایک کمرہ باورچی خانے کے طور پر بھی فراہم کیا گیا تھا۔ میجر فائل لکھتا ہے کہ یہ مکان ایک کشادہ جگہ میں بنا ہوا تھا جس کے نواح میں ایک طرف بودھوں کا مشہور شوڈیگن پگوڈا تھا اور دوسری طرف دریا اور جہاز رانی کا خوش نما منظر۔ قیدیوں کے افسر انچارج نے ایگزیکیٹو انجینئر کے سامنے اس جگہ کو بہتر بنانے کے لیے کچھ اور تجویزیں بھی رکھیں جن پر عمل درآمد ہوا۔

یکم اپریل 1859 کو کیپٹن نیلسن ڈیوس نے لیفٹننٹ اومنی سے سیاسی قیدیوں کا چارج لے لیا۔ اس کے بعد سے آخر تک قیدی انھی کے چارج میں رہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو اپنی رپورٹ میں ڈیوس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاہی قیدیوں کے رنگون پہنچنے پر رنگون میں مقیم ہندوستانی مغل تاجروں نے شروع شروع میں معمولی تشویش ظاہر کی تھی رفتہ رفتہ وہ تشویش ختم ہو گئی۔ سیاسی قیدیوں کی خوراک کا ذکر کرتے ہوئے ڈیوس لکھتا ہے کہ ان کی خوراک کا خرچ ہندوستان کے مقابلے میں یہاں زیادہ ہے۔ سولہ قیدیوں کی خوراک پر لگ بھگ گیارہ روپے یومیہ خرچ ہوتے ہیں۔ اور چوں کہ چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ خرچ اور بڑھ جائے۔ جب سے ڈیوس نے قیدیوں کا چارج لیا تھا تب سے قیدیوں کو ٹوائلٹ وغیرہ کے لیے ہر اتوار کو ایک روپیہ اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دو روپے مزید ملتے تھے۔ قیدیوں کو قلم دوات اور کاغذ رکھنے کی سختی کے ساتھ ممانعت تھی۔ ڈیوس روزانہ قیدیوں کی خوراک کے بارے میں معلومات کرتا تھا اور اس کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی تھی کہ قیدیوں کو بہتر کھانا ملے۔ قیدیوں کے لیے جو عملہ ملازم رکھا گیا تھا اسے کم سے کم تنخواہ پر حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ روزانہ کے سودا سلف کے لیے ایک چپراسی رکھا گیا تھا۔ یہ شخص ویسے تو برما کا باشندہ تھا لیکن ہندوستانی خوب اچھی جانتا تھا اور اس

اعتبار سے قیدیوں اور افسروں کے بیچ میں رابطے کا کام بھی دیتا تھا۔ یہ شخص اگر چہ ہندوستانی ملازم کے مقابلے میں کچھ زیادہ تنخواہ پر ہاتھ آیا تھا لیکن اسے اس سیاسی مصلحت کی بنا پر رکھا گیا تھا کہ قیدیوں اور اس ہندوستانی کے درمیان کوئی جذباتی تعلق نہ قائم ہو پائے، اس کے علاوہ تین ملازم ہندوستانی تھے لیکن انھیں قیدیوں کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ بادشاہ دہلی کی صحت تسلی بخش تھی حالاں کہ جس وقت دسمبر 1858 میں وہ رنگون آئے تھے تو ڈاکٹر ولسن سول سرجن کو ان کی صحت کی طرف سے کافی تشویش تھی، لیکن جب سے بادشاہ کو ان کے نئے مکان میں منتقل کیا گیا تھا ان کی صحت بہتر نظر آرہی تھی۔ ان کا حافظہ اچھا تھا لیکن دانت گر جانے کی وجہ سے الفاظ کی ادائیگی میں دقت ہوتی تھی۔ بیگم زینت محل کی صحت اچھی تھی۔ ڈیوس کی بیوی نے اور پردے کے پیچھے سے خود ڈیوس نے بھی ان سے کئی بار ملاقات کی۔ زینت محل کو شکایت تھی کہ ان کا بیس لاکھ پونڈ کی مالیت کا اسباب گورنمنٹ نے ناجائز طور پر اپنے قبضے میں کر لیا۔ حالاں کہ اس مال و اسباب کا بادشاہ یا لال قلعے سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے کہ یہ سامان قلعے سے الگ ان کے ذاتی مکان میں بند تھا۔ اس کے جواب میں ڈیوس نے یہ بات ان کے ذہن نشیں کرا دی کہ ان کا خزانہ قلعے میں ہو یا قلعے سے باہر، لیکن بادشاہ کی بیگم ہونے کے ناتے گورنمنٹ کو ان کا خزانہ ضبط کر لینے کا حق تھا جو اس نے کیا۔

یکم جولائی 1861 کو ڈیوس نے جو خط گورنر جنرل کے نام تحریر کیا اس میں وہ لکھتا ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے سیاسی قیدیوں کی صحت اچھی ہے البتہ ابو ظفر کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ سول سرجن کی رائے ہے کہ ابو ظفر کی زندگی اب غیر یقینی سی ہو چکی ہے۔

رنگون کے اس مکان کا رقبہ جس میں سیاسی قیدی آباد تھے، دس ہزار مربع فٹ تھا۔ ہر شخص کو ایک علاحدہ کمرہ دیا گیا تھا اور ہر کمرے کا رقبہ دو سو چھپن مربع فٹ تھا۔ بادشاہ کی دیکھ بھال کے لیے ایک سول سرجن تعینات تھا۔ شہزادوں کی تعلیم کا مناسب بندوبست تھا اور قیدیوں کو گھر سے باہر نکلنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیے جاتے تھے۔ یہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے جو کسی روایت کے حوالے سے اردو کے ایک ادیب نے اس طرح بیان کی ہے:

> "میں نے بہادر شاہ کو ایک کھری چارپائی پر پڑا ہوا دیکھا۔ ایک بوسیدہ اور پھٹا ہوا ٹاٹ انھوں نے اوڑھ رکھا تھا۔ اوپر کے ٹاٹ کو ہٹا کر بادشاہ نے اپنے بازو دکھائے جو

ب بچھونے کی چارپائی پر پڑے رہنے کے باعث زخمی ہوگئے تھے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے۔"

(7)

بہادر شاہ ظفر کب کے عمر طبیعی کو پہنچ چکے تھے، ضعیف العمری میں انھیں جن مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا، وہ اچھے خاصے تندرست انسان کے لیے بھی جان لیوا ثابت ہو سکتے تھے۔ تخت و تاج چھن گیا، عزت و وقار ختم ہو گیا، جلاوطن کر کے ہزاروں میل دور پردیس میں ڈال دیے گئے۔ لیکن حوادث کے اس طوفان میں ان کی زندگی کی شمع کسی نہ کسی رنگ میں جلتی رہی، یہاں تک کہ سحر آ پہنچی۔ رنگون میں وہ اکثر بیمار رہا کرتے تھے اور ان کے خاص معالج نے بہت پہلے یہ پیشین گوئی کر دی تھی کہ اب ان کی زندگی غیر یقینی ہے۔ اکتوبر 1862 میں ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ سیاسی قیدیوں کا نگراں نیلسن ڈیوس معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیا لہٰذا اس نے اپنی کارگزاری کا روزنامچہ پابندی سے لکھنا شروع کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے آخری چند روز کس طرح گزرے اور کیسے اس عبرت ناک زندگی سے بالآخر انھوں نے اپنا دامن چھڑایا، اس کا اندازہ ڈیوس کے روزنامچے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"رنگون، جمعرات 23 اکتوبر 1862

سیاسی قیدیوں کو دیکھا، سب ٹھیک تھا۔ ابوظفر کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔

رنگون، اتوار 26 اکتوبر 1862

... ابوظفر کا خادم احمد بیگ کہتا ہے کہ وہ کمزور ہیں اور انھیں کھانا کھانے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔

رنگون، پیر 28 اکتوبر 1862

سیاسی قیدیوں کو دیکھا۔ ابوظفر بدستور کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے۔

رنگون، بدھ 29 اکتوبر 1862

سیاسی قیدیوں کو دیکھا، ابوظفر کی حالت اچھی نہیں۔

رنگون، ہفتہ یکم نومبر 1862

سیاسی قیدیوں کو دیکھا، ابوظفر کی حالت تشویش ناک ہے

رنگون، پیر 3 نومبر 1862

......ابوظفر کے حلق پر فالج کا اثر ہے، اس لیے کم مقدار میں بھی کھانا کھانا ان کے لیے مشکل ہے۔

رنگون، بدھ 5 نومبر 1862

سول سرجن کو امید نہیں کہ ابوظفر اب زیادہ دن جئیں گے۔

رنگون، جمعرات 6 نومبر 1862

ابوظفر کے حلق پر فالج کا اثر ہے اور بظاہر وہ (ڈاکٹر کے) ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔ ان کی آخری آرام گاہ کے طور پر جگہ مقرر کر دی گئی ہے میں نے اس کے قریب اینٹیں اور گارا اکٹھا کرنے کا حکم دے دیا ہے۔

رنگون، جمعہ 7 نومبر 1862

ابوظفر محمد بہادر شاہ آج صبح پانچ بجے انتقال کر گئے۔ چوں کہ تمام تیاریاں مکمل تھیں اس لیے آج ہی شام چار بجے مین گارڈ کے عقب میں اینٹوں کی قبر میں ان کی تدفین کر دی گئی اور قبر کی اوپری سطح مٹی ڈال کر سطح زمین کے ساتھ ہموار کر دی گئی ہے۔ تھوڑے فاصلے پر بانسوں کا احاطہ کھینچ دیا گیا ہے تاکہ جب تک بانس گل سڑ کر گریں زمین پر گھاس اُگ چکی ہو اور کوئی علامت ایسی باقی نہ رہے جس سے آخری شہنشاہ کی قبر کی نشان دہی کی جا سکے۔

مرحوم کی تجہیز و تکفین کے لیے ایک ملا کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ جنازے کو ایک صندوق میں رکھ کر اوپر سے سرخ رنگ کی ایک سوتی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ایک ہجوم بازار سے آ کر احاطے کے قریب جمع ہو گیا تھا لیکن اس ہجوم کو ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا اس طرح کہ ان میں کوئی بھی میت کو نہ چھو سکے۔ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ بادشاہ کے دونوں بیٹے جواں بخت اور شاہ عباس اور بادشاہ کا خادم احمد بیگ جنازے کے ساتھ تھے۔ شاہی خاندان کے دیگر افراد (بچوں اور عورتوں) کو جنازے میں شرکت کی اجازت نہیں تھی۔"

جیسا کہ ڈیوس کی ڈائری سے معلوم ہوا، بہادر شاہ ظفر کا انتقال 7 نومبر 1962 بروز جمعہ فالج کے مرض میں صبح پانچ بجے ہوا اور اسی روز شام کو چار بجے ان کی تدفین عمل میں آگئی۔ ڈیوس نے بہادر شاہ ظفر کی وفات کی مفصل رپورٹ تیار کی اور ساتھ ہی بادشاہ کی وفات کے بارے میں سول سرجن کا سرٹیفکیٹ بھی منسلک کیا۔ اس سرٹیفکیٹ میں سول سرجن نے بادشاہ کی موت کی تصدیق اس طرح کی تھی:

"رنگون، 7 نومبر 1862

تصدیق کیا کہ سابق بادشاہ دہلی محمد بہادر شاہ پر فالج کا زبردست حملہ ہوا اور اس کے سبب وہ آج صبح پانچ بجے فوت ہو گئے۔

دستخط جے۔ ای۔ ڈکنسن

سول سرجن

سیاسی قیدیوں کا میڈیکل انچارج"

بہادر شاہ ظفر کی وفات پر عبدالغفور نساخ نے حسب ذیل تاریخ کہی:

وائے ویلا چوں بہادر شاہ مرد
عالمے شد باغم و بارنج جفت
سالِ ترحیلش ملک از آسماں
"ناگہاں بخشائش اللہ" گفت

1275ء

جیسا کہ ڈیوس کے خط سے پتا چلتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کی تدفین اس طرح کی گئی کہ ان کی قبر کا نشان بھی نہ ملے اور ایسا ہی ہوا بھی۔ ظفر کی وفات کے کچھ عرصے بعد کچھ مسلمان ہندوستان سے رنگون گئے اور انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی قبر پر فاتحہ پڑھنی چاہی تو اس جگہ جہاں ظفر کو دفن کیا گیا تھا، انھیں سوائے ایک چٹیل میدان کے اور کچھ نہ ملا۔ ان لوگوں نے بااثر حلقوں میں جا کر اس بات کی کوشش کی کہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کی باقاعدہ تعمیر ہو جائے۔ اسی سلسلے میں "بہادر شاہ درگاہ ٹرسٹ" کا قیام عمل میں آیا۔ اس ٹرسٹ نے عوام کے نام ایک اشتہار جاری کیا جس میں

اپیل کی گئی تھی کہ وہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کی تعمیر کے لیے چندہ دیں۔ ٹرسٹ نے ایک معقول رقم جمع کر لی اور اس سرمایے سے ظفر کا مزار تعمیر کرایا گیا۔ مزار کے سرہانے ایک کتبہ بھی نصب کیا گیا جس کی عبارت حسب ذیل ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خاندانِ مغلیہ کا آخری چراغ

حضرت ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر رحمۃ اللہ علیہ

1837 جلوس تا1858

آج بتاریخ 7 نومبر 1862 مطابق 14 جمادی الاوّل 1279 جمعے کو وہ روح جو نوّ ای سال بہادر شاہ کے جسم میں موجود رہی، زندگی کے تمام تماشے دکھا کر وداع کی تیاری کر رہی ہے۔ دن ڈھل چکا اور اس کے ساتھ ہی بادشاہ کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا۔ رنگون کی خاک اس کو آغوش میں لیتی ہے جو خاندانِ تیموریہ کا آخری چراغ تھا۔ جس نے جہان آباد میں جنم لیا وہ وطن سے ہزاروں کوس دور ایک معمولی پلنگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے۔ سکرات طاری ہے، سانس اکھڑ چکا ہے۔ جس کی زندگی پیچ پیچ کا میلا تھا جس نے زندگی کا ہر لمحہ کشمکشوں میں گزارا آج صرف تین آدمی، ایک بیوی اور دو بچے اس کے دمِ واپسیں میں ساتھ ہیں۔ آفتاب بھی غروب نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی حسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا اور شاہ جہان آباد کا یہ گوہرِ آبدار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سو گیا۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

تاریخِ وفات:

چودہ جمادی الاولیٰں جمعے کا روز وقتِ عصر

حالتِ قید بے کسی تھی یہ گھڑی بہت کٹھن

وقت نے شاہِ ہند سے عرض کیا وطن سے دور

خلد ہے آپ کا وطن اے ظفر چلا وطن

1275ھ

چوں کہ یہ کتبہ ظفر کی وفات کے بہت دن بعد مزار پر نصب ہوا تھا اس لیے صحیح معلومات

کی کمی کی وجہ سے اس کی عبارت میں کئی غلطیاں ہو گئی ہیں۔ بادشاہ کا انتقال، جیسا کہ ڈیوس کی رپورٹ سے ظاہر ہے، صبح پانچ بجے ہوا اور شام چار بجے ان کی تدفین عمل میں آئی، لیکن کتبے کی عبارت میں لکھا ہے" آفتاب غروب بھی نہ ہوا تھا کہ اس بادشاہ نے فانی دنیا کو اپنی عسرت کی تصویر دکھا کر دنیا سے کوچ کیا۔" یہی غلطی کتبے کی عبارت میں آگے چل کر قطعۂ تاریخ کے اس مصرعے:

'' چودہ جمادی الاولیٰں جمعے کا روز وقتِ عصر'' میں بھی دہرائی گئی۔ اسی بنیاد پر مالک رام نے بھی بہادر شاہ ظفر کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے یہی لکھا کہ:

''7 نومبر 1862 کو مغرب کے وقت بعارضۂ فالج جاں بحق ہوئے۔''

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ظفر کا انتقال 7 نومبر 1862 بروز جمعہ صبح پانچ بجے ہوا اور ان کی تدفین اسی روز شام عصر اور مغرب کے بیچ غروبِ آفتاب سے پہلے عمل میں آئی۔

(6)

1947 تک بہادر شاہ ظفر اور انقلاب کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ زیادہ تر برٹش حکومت کے نقطۂ نظر سے تھا۔ اس سلسلے میں بعض روزنامچے بھی شائع ہوئے، جن میں جیون لال کا روزنامچہ اور معین الدین حسن کی کتاب'' خدنگِ غدر'' اہم ہیں۔ مٹکاف نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کرایا تھا۔ ہمارے بعض مورخین نے ان تحریروں کے سہارے اچھی خاصی غلط فہمی پھیلائی ہے، جن میں آر سی. مجمدار اس لیے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی تحقیق کے مطابق'' بہادر شاہ غدار تھے اور آخر تک برٹش حکومت کے وفادار رہے''! یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے پیش نظر صرف انگریزوں کی لکھی ہوئی کچھ تاریخیں اور جیون لال کا روزنامچہ ہوگا۔ جیون لال کے روزنامچے سے پتا چلتا ہے کہ وہ جاسوس تھا اور انگریزوں کو قلعے سے متعلق خبریں پہنچاتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر اگر چہ انگریزوں کے پنشن خوار تھے لیکن دہلی کے عوام کے لیے وہ اب تک ہندوستان کے شہنشاہ تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی عزت و عظمت اسی طرح برقرار تھی۔ عوام ہی نہیں، عالم فاضل لوگ بھی بادشاہ سے یکساں طور پر عقیدت رکھتے تھے۔ اینڈریوس نے ایک جگہ لکھا ہے:

'' جب انگریزی افواج شہر میں بغیر کسی مقابلے کے قابض ہو گئیں اور بادشاہ کو قلعے

کے رقبے کے اندر پورے شاہانہ اختیارات کے سات آزاد چھوڑ دیا گیا تو اس وقت
دہلی کے باشندوں کو عام ہمدردی ان کے ساتھ ہوگی۔ تاہم قدرت کے اس تمام
انقلاب میں جو خواہ مرہٹوں کے ماتحت ہوا ہو یا خواہ انگریزوں کے ماتحت، دہلی کے
لوگ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر ۔۔ عقیدت مندانہ وفاداری کے ساتھ مغل
شہنشاہوں کے ساتھ چمٹے رہے اس بارے میں جو بھی شہادت مجھے ملی، وہ قطعی تھی۔
انھیں (ذکاء اللہ کو) بہادر شاہ کے ساتھ جو محبت تھی اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی،
خواہ وہ ان کے نظم و نسق کی کمزوری اور خرابی پر کتنا ہی ماتم کناں کیوں نہ رہے ہوں۔"

ظفر کی زندگی میں اس پیرانہ سالی میں یہ پہلا موقع تھا جب انھیں ایسے ہنگامی حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا، چناں چہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، جب باغی سپاہ نے ان کے آگے سر تسلیم خم کیا اور ان سے تحریک کی قیادت کی درخواست کی تو وہ حیران و پریشان رہ گئے۔ ادھر شہر میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور غلط قسم کے عناصر موقعے کا فائدہ اٹھا کر لوٹ مار پر تلے ہوئے تھے، جس سے شہر کا امن برباد تھا اور باشندگانِ شہر عاجز و پریشان تھے۔ بادشاہ کو دہلی اور اہلِ دہلی سے جو بے پناہ محبت تھی، اس کی وجہ سے وہ دہلی کی بربادی دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ شہر میں امن و امان کس طرح قائم ہو۔ چناں چہ اگلے دن یعنی 12 مئی کو انھوں نے شہر کے عمائدین کی ایک کونسل طلب کی جس میں ان امور پر غور کیا گیا کہ "فوج کے لیے غلّے اور قیام کا کیا بندوبست ہو اور اس کے لیے روپے کہاں سے آئے اور یہ بھی کہ شہر میں نظم و نسق کس طرح برقرار رکھا جائے۔"

شہر میں امن و امان برقرار رکھنے کی غرض سے ضعیف العمر بادشاہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر شہر کے معائنے کے لیے نکلے۔ بادشاہ نے دکان داروں کو تسلی دے کر ان کی دکانیں کھلوائیں، لوگوں کو سمجھایا اور بعض کے گھر جا کر انھیں صبر کی تلقین کی۔ مرزا مغل اس اثنا میں تمام افواج کے کمانڈر انچیف مقرر ہو چکے تھے۔ دوسرے شہزادوں کو بھی بڑے بڑے عہدے دیے جا چکے تھے۔ فوج کے تجربہ کار افسران بادشاہ اور کمانڈر انچیف کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرنے کو تیار تھے۔ شہری اور فوجی بدامنی کو روکنے کے لیے ایک 'کورٹ بنائی گئی' جس کے دس ممبر تھے۔ ان میں چھ

فوجی نظم ونسق کے نمائندے تھے اور چار شہری امور کے۔ کثرت رائے کو فیصلہ کن مانا گیا تھا۔ کمانڈر انچیف مرزا مغل فوج کے سربراہ تھے اور ان کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ کورٹ کے کسی بھی فیصلے کو نظر ثانی کے لیے واپس بھیج سکتے تھے اور اگر نظر ثانی کے بعد بھی کورٹ اپنے سابقہ فیصلے پر قائم رہے تو پھر آخری فیصلے کا اختیار بادشاہ کو تھا کہ وہ جو قدم مناسب سمجھیں، اٹھائیں۔ بادشاہ اور کمانڈر انچیف کو کورٹ کے اجلاس میں شرکت کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ 16 مئی کو بادشاہ نے دربار کیا اور حسب ذیل عہدے تقسیم کیے:

مرزا جواں بخت بہادر	:	عہدۂ وزارت کل سلطنت
مرزا مغل بہادر	:	عہدۂ سپہ سالاری کل افواج جنگی وانتظام جمیع تمام پلاٹن وسوارات
مرزا عبداللہ بہادر	:	افسری پلٹن
مرزا سہراب بہادر	:	افسری پلٹن
مرزا محمد کوچک سلطان بہادر	:	افسری پلٹن الیکو نڈر
مرزا محمد کوچک سلطان بہادر		
ومرزا ابوبکر بہادر	:	افسران جمیع ترک سواران

اس سلسلے میں ایک اور خبر 23 مئی کے "سراج الاخبار" میں ملتی ہے، لیکن یہ خبر بھی 15 یا 16 مئی کے آس پاس ہی کسی دن سے متعلق معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ اس میں ان ترک سواروں کی آمد کا ذکر ہے جن کی افسری 16 مئی کی اطلاع کے مطابق مرزا کوچک سلطان بہادر اور مرزا ابوبکر بہادر کو سونپی جا چکی تھی، تاہم یہ خبر بھی قابلِ غور ہے، اس لیے درج کی جاتی ہے:

> "جس دن ترک سواران اور مردم پلاٹن جنگی، خدمت میں حاضر ہوئے تھے، تو بادشاہ نے کہا تھا کہ ہمارے پاس مال وخزانہ نہیں ہے جس سے تمھاری مدد کریں۔ ایک جان ہے اس سے دریغ نہیں۔ ترک سوار وغیرہ اس پر راضی ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا ہم آپ کی فرماں برداری کے لیے حاضر ہیں، ارشاد ہوا کہ میگزین اور خزانے کا بندوبست کرنا چاہیے تاکہ ہمارے تمھارے کام آسکے۔"

اگرچہ کمانڈر انچیف کا عہدہ مرزا مغل کو مل گیا اور بعد میں بخت خاں کو بھی گورنر جنرل کے خطاب سے نوازا گیا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ آخر وقت تک بہ ذاتِ خود فوجی انتظام میں دل چسپی لیتے رہے تھے۔ نیشنل آرکائیوز میں ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن وامان قائم رکھنے کے لیے بادشاہ روزانہ خود احکام جاری کیا کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ 1857 کی اس بغاوت کے پیچھے ایک زبردست جوش اور جذبہ کارفرما تھا، اس لیے کہ اس بغاوت ، براہِ راست تعلق ہندوستان کی تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی زندگی سے تھا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے یہ زندگی بری طرح متاثر تھی۔ ہر شعبۂ زندگی میں ایک بے چینی کی سی کیفیت تھی جسے ذہنی اور جذباتی دونوں سطحوں پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ بدقسمتی سے بغاوت کی تحریک کوئی منظم شکل نہیں اختیار کرسکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سماج کے مختلف طبقوں میں برٹش راج کو اکھاڑ پھینکنے کے مقاصد جدا جدا تھے۔ 1857 کی بغاوت میں حصہ لینے والوں میں موٹے طور پر تین طرح کے عناصر شامل تھے۔ ایک تو وہ سپاہی جن کے ہاں ایک ایسا والہانہ مذہبی جذبہ تھا جس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک سیاسی رنگ اختیار کرلیا تھا۔ دوسرے وہ سپاہی جو وقتی طور پر تو ایک جذبے کے اس تحریک میں شامل ہوگئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس روایتی لوٹ مار میں حصہ لیتے رہے جو ہندوستان بلکہ پورے ایشیا میں فوجی مہموں کا ایک حصہ رہی ہے۔ تیسرے اس تحریک میں شامل ہونے والے وہ لوگ تھے جن کے ہاں کوئی جذبہ نہیں تھا مگر وہ 'مجاہدین' بن کر باغیوں کے ساتھ صرف اس لیے شریک ہوگئے کہ یا تو لوٹ مار میں ہاتھ رنگ سکیں یا انگریزوں کی جاسوسی کریں اور انعام پائیں۔ یہ تمام مثبت اور منفی کردار پوری تحریک میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ان کی شناخت مشکل تھی۔ انگریزوں کی طاقت سے ٹکر لینا یوں بھی آسان نہیں تھا اور جب خود تحریک میں ہی غدار اور موقع پرست لوگ شامل ہوں تو اس کا انجام معلوم۔ ان حالات میں جب بادشاہ نے تحریک کی قیادت سنبھالی تو ہر طرح کی ذمے داریوں اور پریشانیوں نے انھیں بری طرح آن گھیرا۔ ایک طرف تو انگریزوں کو شکست دینا تھا اور دوسری طرح مقامی فتنہ وفساد پر بھی قابو پانا تھا۔

خزانے میں روپے کا نام ونشان نہ تھا۔ سپاہی تنخواہوں کے لیے واویلا مچا رہے تھے۔ ان حالات میں بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا:

"تمام مہاجنوں اور مال دار اشخاص کو گرفتار کر لیا جائے بالخصوص ان کو جو انگریزوں کے ہوا خواہ ہیں اور ان سے باغیوں کی تنخواہ کے لیے روپیہ اینٹھا جائے۔"

حکیم احسن اللہ خاں نے عرض کیا کہ سپاہی شہر میں لوٹ مار کر رہے ہیں اور درخواست کی کہ انھیں شہر بدر کیا جائے۔ چناں چہ اس سلسلے میں فوراً ہی افسران پلاٹن کے نام یہ حکم صادر کیا گیا:

"چوں کہ جنگی پلٹن کے شہر میں وارد ہونے کی وجہ سے شہر کی بربادی کا خطرہ ہے اس لیے انھیں حکم دیا جاتا ہے کہ پلٹن کے افسران اپنے سالار کے ساتھ اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں اور یہی احکام برخوردار کامگار مرزا ظہیر الدین کے لیے بھی ہے جو کل فوج کے سپہ سالار ہیں۔ برخوردار کامگار بھی یہ حکم ان تک پہنچادیں اور تمام فرزندان بھی جو اپنی اپنی پلٹن کے سالار ہیں اپنے خیمے شہر کے باہر نصب کریں تا کہ بادشاہ سلامت کے حکم کی تعمیل ہو کیوں کہ اسی میں ان کی خوشنودی ہے۔ 29 رمضان 21 مئی۔" (فارسی سے ترجمہ)

منشی اجودھیا پرشاد کے سپرد ٹکسال کا کام ہوا اور ان کی نگرانی میں تیزی سے سکے بننے شروع ہو گئے۔ عبداللطیف نے 25 مئی 1857 کو اپنے روزنامچے میں لکھا ہے:

"اس کام میں نہایت اہتمام کیا گیا اور تیزی سے سکہ بننا شروع ہوا۔ سکے کا چہرہ اس طرح روشن ہوا:

سکہ زد در جہاں بفضل الٰہ

شاہ ہندوستاں بہادر شاہ"

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک میں فوجی تنظیم نام کو نہیں تھی۔ ایک بے پناہ جوش تھا جس کی بدولت انقلاب تو برپا ہو گیا تھا لیکن اس انقلاب کی کامیابی اور استحکام کے لیے کوئی باقاعدہ اور سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان حالات میں سب سے زیادہ مصیبت بادشاہ کو خود اپنی نظر آ رہی تھی، ایسے ہنگامی حالات میں بھی شہزادے بدعنوانیوں سے باز نہیں آ رہے تھے۔ فوج کے لیے شہزادے مہاجنوں اور ساہوکاروں سے روپیہ جمع کرتے تھے لیکن اسے خزانے میں جمع نہیں کرتے تھے۔

مجبور ہو کر بادشاہ نے کل اختیارات بخت خاں کو سونپ دیے اور انھیں لارڈ گورنر کا خطاب عطا کیا۔ اگر چہ مرزا مغل کمانڈر انچیف تھے لیکن بات زیادہ بخت خاں ہی کی چلتی تھی، اس بنیاد پر اکثر مرزا مغل اور بخت خاں کے درمیان اختلاف رائے رہتا جو تحریک کی کمزوری کا ایک اور سبب تھا۔ جیون لال لکھتا ہے:

> "محمد بخت خاں نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ اگر کسی شہزادے نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو میں اس کی ناک اور کان کٹوا دوں گا۔ بادشاہ نے جواب دیا تمھیں پورے اختیارات حاصل ہیں، جو بہتر سمجھو کرو۔"

مرزا مغل کے نام بھی ایک شقہ اسی قسم کا جاری کیا گیا کہ جن لوگوں نے شہر میں قتل و غارت اور لوٹ مار مچا رکھی ہے انھیں گرفتار کیا جائے اور شہر کا امن و امان بحال رکھا جائے۔

جولائی کے مہینے میں تحریک اپنے پورے شباب پر تھی۔ شہری امور میں امکان بھر سمجھ بوجھ اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چناں چہ ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے 9 جولائی کو یہ منادی کرائی گئی کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا اسے توپ سے اڑا دیا جائے گا لیکن اگر کوئی بکری ذبح کرنے پر اعتراض کرے گا تو اسے بھی سزا دی جائے گی۔ کچھ دن بعد جب بقر عید کا تہوار قریب آ گیا تو ایک بار پھر گائے کے ذبیحے کی بابت منادی کرا دی گئی اور اس سلسلے میں بادشاہ نے ایک شقہ کوتوال شہر شاہ مبارک خاں کے نام جاری کیا جو اس طرح تھا:

> "حضور والا کا خاص شقہ حضور معلیٰ شجاعت نشان کے دستخطوں کے ساتھ۔ مبارک شاہ خاں کوتوال شہر کو معلوم ہو کہ کل تمام شہر میں شقہ خاص کے مطابق یہ منادی کرا دی جائے کہ گائے کا ذبیحہ یا قربانی قطعی ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ شہر کے تمام دروازوں پر یہ بندوبست کر دیا جائے کہ کسی بھی جانب سے گائے یا بھینس فروخت کرنے والے آج سے لے کر عید کے تین روز بعد تک گائے یا بھینس شہر میں نہ لائیں۔ جن مسلمانوں نے گائیں پال رکھی ہیں وہ اپنی گائیں کوتوالی میں بندھوا دیں۔ اگر کوئی شخص خفیہ طور پر یا اعلانیہ گائے کی قربانی کرے گا تو اسے موت کی سزا دی جائے گی۔"

(فارسی سے ترجمہ)

شہر کوتوال نے اس شقے کی روشنی میں جملہ تھانیداران شہر کے نام احکام جاری کیے اور تھانیداروں کو تاکید کی کہ اس حکم کو نہ صرف اپنے اپنے علاقوں میں مشتہر کریں بلکہ اس کی وصولیابی کی رسید بھی کوتوال شہر کے پاس بھیجیں۔ اس حکم کے اجرا کے بعد عملی دشواریوں کے پیش نظر کوتوال نے کمانڈر انچیف کو لکھا کہ کوتوالی میں اتنی گنجائش نہیں کہ یہاں گائیں رکھی جا سکیں۔ جواباً کمانڈر انچیف نے ایک حکم جاری کیا جس میں ہدایت کی گئی کہ وہ تمام لوگ جن کے پاس پالتو گائیں ہیں، ان سے یہ عہد نامہ بھروالیا جائے کہ وہ گائیں ذبح نہیں کریں گے۔ اس قانون پر سختی سے عمل درآمد کیا گیا۔ چناں چہ ایک شخص کی گرفتاری عمل میں آئی جس نے انگریزوں کی سازش کے تحت محض تنازعے کی غرض سے گائے ذبح کر ڈالی تھی۔ شہر کوتوال نے مرزا مغل کے نام اپنے ایک خط میں اس معاملے پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ”حقیقت یہ ہے کہ مسمی عبدالرحمٰن ولد محمد پناہ، شیخ پیشہ ساکن چاہ سرخ، غلام محمد ومحسن ولد عظیم اللہ، ساکن قدم شریف کو... حوالدار کمپنی اول نے کہ تعینات موری دروازے کے ہے علت گاؤکشی اس عبارت سے کہ انگریزوں سے سازش کرکے پانصد روپیہ لینا کرکے ہمارے گارڈ کے سامنے بہ ارادہ تنازعہ ہوجانے ہندو مسلمان میں کری۔ اس علت میں گرفتار کوتوالی ہوئے۔“

ایک طرف تو یہ احتیاط و انتظام تھا اور دوسری طرف جاسوس بیخ کنی پر لگے ہوئے تھے۔ انگریزوں کو پل پل کی خبر مل رہی تھی اور اسی اعتبار سے وہ اپنے منصوبے بناتے تھے۔ قلعۂ معلی کی سیاست، اندرونی نفاق، فوجی بد نظمی غرض انگریز انقلابیوں کی ہر کمزوری سے باخبر تھے اور اس لیے بددل نہیں تھے۔ گوری شنکر جاسوس لکھتا ہے:

> ”آج کہ روز شنبہ ہے، راقم فوج میں گیا تھا اور نیک (نائیک) سدھاری سنگھ کے کیمپ میں زیادہ دیر تک ٹھہرا۔ مگر سپاہ کو کمال بددل پایا۔ ایک ایک سپاہی افسر کا مقابلہ کرتا تھا اور حکم مطلق خیال میں نہیں لاتا تھا اور فوج مفلس ہوگئی اور روپے کی بہت قلت ہے۔ سپاہی پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اگر ہم کو تنخواہ نہیں ملے گی تو ہم نہیں رہنے کے۔ چناں چہ آج ہی سو نفر سے زیادہ تلنگا چلا گیا۔ ہر روز قافلے کی روانگی جاری ہے مگر مرزا مغل زیادہ تر فوج کی تسلی کرتا رہتا ہے اور ہر روز تنخواہ تقسیم کا حکم جاری ہوتا ہے۔ اس بات سے اس قدر فوج مقیم ہے ورنہ اب تک بہت سی چلی جاتی۔“

بغاوت کے آخری دنوں میں انگریزوں کی فتح سے قبل ہی تحریک تقریباً دم توڑ چکی تھی۔ خزانے میں روپیہ ختم ہو چکا تھا اور سپاہی تحریک کے مقاصد کو چھوڑ کر اپنی اپنی تنخواہوں کی فکر میں لگ گئے تھے۔ ستمبر کے مہینے میں ابتدا ہی سے زوال کے آثار صاف نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔

اب بہادر شاہ ظفر کسی بھی قیمت پر اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھے کہ انگریز آ کر دہلی پر قبضہ کر لیں اور انھیں اور ان کے خاندان کو پھانسی دے دیں۔ اس لیے وہ ہر قیمت پر جنگ جاری رکھنے کے حق میں تھے اور فوج کی تنخواہ کی ادائیگی کے لیے اپنا ساز و سامان بھی الگ کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔

قلعے کی سیاست نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تک انگریزوں کو شکست دینے کے لیے بہادر شاہ ظفر اپنا مال و دولت ہی لٹا رہے تھے لیکن اب انھوں نے اس جنگ کو جیتنے کے لیے اقتدار کی بازی بھی لگا دی۔ چناں چہ جب باغی فوجوں سے کچھ کام بنتا نظر نہیں آیا تو رجواڑوں سے رجوع کیا گیا اور انھیں اس بات کی دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس جنگ میں بادشاہ کا ساتھ دیں گے تو بادشاہ اپنے شاہی اختیارات بھی انھیں سونپ دیں گے۔ اس سلسلے میں جیون لال رقم طراز ہیں:

> "جے پور، بیکانیر اور الور کے راجگان کے نام بادشاہ کی دستخطی چٹھیاں بھیجی گئی ہیں جن میں لکھا گیا تھا کہ مجھے فوج کی ضرورت ہے اور میں انگریزوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہوں لیکن چوں کہ اس وقت میرے پاس سلطنت کا انتظام کرنے کے لیے قابل اعتماد آدمی موجود نہیں ہیں اس لیے میں ریاستوں کی ایک مجلس بنا دینا چاہتا ہوں، اگر وہ ریاستیں جن کے نام خط بھیجے جا رہے ہیں، اس غرض کے لیے مجلس بنا لیں گے تو میں نہایت خوشی سے اپنے شاہی اختیارات ان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔"

بادشاہی کیمپ میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور ادھر انگریز اپنے منصوبے تیار کر رہے تھے۔ گوری شنکر کا آخری خط جو نیشنل آرکائیوز میں ملتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ اس نے شہر دہلی کی ساری صورت حال انگریزوں پر واضح کر دی تھی اور انھی معلومات کی بنیاد پر انگریزوں نے شہر پر ایک بھرپور اور کامیاب حملہ کیا۔ گوری شنکر نے یہ خط بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جس کا مضمون حسب ذیل ہے:

'' واضح ہوا ہے کہ آپ میرے سے تین سوال کا جواب طلب کرتے ہیں۔ اول یہ کہ اندرون شہر کس کس مقام پر سامانِ جنگ کیا ہے، اندرون قلعہ کی جگہ جمعیت واسطے لڑائی کے ہے یا نہیں اور اضراب توپ کہاں لگائی گئی ہیں۔ دوم یہ کہ فوج سوار و سپاہ کہاں کہاں جمعیت رکھتی ہے۔ سوم یہ کہ کابلی دروازے سے تا اندرون شہر چار پل ہیں، ان میں سے کوئی شکستہ ہوا یا نہیں۔ سو اب جواب ہر ایک کا مفصل لکھا جاتا ہے۔ اول سوال کا جواب یہ ہے کہ سامانِ جنگ جملہ تیرہ دروازہ ہائے شہر پر ہے اس میں سے خصوصیت سے کشمیری دروازہ و کابلی دروازہ و اجمیری دروازہ۔ چناں چہ کشمیری دروبزہ (کذا) دروازہ و بروج متعلقہ اس کے و کابلی دروازہ صدمات (کذا) سرکاری سے توپ ان کی مسدود ہو گئی بلکہ برج سیاہ منہدم ہو گیا اور شہر پناہ اس طرح سے تا گرجا شکست ہو گئی اور کابلی دروازے کا بالکل تیغہ ہے اور لال دروازہ بند اور کھڑکی فراش خانہ بالکل مسدود۔ باقی رہا اجمیری دروازہ، اس پر زیادہ سامانِ جنگ ہے۔ اتواپ مقدار دروازہ ضرب مدرسہ غازی الدین لگائی ہوئی ہیں اور ماوری (موری) دروازہ ہائے مذکور اور کسی جگہ سامان جنگ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر روز خبر جملہ لشکر سرکاری جو گرم پائی گئی دو توپ جستی بر سڑک لاہوری دروازہ و بر مکان کوتوال اور ایک توپ بر کوٹھی لالہ ہرنرائن بر نہر سعادت خاں واقع ہے اور سڑک سے داہنی طرف لگا دی ہے، مگر اب وہ اتواپ اٹھا کر لے گئے اور لاہوری دروازہ اور کشمیری دروازہ (یا) کے مابین جو راہ آمد و رفت ہے ان پر دو ...ملابت کوچہ بنی ہوئی ہیں ان کے اوپر دمامہ واسطے لگانے اتواپ کے بنایا ہے.... علیٰ ہذا القیاس، دیوار شکستہ شہر پناہ کا ہے اور یہی حال ہے اور اندرون قلعہ جمعیت پلٹن دو کی ہے۔ منجملہ اس کے ایک سلیم گڑھ اور ایک قلعے میں اور ساری پلٹن و سوار رجمنٹ بہم اردلی شہزادہ قلعے میں جمعیت رکھتے ہیں اور تین ضرب توپ جستی آہنی دیوان عام میں اور ایک ضرب دروازہ دہلی اور ایک لاہور قلعے کی (کذا) دروازہ رکھی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جمعیت سوار و پیادوں کی ایسا مقام یا کوئی کوچہ و بازار شہر میں باقی نہیں ہے جہاں فوج نہیں ہے، باقی رہا (کذا) قلت و کثرت سواروں کا حال لکھا جاتا ہے کشمیری دروازے پر کوٹھی کرنل جیمس اسکنر صاحب موجودہ ایک پلٹن جلیسر اور ایک پلٹن بریلی اور کابلی اور (بدرو) دروازے کے درمیان میں (حسن) پلٹن کی کمپنی میں

۔ اور تم بوجھ کی طرف ایک پلٹن اور لاہوری دروازے ہیں (کذا) واجمیری دروازہ مدرسہ نواب غازی الدین خاں ایک پلٹن (کذا) بازار تین حوض قاضی اور بازار سیتارام ومحلہ املی ترکمان دروازہ تین پلٹن سو تین اور ۔ فرد کش ہیں اور دہلی دروازے کے درمیان بازار ۔۔۔ اور دریا گنج میں پانچ پلٹن چاندنی چوک میں سواران ہندوستان اور رسالہ سوم متعین ہیں۔ تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جس قدر پل یا نہر متعلق کابلی دروازہ کشمیری دروازہ شہر واقع ہیں تا ایندم صحیح سلامت ہیں۔"

اسی خط کے آخر میں گوری شنکر لکھتا ہے:

"اور واضح ہووے کہ راقم کی کارگزاری منظور ہوئی ہووے ساتھ قلعہ کیست عنایت ہوں اگر ایک صرف فدوی کے واسطے عنایت کریں گے تو فدوی نہیں لے گا۔"

اہل شہر رعیت میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں اپنے بادشاہ سے عقیدت اور محبت تھی اور وہ بادشاہ کو خدا کا سایہ تصور کرتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے ان کے بادشاہ کی حیثیت کیا رہ گئی تھی، اس بات کی عام لوگوں کو نہ تو کچھ خبر تھی اور نہ اس سے انھیں کوئی سروکار تھا۔ انقلابی فوجوں میں نظم و نسق کی کمی اور روپے کی قلت کی وجہ سے کچھ لوگ ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کچھ لوگ اتنے دنوں میں جنگ میں مرے بھی تھے۔ اب آخری حل یہی رہ گیا تھا کہ شہر کی حفاظت کے لیے ہر فرد و بشر کمر بستہ ہو جائے۔ جس طرح ملک کی تمام طاقتوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے دہلی اور لال قلعے کا رخ کیا گیا تھا اسی طرح اب پوری دہلی کو ایک مرکز پر لانے کے لیے اور اس بات کے لیے کہ فوجی اور شہری ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد میں حصہ لیں بادشاہ خود اٹھے۔ چناں چہ 12 ستمبر کے روز حسب ذیل منادی شہر میں کرائی گئی:

"بوقت شب شہر میں منادی ہوئی کہ بادشاہ سلامت سوار ہوں گے مناسب ہے کہ ہنود و مسلمان، ہمراہ تحفر واسطے جہاد کے ساتھ ہوویں چناں چہ معاً دس بارہ ہزار آدمی شہر کا مسلح قلعے میں گیا۔"

جیون لال نے بھی اس واقعے کا ذکر اس انداز سے کیا ہے:

"منادی کرا دی گئی کہ بادشاہ بہ نفس نفیس آج رات کو انگریزوں پر حملے کی کمان کریں گے اور انھیں تباہ کر دیں گے اور تمام شہر کو دعوت دی گئی کہ وہ بھی انگریزی لشکر پر حملے

میں شریک ہوں اور انگریزوں سے لڑیں۔ اعلان میں ہندو اور مسلمان دونوں سے
درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس کام کے لیے حلف اٹھادیں۔"

بالآخر 14 ستمبر 1857 کو انگریزوں کی فوجیں کچھ ایسے مقامات سے جہاں فصیل شکستہ ہوگئی تھی، شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئیں۔ 14 ستمبر کو انگریزی فوجیں کوتوالی اور جامع مسجد تک پہنچ گئیں۔ باغیوں نے جامع مسجد میں پناہ لی اور وہیں سے مدافعت کرتے رہے۔ انگریزوں کی پیش قدمی کو عارضی طور پر روک دیا گیا اور وہ کشمیری دروازے کی طرف واپس چلے گئے۔

غلام حسین کے قول کے مطابق بادشاہ خود سوار ہو کر لال ڈگی پر تشریف لائے اور تمام افواج و رعایا جمع ہوئی لیکن انگریزوں کی گولیاں لال ڈگی تک پہنچتی تھیں اس لیے افسران نے عرض کیا کہ حضور کا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ حضور کو کچھ صدمہ پہنچے۔ بادشاہ ان لوگوں کے کہنے سے قلعے میں چلے آئے۔

گرفتاری کے بعد بادشاہ کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا تھا، جیسا کسی بہت ہی برے اخلاقی مجرم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر چہ ان کو آہنی سلاخوں میں تو نہیں رکھا گیا لیکن پھر بھی ان کی حالت انتہائی قابلِ رحم اور عبرت ناک تھی۔ جب ہڈسن ہمایوں کے مقبرے سے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے لایا تو لال قلعے کے دروازے پر انھیں ساؤنڈرس کے حوالے تو کر دیا لیکن انھیں زندگی میں دوبارہ لال قلعے میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

نوٹ: ماخذ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'بہادر شاہ ظفر': اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو (ہند) 1986

اقبال حسین

شہزادہ فیروز شاہ

1857 کی پہلی جنگ آزادی کی تحریک کو کچلنے میں شریک انگریز اور یورپی افراد کے کارناموں اور حیات کو بہت سے غیر ملکی مورخین نے قلمبند کیا ہے لیکن ہندوستانی رہنماؤں، ان کی حیات اور جنگ آزادی میں ان کے کارناموں کو انھوں نے کم لکھا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے۔ 1857 کی خونچکاں واقعات کے بعد عام طور پر ہندوستانی اہل قلم اس قدر خوف زدہ تھے کہ ان کے لیے اس موضوع پر قلم اٹھانا موت کو دعوت دینا تھا۔ ان حالات میں 1857 کی جنگ آزادی میں شریک رہنماؤں کے متعلق ہم عصر ہندوستانی مورخین، یا تو خاموش ہیں یا بہت کم لوگوں نے کچھ لکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں شہزادہ فیروز کے متعلق معلومات کسی ایک ماخذ سے نہیں ملتیں۔

شہزادہ فیروز شاہ کے آباؤ اجداد کے متعلق مختلف رائیں ملتی ہیں اور یہ تمام رائیں ان مورخین کی ہیں جو ان کے ہم عصر نہیں تھے اور جنھوں نے شہزادہ کے متعلق کافی برسوں کے بعد لکھا ہے۔ تقریباً قریبی ہم عصر مورخ کمال الدین حیدر، شہزادہ فیروز شاہ کو مرزا ناظم بخت کا بیٹا اور فرخ سیر کا نواسہ بتلاتا ہے[1] انتظام اللہ شہابی آپ کو مرزا ناظم بخت کا خلف اور شاہ عالم ثانی کا پوتا بتلاتے ہیں جو بادشاہ فرخ سیر کے نواسہ تھے۔[2] انگریز مورخین بھی اس باب میں مختلف الرائے ہیں۔ بہر حال ہمیں شہزادہ فیروز شاہ کے اعلانیہ مورخہ 25 اگست 1857 سے یہ صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ابو المظفر سراج الدین بہادر شاہ غازی کے پوتے تھے۔[3]

شہزادہ فیروز شاہ کے ابتدائی حالات کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ غالباً 1855 میں آپ

دہلی سے حج کے لیے روانہ ہوئے تھے اور مئی 1857 میں واپس ممبئی آئے تو شمالی ہندوستان میں مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں کا علم ہوا۔ وہ دہلی کی طرف چلے کیونکہ بقول تھامسن وہ 1857 کی لڑائی کو انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ سمجھتے تھے۔ انگریزوں کے خلاف ان کی جنگ آزادی کے متعلق سلسلہ وار تفصیلات نہیں ملتی ہیں تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو برابر کی مہموں میں شریک تھے۔ یعنی اول مہم کا مقصد انگریزوں کی طاقت کو مالوہ اور مشرقی راجپوتانہ کے علاقوں میں نقصان پہنچانا اور کمزور کرنا تھا[4] اور دوم مرکزی یا وسط ہند میں انگریزوں کے خلاف ایک محاذ کھول کر، شمال کی طرف پیش قدمی کرنا تھا۔ چنانچہ اس حکمت عملی کے تحت شہزادہ فیروز جولائی سے نومبر 1857 کے دوران مالوہ کے گردونواح میں سرگرم عمل رہے۔ مالوہ کے علاقے میں روہیلہ افغانوں کی بڑی آبادیاں تھیں جیسے بھوپال، جاورا وغیرہ جہاں کے حکمران مسلمان تھے اور انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔ تاہم ان ریاستوں میں اندرونی چپقلش اور انتشار تھا بالخصوص جانشینی کا مسئلہ اور دیگر خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے بہت سے افراد حکمران طبقے سے ناراض تھے۔ بھوپال کی ولی عہدی کے معاملے میں ناراض نواب وارث محمد خان اندور میں انگریزوں کے خلاف مہم چلا رہے تھے۔ بھوپال کے خاندان سے متعلق امیانی نوابین الگ انگریزوں کے خلاف محاذ آرا تھے۔[5] ٹونک کے نواب نے انگریزوں کا حلیف رہنا ہی پسند کیا لیکن اس کے چچا کو انگریز مخالف ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ جاورا کا نواب انگریزوں کے ساتھ تھا لیکن اس کا قریبی عزیز عبدالستار خاں شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ آملا تھا اور وہ فروری 1859 تک جنگ کرتا رہا۔

مالوہ اور اس کے گردونواح میں عرب اور روہیلہ پٹھانوں کی بڑی تعداد ان سپاہیوں کی تھی جو حیدرآباد اور دیگر ریاستوں سے فوجی ملازمتوں سے تخفیف کردیے گئے تھے۔ یہ لوگ بے کاری اور معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ تاہم بقول میک من یہ لوگ باغیانہ عزائم کے باوجود بڑی حد تک بے ضرر تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی کمان میں تعینات فوج پورے علاقے میں یا تو باغی ہوچکی تھی یا بغاوت کے قریب تھی۔

4 جون 1857 کو نیمچ میں متعین فوج، 8 جون کو نصیر آباد کی فوج اور 14 جون

1857 کو گوالیار کی فوج نے بغاوت کردی۔[6] اندور میں وارث محمد خاں، سعادت خاں بے کاری کے شکار فوجی عہدہ داران اور مولوی عبدالصمد ایک پر جوش مجاہد آزادی جنگ کی رہنمائی کر رہے تھے۔ مہو میں متعین فوج مراد علی کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف کھڑی ہوگئی۔[7] اس دن دہار میں متعین فوجیوں نے بھوپاوار اور سردرپور میں انگریزی چوکیوں کو نذر آتش کردیا۔ 31 اگست 1857 کو مجاہدین آزادی دہار کے قلعے پر قبضہ کرچکے تھے۔ امجھیرا اور جھبوا کے راجاؤں کی فوج میں زیادہ تر عرب تھے وہ انگریزوں کے مخالف تھے اور مجاہدین کے ساتھ شامل ہوکر ان کی مدد کرنے لگے[8] ان کا مطالبہ تھا کہ یورپی بھگوڑوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ گردونواح میں انگریزوں کے خلاف پھیلی ہوئی نفرت اور غصہ کو دیکھتے ہوئے شہزادہ فیروز شاہ نے اس علاقے سے جنگ آزادی چھیڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہر چند کہ شہزادہ فیروز شاہ کے پاس وسائل اور فوج کی کمی تھی، تاہم ان کی شخصیت کا مثبت پہلو یہ تھا کہ وہ مغل شاہزادہ تھے، بہادر شاہ ظفر کے پوتے تھے اور اب مکہ معظمہ سے حج کرکے لوٹنے کے بعد ان کی مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی اہمیت اور قدر و قیمت بڑھ گئی تھی۔ اس لیے دہلی سے دور وسط ہند کا یہ علاقہ انگریز مخالف سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ عام مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف متحد کرنے میں مولوی حضرات کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو جہاد کی فضیلت بیان کرکے مسلمانوں میں جہادیوں کی ایک رضا کار جماعت بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

جولائی 1857 میں مندسور کی فتح کے بعد مہاراجہ سندھیہ کی فوج سے بغاوت کرکے بہت سے افغان اور دیگر غیر ملکی فوجی شہزادہ فیروز شاہ کی کمان میں آگئے، میواتیوں کی بھی بڑی تعداد شہزادہ کی فوج میں شامل ہوگئی تھی۔ شہزادہ فیروز شاہ کی فوج میں ہر طبقہ و مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ایک برٹش اندازہ کے مطابق 5000 میواتی، 500 افغان، بھیم نائک کی کمان میں 200 بھیل، 400 مکرانی، اور 3000 مختلف طبقات کے لوگ اور 1000 گھوڑ سوار شہزادہ کی قیادت میں پہلی جنگ آزادی میں شریک تھے۔[9]

شہزادہ فیروز نے مندسور پر قبضہ کرنے کے بعد انتظامیہ کی طرف توجہ دی اور مرزا جی

اجارہ دار مہد پور کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اپنے انتظامیہ کو مستحکم کرنے کے لیے شہزادہ نے قرب و جوار کے راج گھرانوں جیسے پرتاپ گڑھ، جاورہ، سیتامئو، رتلام اور سالمبر کو خطوط بھیجے[10] کہ وہ اس کی حکومت کو تسلیم کرلیں اور بارود و اسلحہ جات کے ساتھ روپیوں کو بھی فراہم کریں۔ شاور (Shower) کے مطابق کئی راج گھرانے شہزادہ کے ساتھ ہو گئے۔[11]

مندسور میں شہزادہ فیروز شاہ کے اقدامات اور بتدریج اس کی مستحکم ہوتی ہوئی قوت انگریزوں کے لیے باعث فکر تھی۔ انگریزوں کا ممبئی سے براہ راست رابطہ خطرہ میں پڑ گیا تھا۔ ستمبر 1857 فیروز شاہ کی کمان میں اٹھارہ ہزار افراد تھے۔ شہزادہ فیروز، کوٹہ کے مجاہدین آزادی سے بھی رابطہ بنائے ہوئے تھے جنھوں نے انگریزوں کے حلیف مہاراؤ کو اکتوبر 1857 میں قید کرلیا تھا۔ انگریزوں نے شہزادہ فیروز کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لیے ڈیورینڈ اور اسٹیورٹ کی قیادت میں فوج بھیجی جس کی وجہ سے جاورہ کے نواب کو مجاہدین آزادی کا ساتھ دینے کی ہمت نہیں ہو سکی۔[12]

ریاست حیدرآباد میں 12 جون کو جہاد کا سبز پرچم بلند کیا گیا۔[13] 17 جولائی 1857 کو روہیلہ سردار طرہ باز خاں نے مولوی علاء الدین کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا۔[14] لیکن اُمرائے دکن اور والی حیدرآباد کا رویہ مجاہدین کے حق میں نہ تھا جس کی وجہ سے انگریزوں نے بڑی تیزی کے ساتھ دکن کے مختلف حصوں پر اپنا اقتدار بحال کرلیا اور اندور کے مجاہدین کی راہ مندسور سے منقطع کردی جس کی وجہ سے مجاہدین دو حصوں میں بٹ کر رہ گئے۔ انگریزی فوج نے اسٹیورٹ ڈیورینڈ کی قیادت میں یکے بعد دیگرے دہار، جیرن وغیرہ علاقوں پر دوبارہ قبضہ جمالیا اور پیش قدمی کرتی رہی۔ شیخ رحمت اللہ نے مہد پور کے مجاہدین کی قیادت سنبھال لی تھی لیکن میجر اُرتے، ان کو راول کے مقام پر 13 نومبر 1857 کو شکست دے دی۔[15] دریں اثنا شہزادہ فیروز شاہ نے جو 8 نومبر تا 22 نومبر 1857 نیچ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے، انگریزی افواج کی پیش قدمی اور کامیابیوں سے مجبور ہو کر محاصرہ اٹھالیا۔ 24 نومبر کو مالوہ پر اقتدار کی فیصلہ کن جنگ گرار یا کے مقام پر ہوئی۔[16] شہزادہ فیروز شاہ کی دفاعی کوششوں کی وجہ سے انگریزوں کو

مندسور پر قبضہ کرنے میں کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ صورت حال شہزادہ فیروز شاہ کے لیے بہت نازک ہو چکی تھی۔ وہ مندسور چھوڑ کر منگوہ چلے آئے۔(17)

شہزادہ فیروز نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ وہ مالوہ سے شمالی ہند چلے آئے۔ آگرہ میں ڈاکٹر وزیر خاں ان کے ساتھ ہو گئے۔ شہزادہ نے 17 فروری 1858 کو ایک اعلانیہ جاری کیا جس میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد قائم رکھنے پر زور دیا گیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کی اپیل کی گئی تھی۔ یہ بھی اصرار کیا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس مذہبی جنگ میں شریک ہوں اور انگریزوں کو ملک بدر کر دیں۔(18)

مارچ 1858 میں شہزادہ فیروز اودھ میں موجود تھے۔ غالباً ان کا منصوبہ تھا کہ وہ احمد اللہ شاہ، اودھ، اور خان بہادر خان کی افواج کے ساتھ مشترکہ طور پر محاذ آرا ہوں لیکن اودھ کے حالات، اندرونی مناقشوں اور درباری ریشہ دوانیوں کی وجہ سے سازگار نہ تھے۔ احمد اللہ شاہ اپنی جنگی صلاحیتوں اور فوج کی وجہ سے ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔ اودھ میں اقتدار کی جنگ بھی جاری تھی۔ بیگم حضرت محل اپنے بیٹے برجیس قدر کے پردہ میں نام نہاد حکمران تھیں۔ دریں اثنا احمد اللہ شاہ نے بھی بادشاہت کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے شہزادہ فیروز شاہ بھی خوش نہیں رہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادہ فیروز شاہ کی فوج گھٹ کر چند سوافراد پر رہ گئی۔ 18 مارچ 1858 کو لکھنؤ پر انگریزوں کے حملہ کے وقت وہ لکھنؤ کے دفاع میں سب کے ساتھ شریک تھے۔ لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد وہ بریلی خان بہادر خاں کے پاس چلے گئے۔ 22 اپریل 1858 کو روہیلہ پٹھانوں اور 12 ویں غیر مستقل گھوڑ سوار فوج کے جہادی فوجیوں کے ساتھ مراد آباد پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن 27 اپریل کو بریگیڈیر جونس کی پیش قدمی کی وجہ سے وہ بریلی لوٹ آئے۔(19)

مئی کے آغاز سے ہی انگریزوں کی فوجی مصلحت متفقہ طور پر یہ قرار پائی تھی کہ روہیل کھنڈ پر مکمل قبضہ کر لینا ضروری ہے۔ انگریزی افواج نے چاروں طرف سے بریلی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ 5 مئی کو فیروز شاہ اور انگریزوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی۔ فیروز شاہ کے ساتھ غازیوں کی ایک مختصر جماعت تھی۔ یہ لوگ صرف تلواروں، خنجروں اور بھالوں سے لیس تھے اور ان

کی مخالف فوج جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ غازیوں کی جرات اور شجاعت کا اعتراف ایک انگریز فوجی اس طرح کرتا ہے:

> "غازی بھلے لوگ تھے۔ یہ بھوری داڑھیوں والے معمر لوگ سبز عمامے اور کمر بند کے ساتھ اور ان میں ہر ایک کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس پر قرآن پاک کی چند آیات کندہ تھیں، ڈھالوں کے نیچے سر جھکائے ہوئے حملہ آور ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ان کے سروں پر گردش کر رہی تھیں۔ وہ دین، دین کا نعرہ لگا رہے تھے اور مجذوبوں کی طرح رقصاں تھے۔"(20)

بریلی میں شہزادہ فیروز شاہ اور دیگر سربرآوردہ مجاہدین آزادی کو شکست ہوئی۔ تاہم انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو چکی تھی کہ تمام اہم مجاہدین آزادی جیسے احمد اللہ شاہ اور بیگم حضرت محل نے انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ انگریزی فوج کیمبل کی قیادت میں بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ 18 مئی کو کیمبل نے مجاہدین آزادی کو شاہ جہاں پور اور محمدی سے بے دخل کر دیا۔ 5 جون کو احمد اللہ شاہ کی شہادت[21] سے مجاہدین کے حوصلے پست ہو گئے تاہم فیروز شاہ نے جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ 10 جون 1858 کو وہ بانگر مئو کے گرد و نواح میں اپنی فوج کے ساتھ انتظامیہ کی بحالی میں مصروف تھے۔[22] انھوں نے علاقے کے زمینداران کی اعانت حاصل کرنے کے لیے یہ اعلان جاری کیا کہ جو لوگ ان کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں شریک ہوں گے ان سے تین سال تک مال گزاری نہیں لی جائے گی۔ انھوں نے اللہ داد خاں کو بانگر مئو کا تحصیلدار مقرر کیا اور زر پت سنگھ کی فتح پور چوراسی کی تقرری کے لیے راہ ہموار کی[23] فیروز شاہ نے صفی پور کو اپنا مستقر بنایا تھا۔[24] ان کی مدد سینگل گنج کے افغان اور میواتی زمینداران کر رہے تھے۔ بہت سے علما اور ایک بزرگ جو لکڑ شاہ کے نام سے مشہور تھے ان کے ساتھ 16 جولائی 1858 کی موہان اور ملیہا کی مہم میں شریک تھے۔[25]

جولائی اور اگست 1858 میں فیروز شاہ کی انگریزی فوج سے رحیم آباد اور سندیلہ میں جنگ ہوئی۔ انھیں پسپا ہونا پڑا کیونکہ کوانگ نے ان کو ہر طرف سے گھیرنا شروع کر دیا تھا۔ مجبور ہو کر شہزادہ نیپال کی طرف چلے گئے۔ ستمبر اور اکتوبر 1858 وہ دوبارہ ہندوستان میں نورنگ آباد اور

سیتاپور کے علاقوں میں کچھ اور مغل شہزادوں کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔[26] اکتوبر 1858 میں خان بہادر خاں اور شہزادہ فیروز نے بیتاؤلی کے راجہ سے مدد حاصل کر کے دوبارہ انگریزوں سے مقابل ہوئے۔ لیکن بیتاؤلی کی جنگ میں ہار گئے۔ راجہ ز پت سنگھ اور لکڑ شاہ ان کی مدد کے لیے موجود تھے۔[28]

یکم دسمبر 1858 کو لکھنؤ سے پچاس میل شمال مغرب میں واقع بسوا میں مجاہدین آزادی اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی۔[29] فیروز شاہ شکست کے بعد نیپال کے جنگلوں میں چلے گئے لیکن 11 دسمبر 1858 کو 2500 افراد کی جمعیت کے ساتھ قنوج کے قریب گنگا عبور کر کے بندیل کھنڈ میں تانتیا ٹوپے کی فوج کے ساتھ مل کر جنگ جاری رکھی۔ سر جمپر کی قیادت میں انگریزی فوج سے شہزادہ کی فوج کا مقابلہ ہوا جو یک طرفہ ثابت ہوا۔ شہزادہ کی فوجی طاقت نہ کے برابر تھی۔ تمام ہزیمتوں کے باوجود 13 جنوری 1859 میں اندر گڑھ میں شہزادہ فیروز اور تانتیا ٹوپے ساتھ ہو گئے۔ لیکن دونوں کی مشترکہ فوج جو شکل سے دو ہزار افراد پر مشتمل تھی۔[30] 21 جنوری کو سیکر میں مجاہدین کی مشترکہ فوج کی پھر ہار ہوئی۔ تانتیا ٹوپے اور شہزادہ فیروز دو حصوں میں بٹ گئے۔ کچھ دنوں تک شہزادہ فیروز، نانا صاحب کے بھتیجے راؤ صاحب کے ساتھ سرونج کے جنگلوں میں بھٹکتے رہے۔ میدانی جنگ میں انگریزی فوج سے مقابلہ مشکل دیکھ کر مجاہدین آزادی نے تانتیا ٹوپے کی قیادت میں گوریلا جنگ شروع کر دی تھی۔[31] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقل جنگ آزمائی اور جابجا در بدری کی وجہ سے شہزادہ فیروز اور ان کے رفقا وقتی طور پر مفاہمت کی سیاست پر آمادہ ہو گئے تھے۔ انگریزوں سے مفاہمت کی شرائط میں شہزادہ نے مغلوں کے وقار کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔ وسط ہند میں انگریز ایجنٹ اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''وہ تیمور شاہ کے خاندان کے ایک شہزادہ کی طرح تمام القاب و آداب کا استعمال کرتا ہے اور بہت سے مطالبات جیسے کہیں بھی آنے جانے کی آزادی، مستقبل میں اس کے رفیقوں کے گزارہ کے لیے معقول انتظامات اور ہتھیار رکھنے کی پوری آزادی وغیرہ۔ مطالبات نا قابل قبول ہیں۔''[32]

مجاہدین آزادی کے لیے حالات بہت مشکل ہوتے جا رہے تھے۔ شمالی ہند میں وہ پسپا کیے جا چکے تھے وسطی ہندوستان میں راؤ صاحب اور شاہزادہ فیروز کی جہد آزادی آخری سانسیں

لے رہی تھی۔ 11 فروری 1859 کو بریگیڈیر ہومز نے شہزادہ فیروز اور راؤ صاحب کی مختصر فوج کو شانہ کے مقام پر شکست دی۔[33] ان شکستوں کے باوجود شہزادہ نے انگریزوں کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے۔ 20 اگست 1859 کو، ساگر کے جنگلوں میں پتری کے مقام پر جنرل ہاٹ نے گھیر لیا تھا۔ شہزادہ جان بچا کر اندرون جنگل چلے گئے اور برسوں بھٹکتے رہے۔ بعدازاں وسط ایشیا اور ایران چلے گئے۔ غالباً شہزادہ ان علاقوں کے حکمرانوں سے فوجی امداد حاصل کر کے جنگ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 1861 اور پھر 1863 میں امیر بخارا سے بھی ملے تھے لیکن کوئی کامیابی نہ حاصل کر سکے کیونکہ امیر بخارا خود روس کے خطرات سے دوچار تھے۔ شہزادہ فیروز 1868 میں کابل بھی گئے تھے لیکن امیر کابل انگریزوں کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے تھے اس لیے شہزادہ کو مایوس ہونا پڑا۔[34]

اکتوبر 1873 میں شہزادہ فیروز کے متعلق برطانوی سفیر مقیم ترکی نے خبر دی تھی کہ وہ استنبول میں رہ رہے تھے۔ جولائی 1873 میں انگریزوں کو خبر ملی کہ شہزادہ مکہ کی جانب جا چکے ہیں۔ جون 1875 میں شہزادہ مکہ میں تھے اور 17 دسمبر 1877 کو وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ آخر وقت تک ان کی شریک حیات سلطان زمانی بیگم ان کے ساتھ تھیں۔ 1881 میں لارڈ رپن نے زمانی بیگم کے گزارہ کے لیے سو روپیہ ماہانہ کی رقم اس شرط پر دی تھی وہ دہلی لوٹ کر نہیں جائیں گی۔[35]

II

شہزادہ فیروز شاہ کی زندگی کا بیشتر حصہ انگریزوں کے خلاف جنگ میں گزرا۔ جنگ آزادی کے دوران انھوں نے تین اعلامیے اردو میں جاری کیے تھے جو اس وقت عوام کی زبان تھی۔ افسوس ہے کہ اب ان اعلانیوں کے اردو متن نہیں ملتے۔ تاہم انگریزوں نے اپنے مقصد کے لیے ان اعلانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرالیا تھا جو مختلف کتابوں میں مل جاتے ہیں۔ ان کا پہلا اعلانیہ 25 اگست 1857 کو شائع ہوا جس کا انگریزی ترجمہ موجود ہے۔ افسوس ہے کہ مورخین نے اسے بہادر شاہ ظفر کے اعلانیہ سے منسوب کر دیا ہے جو غلط ہے۔ اس اعلانیہ میں واضح طور پر لکھا گیا ہے:

''میں جو ابوالمظفر سراج الدین بہادر شاہ کا پوتا ہوں دورہ کرتے ہوئے ہندوستان کے مشرقی

علاقے میں رہنے والے کافروں کو ختم کرنے، اور ان کے آہنی استبدادی نظام حکومت میں کراہتے ہوئے غریب اور لاچار لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے مجاہدین آزادی کی مدد سے محمدی علم بلند کر کے اور راسخ العقیدہ ہندوؤں کو آمادہ کر کے، جو میرے اجداد کی رعایا تھے اور اب انگریزوں کا استیصال کرنے کے لیے، جہادیری جھنڈا بلند کر چکے ہیں، آ گیا ہوں۔"

شہزادہ فیروز کا یہ اعلانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سو سال کے دور حکومت میں، ہندوستان کے باشندوں کی بے بسی، غربت، لاچاری اور استحصال کی کہانی کی تلخیص پیش کرتا ہے۔ اس اعلانیہ کے آغاز ہی میں بتلایا گیا ہے کہ اس دور کے ہندوستان میں، ہندو اور مسلمان دونوں ہی انگریزوں کے مظالم اور فریب سے تباہ تھے۔ اس لیے ہندوستان کے تمام خوشحال گھرانوں سے جنگ آزادی میں مدد کی اپیل کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح عوام کی بہبودی کے لیے دہلی کے شاہی خاندان کے افراد، ہندوستان، ایران، توران اور افغانستان کے مختلف حصوں میں پھیل کر آزادی کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ بہت سے ہندو اور مسلمان حکمران بھی عرصہ سے اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنے مذہب کے تحفظ اور ہندوستان سے انگریزوں کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کر رہے ہیں، اس اعلان میں عوام کو یہ بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ انگریزوں کے پٹھوؤں کے بہکاوے میں آ کر موجودہ معمولی تکالیف سے، جو انقلاب کا لازمی جز ہیں، یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ بادشاہی نظام قائم ہو جانے کے بعد ان کو اسی طرح کی تکلیفوں کا سامنا کرنا ہوگا۔"

اس اعلانیہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ ملک میں رہنے والوں کو درپیش مسائل کو یکے بعد دیگرے پیش کرتا ہے۔

اعلانیہ کا پہلا حصہ انگریزی حکومت کے دور میں زمینداروں پر بھاری جمع لاگو کر کے ان کو کس طرح برباد اور رسوا کیا گیا تھا کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ رعیت کس طرح برباد ہوئی۔ زمینداریاں کیوں اور کس طرح نیلام کی گئیں۔ عدالتوں میں مقدمات کی پیشی کے لیے اسٹامپ ڈیوٹی کا نفاذ اور برسوں تک مقدمات کو لٹکا کر دولوں کو منصوبہ بند طور پر برباد کرنا، اعلانیہ کے خاص پہلو ہیں۔ ان تفصیلات کی وضاحت کے بعد عوام کو یقین دلایا گیا ہے کہ بادشاہی حکومت کے قیام

کے بعد ان تمام خرابیوں کو دور کر دیا جائے گا اور مقدمات کا فیصلہ شرع اور شاستروں کی روشنی میں کیا جائے گا۔

حصہ دوم میں انگریزی حکومت نے کس طرح فریب کے ساتھ تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے تمام اہم سامان تجارت جیسے نیل، کپڑے اور دوسرے قسم کے مال تجارت کی برآمد پر قبضہ کر لیا تھا اور معمولی اشیا کی تجارت عام لوگوں کے لیے چھوڑ دی تھیں اور اس تجارت میں بھی انھوں نے بلاواسطہ اپنا حصہ اسٹامپ فیس، کسٹمز وغیرہ کے ذریعے برقرار رکھا تھا۔ علاوہ ازیں معمولی تاجروں کے منافع پر کئی طرح سے ٹیکس عائد کر دیے گئے تھے جن کی عدم ادائگی پر ان کو سزا دی جاتی تھی۔ اس لیے اس اعلانیہ میں وعدہ دہرایا گیا تھا کہ بادشاہی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ تمام برائیاں دور کر دی جائیں گی اور تاجروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ دامے، درمے، قدمے اور سخنے، ہر طرح سے انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں مدد کریں۔

اعلانیہ کے تیسرے حصے میں سرکاری ملازمین سے براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ انگریزی حکومت میں ہندوستانیوں کو شہری اور فوجی ملازمتوں میں کوئی عزت حاصل نہیں ہے ان کی تنخواہیں کم ہیں اور ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے جبکہ تمام بڑے اور وقار کے عہدوں پر بڑی بڑی تنخواہوں پر صرف انگریزوں کا تقرر ہوتا ہے جب کہ ہندوستانیوں کو معمولی تنخواہ اور ملازمتوں پر مقرر کیا جاتا ہے۔ فوج میں ان کا سب سے بڑا عہدہ صوبہ دار کا ہے جس کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہانہ ہے اور سول سروسز میں بھی ہندوستانیوں کا اعلیٰ ترین عہدہ صدر اعلیٰ تک محدود ہے جس کی ماہانہ تنخواہ پانچ سو روپے ہے۔ نہ ان کا کوئی اثر ہے اور نہ ہی ان کو کوئی جاگیر ملتی ہے۔ اعلانیہ میں وعدہ کیا گیا ہے کہ بادشاہی حکومت میں اعلیٰ عہدوں جیسے کرنل، جنرل اور کمانڈر انچیف وغیرہ پر مقرر کیا جائے گا جو بروقت انگریزوں کے پاس ہیں اور سول سروسز میں وہ کلکٹر، مجسٹریٹ، صدر، جج، گورنر جیسے اہم عہدوں پر بھی فائز کیے جائیں گے جن پر فی الحال یورپی ممالک کے لوگ قابض ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو وزیر، قاضی، سفیر، صوبہ ناظم اور دیوان کے عہدوں پر بھی فائز کیا جائے گا جن پر ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جائیں گی۔

اعلانیہ کا یہ حصہ قابل غور ہے، ہندوستانی خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اگر انگریزوں کی جنگ میں شہید ہوتے ہیں یقینی طور پر جنت میں جائیں گے اور وہ جو انگریزوں کے لیے جنگ کریں گے بلا شبہ دوزخ کا نوالہ بنیں گے۔ اس لیے تمام ہندوستانی جو انگریزوں کی ملازمت میں ہیں اپنے مذہب اور مفاد سے آگاہ ہوں اور ان کی ملازمتوں کو چھوڑ کر بادشاہی حکومت میں شامل ہو جائیں اور فی الحال دو سو سے تین سو روپیہ ماہانہ تنخواہ حاصل کریں اور آئندہ بڑی ملازمتوں کی توقع کریں۔

شہزادہ فیروز شاہ کے اعلانیہ کے چوتھے حصے میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستانی صنعتوں کی بربادی اور دستکاروں کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہے۔ دستکاروں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ انگریزی حکومت کی ملازمت سے الگ ہو جائیں اور مجاہدین کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک ہو جائیں۔ ان کو بادشاہی حکومت اور بادشاہ کے تابعدار ہمنوا راجاؤں اور نوابوں کے دربار میں ملازمت ملے گی جو ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔

اعلانیہ کے آخری حصے میں پنڈتوں اور علما کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے رکھوالے ہیں اور انگریز دونوں مذاہب کے دشمن ہیں اس لیے انگریزوں کے خلاف جاری جنگ آزادی، اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے ہے۔ اس لیے پنڈتوں، علما اور فقیروں کو اس میں میرے ساتھ شریک ہو کر جہاد کرنا چاہیے ورنہ شرع اور شاستروں کے رو سے ان کی ملامت ہوگی۔ اعلانیہ میں یہ بھی وعدہ کیا گیا ہے کہ بادشاہی حکومت کے قیام کے بعد ان کو معافی کی زمینیں دی جائیں گی۔

یہ اعلانیہ اس انتباہ کے بعد ختم ہوتا ہے کہ اگر اس اعلانیہ کی تقسیم کے بعد مندرجہ بالا طبقوں کے لوگ انگریزوں کے ساتھ رہے تو ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں گی اور ان کا مال و متاع لوٹ لیا جائے گا اور ان کو مع ان کے اہل خاندان کے قید کر کے بالآخر موت کی سزا دی جائے گی۔ (36)

حواشی:

1. قیصر التواریخ، جلد دوم، ص 465
2. غدر کے چند علما، دہلی، ص 132
3. یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مورخین نے یہ اعلانیہ بالعموم بہادر شاہ ظفر کے نام منسوب کر دیا ہے جو شہزادہ کے اپنے بیان کے مطابق یہ اعلانیہ خود اس کا تھا، دیکھیے، اطہر عباس رضوی فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش جلد اول، لکھنؤ، 1857، Charles Ball, The History of the Indian Mutiny, Vol. II, pp. 630-632
4. تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ دی ریولٹ ان سنٹرل انڈیا، 1857-59، انٹیلیجنس برانچ، آرمی ہیڈ کوارٹرس، انڈیا، شملہ 1908 صفحات 14 مرولف ایچ تھوربرن شہزادہ فیروز شاہ، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جولائی تا دسمبر 1989, 135-138
5. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص 138
6. دی ریولٹ ان سنٹرل انڈیا، صفحات 49-62، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحات 137-38
7. ریولٹ ان سنٹرل انڈیا، صفحات 49,62,75,81,83، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحہ 138
8. ریولٹ ان سنٹرل انڈیا، صفحات 75-83، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص 137
9. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحات 139-41
10. ایضاً، ص 139
11. جی۔ بی۔ مالیسن، اے ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی (1868) بحوالہ بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ
12. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص ص 140-141
13. ایضاً، صفحہ 140
14. ایضاً
15. ایضاً
16. ایضاً، صفحہ 141
17. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، ص 141
18. رضوی فریڈم اسٹرگل، جلد اول، صفحات 459-60
19. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، صفحات 143-45
20. تاریخ احمدی، مرتبہ ابرار حسن فاروقی، لکھنؤ 1925، ص 114، فضل حق خیر آبادی، الثورۃ الہندیہ، ص 410
21. رضوی فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، صفحات 399-40
22. ایضاً، ص 400
23. ایضاً، ص 400
24. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جنوری۔جون 1989، ص 145-46
25. رضوی فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، ص 656
26. رضوی فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، ص 516
27. فارن پولیٹیکل کنسلٹیشن، 15 جولائی 1859، نمبر 261-64، نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی

28. رضوی فریڈم اسٹرگل، جلد دوم ،ص656
29. بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جنوری۔ جون 1970 ،ص43
30. ایضاً ،ص44
31. رضوی فریڈم اسٹرگل۔ ۔ جلد سوم ،ص669
32 فارسٹ ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی، جلد سوم ،ص602
33 بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جنوری۔ جون 1970 ،صفحات 44-45
34 ایضاً ،صفحہ 46
35 اعلامیہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ چارلس بال، دی ہسٹری آف انڈین میوٹنی، جلد دوم صفحات 632-630
36 فریڈم اسٹرگل ان یو پی۔ جلد اول ،صفحات 486-453

اقبال حسین

جنرل بخت خاں

1857 کی پہلی جنگ آزادی میں بہت سے افراد نے نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ ان میں جنرل بخت خاں اپنے کردار، ہمت، شجاعت اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے دہلی اور اودھ میں انگریزوں کے خلاف سخت محاربہ آرائی کی تھی جس کی ستائش ان کے حریفوں نے بھی کی لیکن ہمارے درس کی کتابوں میں ان کا ذکر شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔[1]

بخت خاں کون تھے، آپ کا تعلق کس خاندان سے تھا؟ انگریز مورخین اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ اردو میں مورخین نے ان کا تعلق روہیلہ افغانوں سے بتلایا ہے لیکن ان کے خاندانی حالات کی کوئی زیادہ تفصیل نہیں فراہم کرتے۔[2] فریڈرک کوپر، ایک انگریز فوجی افسر جس نے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کو کچلنے میں حصہ لیا تھا لکھتا ہے کہ بخت خاں کے آبا و اجداد ہندو تھے۔[3] برخلاف اس کے جیون لال، ایک برطانوی جاسوس لکھتا ہے کہ بخت خاں خود کو مغل نسل کا بتلاتے تھے۔[4] خواجہ حسن نظامی تحریر فرماتے ہیں کہ بخت خاں کی قرابت داری نوابین اودھ سے تھی۔ وہ اپنی والدہ کی طرف سے نواب اودھ سے رشتہ رکھتے تھے اور والد کی طرف سے غلام قادر روہیلہ سے۔[5] جنابہ سیدہ فاطمہ اردو میں بخت خاں کے خاندان پر زیادہ معلومات فراہم کرتی ہیں۔ وہ چندا بیگم، جو نواب دوندے خاں روہیلہ کی پوتی تھیں، کے حوالہ سے لکھتی ہے کہ بخت خاں، غلام قادر خاں روہیلہ کے بہت قریبی رشتہ دار تھے۔ چندا بیگم کے مطابق بخت خاں

عبداللہ خاں کے فرزند تھے جن کی شادی اودھ کی ایک شہزادی سے ہوئی تھی۔[6] یہ دعویٰ کہ بخت خاں روہیلہ افغان تھے، نواب نجیب الدولہ کے شجرۂ نسب سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ نجیب الدولہ کے شجرہ نسب میں عبداللہ خاں کو سلطان خاں برادر نجیب خاں کا فرزند لکھا گیا ہے۔ غلام قادر خاں، ضابطہ خاں پسر نجیب الدولہ کے فرزند تھے۔ بخت خاں روہیلہ افغان تھے۔ یہ کافی دل چسپ ہے کیونکہ روہیلے عموماً 1774 کی جنگ میں انگریزوں اور نواب شجاع الدولہ کی سازشوں اور ان کی مشترکہ کارروائی میں اپنا اقتدار کھودینے سے سخت ناراض تھے۔[7]

ہمیں بخت خاں کی ابتدائی زندگی کے حالات کے متعلق کم معلومات ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1817 میں آپ نے بنگال آرمی کے توپ خانہ سے ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ وہ توپ خانہ میں تقریباً چالیس برس تک کام کرتے رہے۔[8] انھوں نے پہلی اینگلو افغان جنگ میں حصہ لیا تھا۔[9] ترقی دے کر انھیں صوبیدار کے عہدہ پر بریلی کی فوجی چھاؤنی پر بھیج دیا گیا۔[10]

ایک انگریز فوجی افسران کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ ایک لمبے اور موٹے آدمی تھے۔ یورپی سوسائٹی پسند کرتے تھے، اور بہت ذہین تھے۔[11] بخت خاں بھی انگریزی فوج میں دوران ملازمت تجربات اور ان کے متعلق معلومات پر فخر کرتے تھے۔ 1857 میں جب پہلی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی تو آپ بریلی کنٹونمنٹ میں توپ خانے کے صوبیدار تھے۔[12] اپنی طویل اور وفادار خدمات کی وجہ سے بنیادی طور پر ان کی وفاداری، ابتدا میں انگریزوں کے ساتھ تھی اور انہوں نے باغی سپاہیوں کا ساتھ دینے میں تامل کیا تھا۔ لیکن ان کے پیر مولوی سرفراز علی نے مئی 1857 کے آخر میں انھیں قائل کر کے بغاوت پر آمادہ کرلیا۔[13] جلد ہی بخت خاں بریلی کی باغی فوج اور عوام کے رہنما بن گئے۔ اس وقت تک خان بہادر خاں جو حافظ رحمت خاں روہیلہ کے پوتے تھے بغاوت میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ وہ انگریزی حکومت کے پنشن یافتہ اور وفادار تھے۔ یکم جون کو بریلی کے سرکردہ شہریوں کی قیادت کرتے ہوئے بخت خاں، خان بہادر خاں کے پاس پہنچے اور کافی بحث ومباحثہ کے بعد ان کو قیادت کے لیے آمادہ کرلیا۔[14] خان بہادر خاں نے بخت خاں کو بریگیڈیر جنرل مقرر کیا۔ 11 جون 1857 کو غالباً بہادر شاہ ظفر کی ایما پر انھیں دہلی

جانے کا حکم دیا گیا۔

دہلی اس وقت بنگال آرمی کے باغی فوجیوں کا مرکز بنا ہوا تھا جہاں روزانہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرٹھ سے آئے باغی ہندوستانی فوجیوں نے پہلے ہی تذبذب کے شکار بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے تخت نشین کر دیا تھا۔[15]

11 مئی سے یکم جولائی 1857 تک دہلی لاقانونیت کا شکار رہی۔ کچھ باغی فوجیوں نے جن کے پاس معاش کی کوئی صورت نہ تھی عام آدمیوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ بعض شہزادے بھی دہلی کے امیر طبقہ لوگوں اور مہاجنوں کی لوٹ مار میں حصہ دار تھے۔[16] بہادر شاہ ایک غمزدہ خاموش تماشائی تھے۔ انھیں یہ بھی خوف تھا کہ انھیں اقتدار سے برطرف کیا جا سکتا تھا کیونکہ فوجیوں کے دو گروپ الگ الگ شاہزادہ مرزا مغل اور شہزادہ ابوبکر کی مدد کر رہے تھے اور کوشاں تھے ان میں سے کسی ایک کو تخت نشین کر دیا جائے۔[17] بہادر شاہ کی کوششیں کہ شہزادوں کے ذریعہ دہلی میں امن و امان قائم ہو جائے، ناکام ہو چکی تھیں۔[18] ان حالات میں بخت خاں کی دہلی میں آمد بہادر شاہ کے لیے خوش آئند تھی۔ 2 جولائی 1857 کو جب بخت خاں دہلی پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے ان کو خوش آمدید کہا گیا۔ بے بس بادشاہ نے بخت خاں کی آمد کو بقیہ دو فوجی ٹکڑیوں کے مقابلے میں جن کی وفاداری مرزا مغل اور مرزا ابوبکر کے لیے تھی، زیادہ مفید اور کارآمد سمجھا تا کہ ان پر لگام لگ سکے۔[19] بخت خاں کو روز اول سے ہی بڑے اعزاز و مراتب سے نوازا گیا۔ ان کو دہلی میں موجود باغی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا اور صاحب عالم کے خطاب سے نوازا گیا۔[20] یہ ممکن ہے کہ اس خبر سے کہ بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ چار لاکھ روپیوں کا خزانہ بھی لائے ہیں، ان کے خیر مقدم میں جوش کا اظہار کیا گیا۔ تاہم بخت خاں کی پہلی ملاقات بادشاہ سے یادگار تھی۔

مورخ پرسیول اسپیر لکھتا ہے:

"جب وہ (بخت خاں) دیوان خاص میں تخت شاہی کے قریب آیا تو سلام کیا جیسے وہ برابر کا ہو اور کمر سے تلوار نکال کر بادشاہ کو پیش کی۔ اس غیر مہذبانہ طرز عمل سے بادشاہ کبیدہ ہوئے لیکن انھوں نے اس کی فوج کی تعریف کی۔ رسالدار محمد شفیع اور مولوی امداد علی نے کہا: "جہاں پناہ

کو ایسے سردار کو تلوار اور ڈھال پیش کرنی چاہیے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس طرح کا اعزاز ایسے سردار کے لیے مناسب ہے پہلے بادشاہ نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ یہ اشیا تیار نہیں ہیں لیکن بخت اصرار پر اسلحہ خانہ سے طلب کر کے بخت خاں کو عنایت کیں۔ اس کے بعد بھی اس نے بادشاہ کو کوئی نذر نہیں پیش کی۔ اس نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ آپ نے شہزادوں کو فوج میں حاکمانہ اختیار بخشے ہیں۔ یہ اچھا نہیں ہے۔ مجھے اختیار دیجیے اور میں انتظامات کروں گا۔ یہ لوگ انگریز حاکموں کے طور طریقوں کو کیا جانیں! بادشاہ نے جواب دیا: "شہزادوں کو فوج کے افسران کی درخواست پر مقرر کیا گیا تھا۔" اس کے بعد بخت خاں کو رخصت دے دی گئی۔[21]

صرف بخت خاں اور ان کی فوج کی موجودگی دہلی میں امن اور شہزادوں کے اچھے رویہ کی ضمانت نہیں تھی۔ یہ ضروری تھا کہ بخت خاں کو کافی اختیار دیے جائیں۔[22] بخت خاں کی تقرری کی صادق الاخبار خیر مقدم کرتے ہوئے اپنی 6 جولائی 1857 کی اشاعت میں لکھتا ہے:

" آسائش رعایا ہند منظور خدا ہے اس لیے منتظم دوراں جناب محمد بخت خاں بہادر جنرل کو کہ عدالت، مدبری و انتظام میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہمارا حاکم شفیق بنایا ہے اور جناب موصوف نے حضور سے خلعت فاخرہ سپر و شمشیر پائی ہے شہر کا انتظام بخوبی کر دیا۔"

تاہم بہادر شاہ دہلی کے عوام کے متعلق کس حد تک متفکر تھے اس کا اندازہ 12 جولائی 1857 میں اخبار اردو اخبار کی خبر سے کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے بخت خاں کو شہر کا انتظام درست کرنے کی ہدایت دی تھی اور حکم دیا تھا کہ وہ پہاڑی پر قابض دشمنوں کے مورچوں کو تباہ کر کے انھیں بھگا دیں، قلعہ میں زبردستی گھس آنے والے فوجیوں کو باہر نکال دیں اور ان کو تاکید کریں کہ وہ لوٹ مار کر عوام کو تکلیف نہ پہنچائیں، قدیم و جدید ملازمین کی تنخواہوں کا انتظام کریں لگان کی تحصیل اور تھانوں کا انتظام فوج کے ذریعہ کریں۔ تلنگوں کا بھیس بدل کر شہر کے لفنگوں کو معقول سزا دیں اور عوام و شرفا کو لوٹ مار سے بچائیں۔

بخت کو اس کا علم تھا کہ شہر میں بدامنی کے پس پشت شہزادے بھی شریک ہیں۔ تاہم انھیں اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کو کس حد تک ان لوگوں کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بہر حال وہ ان حالات سے مقابلہ کرنے کے بیے اور اپنی نئی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے پُر اعتماد تھے۔[22] لیکن شہزادوں اور ان کے مددگار باغی فوجیوں کے منفی رویہ کی وجہ سے بخت خاں نے 5 یا 6 جولائی 1857 کو بادشاہ کو آمادہ کر کے یہ حکم تمام افسران فوج کے نام جاری کرا دیا کہ وہ نہ مرزا مغل اور نہ ہی بخت خاں کے احکام کی تعمیل کریں۔ بہر حال انتظامیہ کو بخوبی چلانے کے لیے فوجیوں اور شاید بخت خاں کی تحریک پر کورٹ آف ایڈمنسٹریشن، جو دس ممبران پر مشتمل تھی، قائم کی گئی۔[24] کورٹ میں چار ممبران کی تقرری بادشاہ کے ہاتھ میں تھی اور باقی چھ ممبران کا تقرر فوج کو کرنا تھا۔ بظاہر کورٹ آف ایڈمنسٹریشن کا قیام ان لوگوں کا کارنامہ تھا جو انگریزی فوج کے انتظامیہ اور قاعدہ قانون سے بخوبی آگاہ تھے۔ کورٹ آف ایڈمنسٹریشن کے مسودہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں نمائندگی ہندو اور مسلمانوں کی بنیاد پر تجویز کی گئی تھی اور بعد میں اسے قلم زد کر دیا گیا اور فوج کی نمائندگی کے لیے دو دو ممبران، پیدل، گھڑ سوار اور توپ خانہ فوج سے مقرر ہونے تھے۔ کورٹ میں اعلیٰ اختیارات بادشاہ کو دیے گئے تھے لیکن یہ برائے نام تھے۔ کورٹ کی ساخت نہ بالکل مغربی تھی اور نہ ہی ہندوستانی۔[25] کورٹ آف ایڈمنسٹریشن کو منظور شدہ بارہ دفعات کے تحت کام کرنا تھا۔ کورٹ کے لیے ایک صدر جلسہ یعنی پریسیڈنٹ اور نائب صدر جلسہ کی تجویز تھی۔ صدر جلسہ کو دو ووٹ دینے کا اختیار تھا اور اسے دوسرے ممبران معہ نائب صدر پر برتری حاصل تھی۔ کورٹ کو دو طرح کے اجلاس کرنے تھے یعنی معمول کے مطابق لال قلعہ کے اندر روزانہ چار گھنٹے تک اور خاص اجلاس کسی بھی وقت جیسا کہ حالات کا تقاضہ ہو۔ بخت خاں کو کورٹ کے ہر اجلاس میں موجود رہنے کا حق تھا، پریسیڈنٹ یا صدر جلسہ خود بادشاہ سلامت تھے۔ کسی معاملہ میں برابر برابر ووٹ پڑنے کی صورت میں صدر جلسہ کی رائے فیصلہ کن تھی اس کے لیے علاحدہ کمیٹیاں بنائی گئی تھیں۔ ہر کمیٹی میں ایک سکریٹری کا تقرر ہونا تھا جو کورٹ کے تحت ہر رجمنٹ کے لیے ہوتا۔ اس دل چسپ قانون کے باوجود کورٹ آف ایڈمنسٹریشن بیچ اور بریلی فوج کے آپسی اختلافات کی وجہ سے بے اثر رہا گو کہ ابتدا میں سب کو اور خود بادشاہ کو اس سے بہت توقعات تھیں۔[26]

بخت خاں نے دلی کے انتظامیہ کو زیادہ فعال بنانے کے لیے شہر کوتوال پر پوری ذمہ

ڈال دی تھی اور یہ واضح کردیا کہ بدامنی اور لاقانونیت کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور کوتاہی و لاپروائی کرنے پر سخت سزا دی جائے گی۔[27]

دہلی میں بغاوت کی ابتدا کے بعد تجارت اور کاروبار پر برا اثر پڑا تھا۔ لوٹ مار میں ملوث شہزادوں اور فوجیوں نے دوکانداروں اور مہاجنوں کی ہمت پست کردی تھی۔ وہ اپنی دوکانیں بند کرکے گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ ان کے خوف کو دور کرنے کے لیے بخت خاں نے بذریعہ منادی اعلان کرادیا کہ وے ہتھیار رکھ سکتے تھے اور جن کو ہتھیاروں کی ضرورت ہو وہ فوج کے صدر مقام سے حاصل کرلیں۔ چوری اور لوٹ مار میں پکڑے گئے فوجیوں کے خلاف سخت سزا مقرر کی گئی جس میں ہاتھ کاٹنے کی تجویز بھی تھی۔[28]

1857 کی جنگ آزادی کی ابتدا نے جاگیرداروں، پنشن یافتوں اور مدد معاش پانے والوں کو وسوسوں میں ڈال دیا تھا ان میں سے چند در پردہ انگریزی حکومت سے ہمدردی اور وفاداری کا نہ صرف اظہار کرنے لگے تھے بلکہ ان کے لیے خبر رسانی بھی کرنے لگے تھے۔ صورت حال کے پیش نظر بخت خاں نے حکم جاری کرکے ان کے شک و شبہات دور کیے اور ان کو اطمینان دلایا کہ بعد فتح یابی بہ صورت ثبوت اور معائنہ دستاویزات سابقہ دحال جو کہ جس کا مقرر تھا بدستور جاری ہوگا اور بہ سبب بدعملی کے جتنے روزوں کا بند رہا وہ بھی ان کو دیا جائے گا۔ حکم نامہ میں یہ تاکید کی گئی تھی کہ حکم موصول ہونے کے بعد اگر کوئی شخص کسی طرح کی خبر رسانی یا رسد رسانی کرے گا تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔ حکم نامہ کے ذریعہ بخت خاں نے کوتوال شہر کو ہدایت دی تھی کہ وہ اپنے علاقہ کے جاگیرداروں، معافی داروں اور پنشنداروں کو اس کی اطلاع دے کر رسید حاصل کریں۔[29]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں دہلی میں آمد اور اپنی تقرری کے بعد ہی اس طرح کے انتظامی امور میں مصروف ہوگئے تھے۔ 2 جولائی 1857 کو تقریباً رات کے آٹھ بجے وہ لال قلعہ میں غالباً طلبی پر بہادر شاہ سے ملے۔ دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تفصیلات نہیں ملتیں تاہم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بادشاہ سے شہزادوں کو فوجی ذمہ داریوں سے سبکدوش کردینے کی درخواست کی تھی۔[30] جیسا

کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ بخت خاں کی اچانک آمد اور اقتدار نے شہزادوں کو رشک وحسد میں مبتلا کر دیا ہو۔ چنانچہ روایتی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ بخت خاں کو مطعون اور بدنام کیا جائے۔ بادشاہ کے جعلی دستخط سے ایک خط جاری کیا گیا جس میں بخت خاں پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ بہادر شاہ کے علم میں یہ بات لائی گئی تو انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔[31] بہر حال دہلی والے بخت خاں کی اصلاحی کاوشوں سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔[32]

گو کہ بخت خاں کی طاقت ان کی اپنی فوج اور توپ خانہ تھا لیکن ان کو مولوی سرفراز علی کی سرگرمیوں سے جہادیوں کی بھی مدد حاصل تھی جو ان کے ساتھ دہلی آئے تھے۔ بتدریج جہادیوں کی تعداد بھی دہلی میں بڑھتی گئی کیونکہ علما مستقل طور پر مسلمانوں کو جہاد کا درس دے رہے تھے تاکہ انگریزوں کے خلاف لوگوں کو اکسا کر انھیں دہلی ہی نہیں بلکہ ملک سے باہر کر دیا جائے۔ دہلی میں بخت خاں جہادیوں کے قائد بن گئے۔ جہادیوں کو بعض ہم عصر مورخین نے وہابی بھی لکھا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر سید احمد بریلوی کے پیرو تھے۔ اردو تاریخ نگار ذکاءاللہ دہلوی ان کو تحقیرانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بخت خان کی آمد کے بعد انگریزوں کے خلاف جہاد کی آواز تیز تر ہو گئی تھی۔[33] بہت سے جہادی ہانسی، حصار، جے پور، نصیر آباد، ٹونک اور بھوپال سے آئے تھے۔ ہانسی، حصار، ٹونک اور بھوپال میں روہیلہ افغانوں کی بڑی آبادیاں تھیں جو مولوی سرفراز علی، عبدالغفور، امام خاں، رسالدار اور غوث محمد خاں کے اثر میں تھے۔ جہادیوں کی بڑی تعداد جولاہوں، دستکاروں اور کسانوں پر مشتمل تھی جو انگریزی حکومت کی معاشی پالیسی کی وجہ سے بیکاری اور غربت کے شکار تھے۔ ان کی غربت اور بدحالی کا اندازہ ذکاءاللہ کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے کہ نہ تو ان کے پاس کپڑے تھے اور نہ ہی کھانے کو کچھ تھا۔ یہ لوگ دہلی کے باحیثیت افراد کی خیرات پر گذارہ کر رہے تھے۔[34]

ہر چند کہ بخت خاں کو مالی معاملات میں مکمل اختیار حاصل تھے لیکن دھوکہ دھڑی اور ریشہ دوانیوں کے ذریعہ ان کے اختیارات کو شرارتی عناصر نظر انداز کر رہے تھے۔ 12 جولائی 1857 کو بغیر بخت خاں کے علم و اجازت کے شکر کی درآمد پر فی من آٹھ آنے ٹیکس نافذ کر دیا

گیا۔ علم ہوتے ہی بخت خاں نے ٹیکس کو واپس لے لیا کیونکہ اس سے شہر میں شکر کی آمد متاثر ہو رہی تھی جو شہریوں اور فوجیوں کی پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔[35] بخت خاں نے نمک پر محصول بھی معاف کر دیا کیونکہ یہ عام لوگوں کی ضرورت کی چیز تھی۔ ان اقدامات نے بخت خاں کو ہر دلعزیز بنا دیا جیسا کہ ایک مثنوی مطبوعہ صادق الاخبار، مورخہ 27 جولائی 1857 سے معلوم ہوتا ہے۔

اندرونی مسائل سے دوچار بخت خاں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ انگریزوں کا پہاڑی پر سے قبضہ ہٹانا اور ان کو بھگانے کا تھا جو بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنا قدم جما چکے تھے۔ بخت خاں نے انگریزوں کی رسد بند کرنے کے لیے نگرانی تیز تر کر دی اور ان کے ایک رسد و سامان کے قافلہ کو پکڑ لیا۔[36]

9 جولائی 1857 کو بخت خاں نے انگریزوں کے مورچوں پر حملہ کر کے تیس ہزاری پر قبضہ کر لیا۔[37] بدقسمتی سے یہ فتح، جو باغی فوجیوں کے آنے کے بعد پہلی تھی، نیمچ اور میرٹھ سے آنے والے فوجیوں کے لیے سخت حسد کا باعث بن گئی۔[38] شاہزادوں کا رویہ پہلے ہی بخت خاں سے نادوستانہ تھا۔ بخت خاں نے فوجیوں سے مفاہمت کی کوششیں کیں۔ بخت خاں کی سفارش پر بہادر شاہ نے زخمی سپاہیوں کے لیے پنشن کا اعلان اور ان کی پرورش کے لیے زمین دینے کا اعلان کیا۔[39]

بخت خاں کے خلاف شہزادگان کی ناخوشی بڑھتی رہی۔[40] مرزا مغل، بخت خاں کے جاری کردہ احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے اور ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتے رہے اور یہ صلاح دی کہ بخت خاں کو فوج کی اعلیٰ کمان سے برطرف کر دیا جائے۔[41] بہادر شاہ دربار کی سازشوں سے آگاہ تھے۔ انھوں نے بخت خاں پر مزید توجہ دی، مراعات، انعامات و اکرام سے نوازا اور ان کی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار کیا۔[42]

تیس ہزاری کی جنگ میں بخت خاں کی کامیابی فیصلہ کن نہیں تھی۔ انگریزوں کے قدم اب بھی سبزی منڈی، علی پور اور مبارک باغ میں جمے ہوئے تھے۔ بخت خاں کو دشمنوں سے یہ علاقے جلد تر خالی کرانے تھے مگر اس کام کے لیے اس کی اپنی فوجی طاقت کم تھی۔ موجود فوجی دستوں میں نیمچ سے آنے والی فوج کی بہادری کی شہرت تھی لیکن ان کے سپہ سالار سدھاری سنگھ اور

غوث خاں نے خود کو نہ صرف بخت خاں سے دور رکھا بلکہ یہ الزام لگایا کہ ان کی انگریزوں سے دوستی ہے۔ آپسی پھوٹ نے انگریزوں کے خلاف مشترکہ اقدام سے باز رکھا جو انگریزوں کے لیے نعمت ثابت ہوئی۔[43] بہادر شاہ نے ان کے رشتے بحال کرنے اور انگریزوں کے خلاف اتحاد قائم کرنے کی غرض سے مداخلت کی اور سدھاری سنگھ اور بخت خاں کے درمیان میل ملاپ کرادیا۔[44] لیکن یہ ملاپ ظاہری رہا۔ سدھاری سنگھ اور غوث خاں کی مخالفت کا ایک سبب غالباً یہ بھی تھا کہ آخر الذکر پہلے میں ان کا ساتھی اور ہم رتبہ تھا لیکن دہلی میں اس کی حیثیت بہت بلند ہوگئی تھی۔

دہلی کے انتظامیہ کو پرامن رکھنے کے لیے بخت خاں کو ایک بڑے چیلنج کا سامنا بقر عید کے موقعہ پر کرنا پڑا تھا۔ باغی فوج میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دہلی کے لیے عبوری قانون بنا جس کے بانی مولوی فضل حق خیر آبادی تھے۔ اس عبوری قانون کی پہلی دفعہ یہ تھی کہ بادشاہ کی حکومت کے کسی حصہ میں گائے کا ذبیحہ نہیں کیا جائے۔ جیون لال لکھتا ہے کہ (28 جولائی 1857) کو بادشاہ نے حکم دیا کہ جنرل (بخت خاں) اور فوج کے افسروں کے پاس حکم بھیجا جائے کہ عید کے موقعہ پر کوئی گائے ذبح نہ کی جائے اور لوگوں کو متنبہ کردیا جائے کہ اگر کسی مسلمان نے ایسا کیا تو اسے توپ کے منہ سے اڑادیا جائے گا اور کسی مسلمان نے گائے ذبح کرنے کے لیے کسی کی حوصلہ افزائی کی تو اسے بھی مار ڈالا جائے گا۔ حکیم احسن اللہ خاں نے اس حکم پر غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ مولویوں سے صلاح مشورہ کرے گا۔ بادشاہ اس مخالفت سے سخت ناخوش ہوئے اور دربار برخاست کردیا۔[45] مسز الڈویل نے بہادر شاہ کے مقدمہ میں گواہی دیتے ہوئے تصدیق کی تھی بغاوت کے درمیان دہلی میں گائے کا ذبیحہ نہیں ہوا۔ ذکاء اللہ نے بھی اس کی تائید دوسرے انداز میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ کا پہلا حکم 9 جولائی کو بذریعہ منادی مشتہر کیا گیا تھا کہ گائے کا ذبیحہ کرنے والے کو توپ دم کردیا جائے گا۔ بقر عید کے زمانہ میں بھی یہ حکم نافذ رہا۔ ذکاء اللہ طنزیہ لکھتے ہیں کہ بادشاہ تو بے بس تھا۔ اگر اسے اختیار ہوتا تو وہ ہندو راجاؤں کی طرح ایسا حکم دیتا لیکن وہ تلنگوں کے ہاتھوں مجبور تھا جو اس نے اپنی خواہش اور مذہب کے خلاف یہ حکم دیا۔[46] ذکاء اللہ نے جو بڑے مورخ اور انگریزوں کے معاون تھے، مغل بادشاہ اور اس کے جانشینوں کی صلح کل

پالیسی نظر انداز یا تو عمداً کی ہے یا شرارتاً۔ بہرحال بہادر شاہ کے احکام کی تعمیل میں بخت خاں نے پوری مستعدی سے کام کیا۔ اس سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اس حکم کے خلاف انگریزی جاسوسوں اور انگریزی حکومت کے بہی خواہوں نے مسلمانوں کو مذہب کے نام پر ضرور بھڑکایا ہوگا۔ کچھ مولوی صاحبان بھی پابندی قربانی گاؤ پر خوش نہیں ہوئے ہوں گے۔ تاہم یہ بات قابل قدر ہے کہ دہلی کی مسلم آبادی بادشاہ اور بخت خاں کے حکم کی پابند رہی۔ بادشاہ اور بخت خاں کی جہاں مکمل ذبیحہ گاؤ پر پابندی چاہتے تھے وہیں وہ یہ بھی ضروری سمجھتے تھے کہ کوئی کسی کو غلط طور پر ذبیحہ کے نام پر ملوث کر کے سزا نہ دلا دے۔ اس کے تدارک کے لیے بخت خاں نے 28 جولائی 1857 کو حکم نامہ جاری کیا:

> ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم فوج کے بڑے سردار کا۔ جو کوئی اس موسم بقر عید میں یا اس کے آگے پیچھے گائے یا بیل یا بچھڑا یا بچھڑی یا بھینس یا بھینسا لاکر یا چھپا کر اپنے گھر میں ذبح اور قربانی کرے گا وہ آدمی حضور جہاں پناہ کا دشمن سمجھا جائے گا اور اس کو موت کی سزا ہوگی اور جو کوئی کسی پر اس بات کی تہمت اور جھوٹا الزام لگائے گا تو حضور سے جانچ ہوگی، یعنی اگر تہمت کا جرم ثابت ہوگا تو اس کی سزا ہوگی نہیں تو جس کے اوپر تہمت لگائی گئی ہوگی اس کو سزا ملے گی اور اس میں جس کا جرم اور قصور ثابت ہوگا وہ بے شک توپ سے باندھ کر اڑا دیا جائے گا۔(47)

اس حکم کو بذریعہ منادی شہر کے گلی کوچوں میں عوام تک پہنچایا گیا۔ بہادر شاہ غالباً اس حکم سے پوری طرح مطمئن نہ تھے اور انھیں خدشہ تھا کہ شرپسند عناصر ذبیحہ کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکالیں گے۔ ذبیحہ گاؤ پر کامل پابندی عائد کرنے کے خیال سے 29 جولائی 1857 کو شہر کوتوال مبارک خاں کے نام انھوں نے فرمان جاری کیا جو فارسی میں ہے۔ اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

> ''شجاعت نشان مبارک شاہ خاں کوتوال شہر کو معلوم ہو۔ چونکہ کل تم نے شاہی شقہ کے ملتے ہی پورے شہر میں منادی کرا دی اور گائے کے ذبیحہ اور گائے کی قربانی پر مکمل پابندی عائد کر دی ہے اس لیے اب تم کو لکھا جاتا ہے کہ شہر کے دروازوں پر اس طرح کا انتظام کرو کہ کوئی بھی گائے کا تاجر آج سے بقر عید کے تین دن تک شہر میں گائے یا بھینس فروخت کرنے کے لیے نہ لا سکے اور جن مسلمانوں کے گھروں میں گائیں پلی

> ہیں انھیں لے کر کوتوالی میں بند حوا دیا جائے اور گایوں کی تعداد پر نگاہ رکھی جائے۔ اگر کوئی خفیہ یا اعلانیہ طور پر گایوں کی قربانی کرے گا تو اس کی پاداش میں وہ ہلاک کر دیا جائے گا۔ عیدالضحیٰ کے موقع پر ذبیحہ گاؤ کے متعلق ایسا انتظام کر دیا جائے کہ شہر میں فروخت کے لیے گائے ہی نہ آ سکے اور پلی ہوئی گایوں کی قربانی بھی نہ کی جاسکے۔ اس سلسلے میں جو بھی کوشش کی جائے گی وہ ہماری خوشنودی کا باعث ہوگی۔(48)

چونکہ شہر کی تمام گایوں کو کوتوالی میں رکھنے کی جگہ نہ تھی، شہر کوتوال کے مشورہ پر مسلمانوں کے گھروں میں پلی ہوئی گایوں کی شماری ہوئی۔ بخت خاں کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ اگر کسی کے یہاں گائے کم پائی گئی اور اس کی کی معقول توضیح نہ کی جاسکی تو سخت سزا دی جائے گی۔[49]

بادشاہ کے احکام کی کامیاب طور پر تعمیل بخت خاں نے کرائی اور انگریزوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ ذبیحہ گاؤ کے مسئلہ پر دہلی میں ہندو مسلم فسادات ہوں گے۔[50] بہر حال بقرعید پرامن طریقہ پر ہوئی اور شہر میں امن وامان قائم رہا جس کے لیے بخت خاں اور ان کے معاونین ستائش کے مستحق ہیں۔

بظاہر شہر میں امن وامان رہا لیکن فوج دو دھڑوں میں منقسم رہی۔ بہادر شاہ نے صلح مصالحت ضرور کرا دی تھی لیکن یہ صلح دکھاوے کی ثابت ہوئی۔ بخت خاں اور سدھاری سنگھ کے اختلافات 5 اگست 1857 کو کھل کر سامنے آ گئے، جب وہ علی پور، پہاڑی اور مقامی پل پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔[51] سدھاری سنگھ، مرزا مغل کے زیر اثر تھے اور یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے اس مہم میں صرف دکھاوے کی جنگ کی تھی اور بخت خاں کی کوئی مدد نہیں کی۔ برخلاف اس کے سدھاری سنگھ نے پرزور طریقہ پر شکایت کی کہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی وجہ سے بخت خاں نے کوئی مدد نہیں کی۔ بہادر شاہ پھر درمیان میں پڑے اور دونوں کے درمیان مصالحت کرا دی۔[52] ان حالات میں بخت خاں کے لیے تنہا انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں تھی۔ 7 اگست کو ان کا انگریزوں کے مورچوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ شدید بارش کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ اس تاخیر سے بہادر شاہ ظفر خوش نہیں ہوئے۔[53] بخت خاں کے مخالفین کو ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کا موقع بھی فراہم ہو گیا۔

بخت خاں دن بہ دن سازشوں اور مشکلات کے جال میں گھرتے جا رہے تھے۔ مچ فوج کے جنرلوں سے اختلافات اور مالی مشکلات نے انھیں پریشان کر دیا تھا۔ غالباً ان کی تحریک پر کہ کم از کم مالی مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ بہادر شاہ نے قرب و جوار کے رؤسا اور زمینداروں سے روپیوں سے مدد کرنے کی اپیل جاری کی[54] لیکن ان کا رویہ امید افزا نہیں رہا۔ دہلی کے مہاجنوں سے ہی انھیں روپے مل رہے تھے لیکن وہ بھی کتنا اور کس حد تک روپے قرض دیتے۔ مزید برآں وہ شاہزادوں کے رویہ سے پہلے ہی دل برداشتہ تھے اور ان کو یہ بھی توقع نہیں تھی کہ ان کو ان کے روپے واپس مل جائیں گے۔ فوج میں گروہ بندی اور بخت خاں کے خلاف سازشوں سے انتظامیہ بکھر رہا تھا۔ بخت خاں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ مرزا خضر اور دوسرے شاہزادے مہاجنوں سے اس بہانہ سے زر وصول کر رہے ہیں کہ فوجیوں کو تنخواہیں دی جائیں گی لیکن فوجیوں کو کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔ شکایت کا اثر یہ ہوا کہ بادشاہ کے حکم سے مرزا خضر کو مجبور کیا گیا کہ وہ مہاجنوں سے حاصل کردہ روپے شاہی خزانہ میں جمع کر دیں اور یہ حکم بھی جاری کیا کہ آئندہ مہاجنان بخت خاں کے ذریعہ لین دین کریں۔[55] لیکن جب بخت خاں نے مہاجنوں سے روپے طلب کیے تو ناکامی ملی۔ مجبوراً بخت خاں نے دیوی سنگھ اور سالک رام، دو بڑے مہاجنوں کو مجبور کر کے چھ ہزار روپے حاصل کیے۔[56]

بخت خاں کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ 20 اگست 1857 کو تلیار خاں اور انگریزوں کے جاسوس گوری شنکر نے ایک سکھ کو بادشاہ کے سامنے بطور گواہ یہ کہہ کر پیش کیا کہ بخت خاں انگریزوں سے ملا ہوا ہے اور ان سے ساز باز کر رہا ہے۔ گوری شنکر کا تعلق مچ فوج سے تھا۔ بہادر شاہ نے اس سکھ گواہ سے خود جرح کی اور اسے جھوٹا اور دشمنوں کا ایجنٹ پایا۔ بخت خاں نے اپنے خلاف عائد کردہ الزامات کی تردید کے لیے فوج کے تمام افسروں اور مرزا مغل کے سامنے 23 اگست کو بیان دیا۔[57]

دریں اثنا 21 اگست کو مرزا مغل نے بھی انگریزوں کے خلاف متحدہ فوج کے ساتھ جنگ کا منصوبہ بنایا تھا جو عمل میں نہ آ سکا۔ مرزا مغل نے بخت خاں پر اس ناکامی کا الزام لگا کر

کوشش کی کہ ان کا داخلہ محل میں ممنوع کر دیا جائے اور ان کی بریلی فوج سے ہتھیار جمع کرا لیے جائیں۔ ایسے اقدامات خود بادشاہ کے لیے خطرات سے پُر تھے کیونکہ مرزا مغل کی طاقت نیمچ کی فوج کی مدد سے بڑھتی جا رہی تھی۔[58]

24 اگست 1857 کو بخت خاں اور نیمچ کی فوجیں الگ الگ نجف گڑھ کے راستے سے علی پور کی طرف بڑھیں۔[59] دونوں کا مقصد پہاڑی پر جمے ہوئے انگریزوں کے مورچوں پر حملہ کر کے باہر نکال دینا تھا۔ دونوں فوجیں پر امید تھیں کہ کامیاب ہوں گی لیکن متحد نہیں تھیں۔ دونوں فوجوں میں کوئی تال میل نہیں تھا اور نہ ہی کوئی مشترکہ منصوبہ۔ بخت خاں نے نیمچ کی فوج سے مل کر حملہ کرنے اور احتیاط سے آگے بڑھنے کا مشورہ دیا تھا لیکن بدقسمتی سے نیمچ کی فوج کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور غالباً یہ تصور کہ فتح کا سہرا ان کے سر بندھے، انگریزی فوج پر حملہ کر دیا اور بری طرح سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہو گئی۔[60] بخت خاں انگریزی فوج کی شدید بمباری کی وجہ سے اپنی فوج کو کسی مزید خطرہ میں ڈالے دہلی لوٹ آئے۔ حسب معمول مرزا مغل اور نیمچ کی فوج نے بخت خاں پر الزام لگایا کہ ان کے منفی رویے کی وجہ سے شکست ہوئی۔[61] بخت خاں الزام تراشیوں سے بددل ہوئے مگر بہادر شاہ نے ان کی دل جوئی کی اور سمجھایا کہ وہ حسب معمول کام کرتے رہیں۔[62]

دیکھا جائے تو دہلی میں گروہ بندی نے مجاہدین آزادی کو کمزور کر دیا تھا۔ انھوں نے مئی سے اگست تک کا سنہری وقت جس میں وہ متحد ہو کر انگریزوں کو شکست دے سکتے تھے، کھو دیا۔ اگست کے آخر میں انگریزوں کو پنجاب سے ضروری فوجی مدد ملنے لگی۔ برخلاف اس کے دہلی میں مجاہدین آزادی کی حالت گروہ بندیوں کی وجہ سے کمزور ہوتی چلی گئی کیونکہ ان کو گندھک اور دوسری اشیا جنگ وزندگی کی فراہمی کم تر ہوتی گئی۔[63] مہاجنوں نے بھی یکسر کورٹ آف ایڈمنسٹریشن کو قرض دینا بند کر دیا تھا۔[64] فوج کے سپاہی تنخواہ نہ پانے کی وجہ سے پریشان ہو گئے تھے۔ 3 ستمبر 1857 کو فوج کی ایک ٹکڑی نے دھمکی دی کہ وہ زینت محل کی جگہ تاج محل کو برسر اقتدار لائیں گے۔[65] فوج کے ایک دوسرے گروہ نے دریا گنج میں 6 ستمبر کو شہزادہ جوان بخت کو بادشاہ کا جانشین

بنانے کی کوشش کی تھی کہ شاید انھیں زینت محل سے انعام واکرام مل جائے۔[66] معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں کی فوج میں بھی تنخواہ نہ ملنے سے بددلی پیدا ہوگئی تھی[67] ان مشکلات کے ساتھ انگریزوں کے خطرات شدید ہوتے جا رہے تھے۔[68] 4 ستمبر کو بخت خاں نے بہادر شاہ سے اس مسئلہ پر دیر تک گفتگو کی تھی۔ 5 ستمبر کو بہادر شاہ نے ایک بڑی مجلس طلب کی اور بخت خاں سے شہر کی حفاظت کے متعلق ان کا منصوبہ پوچھا۔ بخت خاں سب کے سامنے اپنا منصوبہ بتانے سے پس و پیش میں ہوئے تو بہادر شاہ نے کہا کہ اگر دفاع ممکن نہیں ہے تو شہر کے دروازے دشمنوں کے لیے کھول دیے جائیں۔[69] بخت خاں نے اس کی شدید مخالفت کی اور مجبوراً شہر کے دفاع کا منصوبہ بتلا دیا جسے فوراً جاسوسوں نے انگریزوں تک پہنچا دیا۔[70] 6 ستمبر کو بیشتر مجاہدین آزادی ہمت چھوڑ چکے تھے۔[71] بخت خاں کا بھی فوج پر وہ اختیار نہیں رہا تھا جو پہلے تھا۔ جیون لال لکھتا ہے کہ سپاہیوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ کوئی چیف آفیسر نہیں ہے جو فوج کی کمان سنبھال سکے اور احکام جاری کر سکے۔[72]

گو کہ باقاعدہ جنگی تربیت یافتہ فوجیں انتشار کا شکار تھیں، جہادیوں کی ٹولی ابھی جگہ متحد تھی۔ لگتا ہے کہ بہت سے باغی فوجی بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے تھے۔ دہلی پر کسی وقت بھی انگریزوں کا قبضہ ہو سکتا تھا۔ بخت خاں منصوبہ کے تحت اجمیری دروازہ پر معہ جہادیوں کے 31 اگست سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔[73] انگریزی فوج کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے پیش نظر بخت خاں اور ان کی فوج اجمیری دروازہ سے دہلی دروازہ تک کی حفاظت کے لیے مستعدی سے کام کر رہی تھی۔ بخت خاں کی انگریزوں سے دہلی دروازہ پر جھڑپ ہوئی۔ بخت خاں نے انھیں پسپا کر دیا۔[74] بہرحال بتدریج انگریزی فوج کا دباؤ بڑھتا گیا اور کشمیری دروازہ پر ان کی بمباری اور قبضہ نے حالات کو بہت نازک بنا دیا۔ انھوں نے جلد ہی قلعہ اور شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب انگریزوں سے مقابلہ ناممکن نظر آنے لگا تو بخت خاں نے بادشاہ سے کہا کہ سب کچھ ضائع نہیں ہوا۔ بے شک انگریز شہر پر قابض ہو گئے ہیں اور انھوں نے قلعہ لے لیا ہے لیکن تمام ملک سامنے کھلا پڑا ہے۔ بادشاہ کے نام اور وجود کے سایہ میں جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے اور کامیابی

حاصل کی جاسکتی ہے۔[75] خواجہ حسن نظامی جو جدید مورخ ہیں غالباً میٹکاف کے احوال کی بنیاد پر اس کی تفصیلات دی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ 19 ستمبر کی شب میں بخت خاں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

> "اگرچہ انگریزوں نے دہلی کو لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تمام ملک ہمارے ساتھ ہے۔ ہر شخص کی نظر آپ کی ذات پر لگی ہوئی ہے۔ آپ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی مورچہ بندی کروں گا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی نہ آسکے گا۔ دہلی پایہ تخت ہے فوجی قلعہ نہیں ہے۔ لڑائیوں کے لیے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے چند مہینے جو ہم نے مقابلہ کیا یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ ہمارا شہر نشیب میں تھا اور انگریز پہاڑی پر۔ کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی پر ہوتی تو فتح دشوار نہ تھی۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ حضور کے صاحب زادے کمانڈر انچیف بنا دیے گئے وہ لڑائی کے فن سے ناواقف تھے۔ اگر وہ میرے کاموں میں رخنہ نہ ڈالتے اور میرے منصوبوں میں حارج نہ ہوتے تو یقیناً اسی خود سر فوج سے دشمن کو شکست دیتا۔۔۔۔ ہمیں آپسی اختلافات اور ایک دوسرے پر بھروسا نہ کرنے کے سبب وہ قوتیں جو دشمن کے مقابلے میں صرف ہوتیں خانگی جھگڑوں میں بے کار ضائع کرنی پڑیں۔ مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔۔۔ تمام ہندوستانی ریاستیں چپ چاپ بیٹھی ہیں جس وقت ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری ہوگا وہ ہماری مدد کے لیے اٹھ کھڑی ہوں گی۔۔۔۔۔ آپ یقین کیجیے کہ اگر آپ محفوظ مقامات سے انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ساتھ دے گا۔ آدمی، رسد، ہتھیار اور روپیہ ہم کو اس افراط سے مل سکتے ہیں کہ انگریز اپنے ملک سے بچے بچے کو ہم پر چڑھا کر لائیں تب بھی ہم صدیوں تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔۔۔ جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کہ حضور کے باپ دادے نے اس سے بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔"[76]

بخت خاں کی تقریر کا بہادر شاہ پر اثر ہوا۔ انھوں نے 20 ستمبر کو انھیں ہمایوں کے مقبرہ میں طلب کیا، مگر الٰہی بخش جو انگریزوں کا جاسوس اور ایجنٹ تھا اور بہادر شاہ کا قریبی عزیز بھی،

بادشاہ کو اپنی چرب زبانی سے سمجھایا اور ڈرایا، اور انگریزوں کے ساتھ معاملات درست کرنے کی ذمہ داری لیتے ہوئے کہا: "مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں ہے کہ باغی کسی جگہ جم کر مقابلہ کر سکیں گے۔ بخت خاں نے جو کہا وہ میں مانتا ہوں کہ ہندوستان کی ریاستیں اور عوام دل سے آپ کے ساتھ ہیں لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ باغی فوج آپ کے یا بخت خاں کے قابو میں رہ سکے گی۔" الٰہی بخش کی چال کام کر گئی۔ وہ پہلے ہی انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور ہر بات کی اطلاع ان کو بھیج رہا تھا۔ انگریزوں کی ہدایت تھی کہ وہ بادشاہ کو چوبیس گھنٹوں تک روکے رکھے۔[77]

20 ستمبر کو بخت خاں بادشاہ سے ملا اور ان کو دیر تک سمجھاتا رہا۔ الٰہی بخش اور ان کے ہمنواؤں سے تکرار بھی ہوئی۔ بہادر شاہ بخت خاں کی باتوں سے متاثر تھے اور اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ الٰہی بخش نے یہ رنگ دیکھا تو طنزیہ انداز میں کہا: "لارڈ گورنر صاحب! کل آپ نے فرمایا تھا کہ میں حضور کو ہر تکلیف سے محفوظ رکھوں گا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ جہاں پناہ کی آڑ میں آپ خود حکومت کرنا چاہتے ہیں...... آپ مغلوں سے صدیوں کا انتقام لینا چاہتے ہیں... میں جانتا ہوں آپ پٹھان ہیں اور پٹھان سینکڑوں برس تک کینے کو نہیں بھولتے۔" الٰہی بخش کی گفتگو سے بخت خاں نے غصہ میں تلوار نکال لی لیکن بہادر شاہ نے روک دیا اور کہا: "بہادر مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے اس لیے اپنا معاملہ تقدیر پر چھوڑتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو۔ بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں، نہ سہی تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے، ہماری فکر نہ کرو، اپنے فرض کو انجام دو۔"[78]

ناامیدی اور مایوسی سے دوچار بخت نے دہلی کو الوداع کہی اور اپنی فوج کے ساتھ اودھ چلے گئے تاکہ انگریزوں سے جنگ جاری رکھ سکیں۔[79] لکھنؤ میں بخت خاں کا شایان شان استقبال کیا گیا۔ سلطان بہو صاحبہ نے انھیں خلد منزل میں قیام کرنے کو کہا۔[80]

لکھنؤ میں بخت خاں کی سرگرمیوں کے متعلق کم تفصیلات ملتی ہیں۔ یہ شہر بھی نفاق اور گروہ بندی کا شکار تھا۔ یہاں احمد اللہ شاہ کی شہرت اور باغی فوج میں مقبولیت کی وجہ سے علی محمد خاں

عرف ممو خاں جن کو بیگم حضرت محل نے دولہ کا خطاب دیا تھا، حسد کا شکار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں نے لکھنؤ میں کسی گروپ کا ساتھ پکڑنے کے بجائے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ بہر حال وہ انگریزوں کے خلاف بیگم حضرت محل کی فوج میں شامل ہو کر جنگ کرتے رہے۔ 16 مارچ 1858 کی عالم باغ کی جنگ میں وہ موجود تھے لیکن شکست ہوئی اور ان کا توپ خانہ چھن گیا۔[81] بیگم حضرت محل نے جرأت اور بہادری کی تعریف کرتے ہوئے توپوں کے نقصان کی تلافی کا وعدہ کیا۔[82]

عالم باغ کی جنگ کے بعد بظاہر بخت خاں اودھ ہی میں رہے۔ غلام رسول مہر کے مطابق لکھنؤ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد وہ احمد اللہ شاہ کے ساتھ شاہ جہاں پور چلے گئے اور وہاں سے محمدی[83] ہوتے ہوئے نیپال میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ سین نے ایک انگریزی خبر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بخت خاں 13 مئی 1859 لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔[84] اور یہی قرین قیاس بھی ہے کیونکہ بخت خاں کسی قیمت پر اپنے موقف سے نہیں ہٹ سکتے تھے۔

حواشی:

1. G.B. Malleson, The Indian Mutiny of 1857 (rept. Delhi1977), (آئندہ بحوالہ میلی سن) p. 266
2. غلام رسول مہر، 1857ء کے مجاہد، لاہور، 1957ء، ص 104-05
3. Crisis in Punjab, rept. 1977, pp. 108-9
4. C.T. Metcalfe, Two Narratives of the Mutiny in Delhi, rept. Delhi 1974, p 134
5. غدر کی صبح و شام، مرتبہ خواجہ حسن نظامی، ہندوستان کے امیر دہلی گزٹ، 1949ء، صفحات 65-66
6. ایضاً نظامی، صفحات 65-66
7. ایس این سین، S.N. Sen, Eighteen Fifty Seven, pp. 83-84
8. Metcalfe, p 133
9. 1857ء کے مجاہد، ص 106
10. کمال الدین حیدر، تاریخ سلاطین اودھ (قیصر التواریخ) جلد دوم، ص 425، لکھنؤ، جلد اول، ص 303، (نوٹ)
11. Eighteen Fifty Seven, p. 84 and 84 n.
12. تاریخ سلاطین اودھ، جلد دوم، ص 425، احکام الظفر بالا، ص 73
13. ایضاً
14. Foreign Political Corrs. National Archive, New Delhi, Syed Mohammad Raza, Asar.i, Mahshar, Rampur rept. p. 132, Bandopadhya, Vidroh Bengali, (Calcutta 1965) pp. 102-03
15. سلطان الاخبار، دہلی، 10 جون 1857ء، چارلس بال، دی ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی، جلد اول، صفحات 458-59 پر 11 مئی 1857 کی تاریخ بہادر شاہ کے اعلان بادشاہی کی تاریخ ہے۔ کے ای، جلد سوم، ص 277
16. عبداللطیف، 1857ء کا تاریخی روزنامچہ، ایڈیٹر خلیق احمد نظامی، دہلی، صفحات 119-20
17. 1857ء کا تاریخی روزنامچہ، ص 124، دہلی اردو اخبار، 12 جولائی 1857ء
18. ذکاء اللہ، تاریخ سلطنت عروج انگلشیہ، دہلی 1904، ص 683
19. 1857ء کا تاریخی روزنامچہ، صفحات 59-60، کاف، ص 173
20. Crisis in Punjab, p.107, Metcalfe, pp. 133-34, Spear, Twilight of the Mughals, p. 214
21. Twilights of the Mughals, London 1970, p.214
22. میلکاف، ص 135
23. Metcalfe, pp.134-5، صادق الاخبار، 11 اگست 1857
24. Press List.. National Archieves, New Delhi-Nos. 539-40

سین کا خیال ہے کہ کورٹ کا قیام مئی کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ دیکھیے Eighteen Fifty seven, p 75

آرکائیوز دہلی کی ایک دستاویز سے واضح ہے کہ کورٹ کا قیام 6 جولائی 1857 کو ہی ہو گیا تھا۔ دیکھیے بہادر شاہ کا خط بنام مرزا مغل، 8 جولائی 1857، پریس لسٹ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی نمبر 153/1

25. ایضاً Talmiz Khaldun, The Great Rebellion, rep. P.C. Joshi, Rebellion 1857 A Symposium, Delhi, 1957, pp. 36-62

26. پریس لسٹ۔ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی نمبر 539-40

27. مٹکاف، ص-35

28. ایضاً

29. دہلی اردو اخبار، 12 جولائی 1857

30. مٹکاف، ص 137

31. صادق الاخبار دہلی، 6 جولائی 1857

32. مٹکاف، ص ص 134-35

33. تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، صفحات 676-6

34. ایضاً

35. مٹکاف، ص 152

36. مٹکاف، ص 152، ہلسن (جلد دوم، صفحات 425-26) پر بہر حال یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میجر ہاکس نے بخت خاں کی کوشش ناکام کر دی تھی۔

37. مٹکاف، ص 145، کمال الدین حیدر جلد دوم، صفحہ 445

38. جاسوسوں کے خطوط، نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، ص-5

39. تاریخ سلطنت عروج انگلشیہ، ص-682، مٹکاف، ص-146

40. 1857 کا تاریخی روزنامچہ، ص 87، مٹکاف، ص-191-92

41. جاسوسوں کے خطوط، صفحات 10-9، تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، ص 682، کرائسس ان پنجاب، ص-109

42. مٹکاف، ص 160 اور 167

43. (کافی) تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، ص 683، جاسوسوں کے خطوط، صفحات 65-6، 109، Crisis in Punjab

44. جاسوسوں کے خطوط، صفحات 65-66

45. مٹکاف، ص-170

46. تاریخ عروج عہد سلطنت۔۔۔ صفحہ-680

47. پریس لسٹ نیشنل آرکائیوز دہلی-111 ر(31)

48. پریس لسٹ، نیشنل آرکائیوز نئی دہلی نمبر 111 (ص-43)

49. ایضاً نمبر 144/120 نیشنل آرکائیوز نئی دہلی

50. یہ آرکائیوز نے آگرہ کے قلعے سے جنرل ہیولاک کو خط لکھا تھا کہ جس طرح بے شمار مسلمان دہلی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں وہ بے مثال ہے۔ دیکھیے پارلیمنٹری پیپرز (نمبر 4) صفحہ 140

51. جاسوس گوری شنکر کا خط بنام انگریز افسران، مورخہ 8 اور 10 اگست 1857، نیشنل آرکائیوز نمبر 5، 15 اور 19 نئی دہلی، Crisis in Punjab, p-110

52. ایضاً
53. مٹکاف، ص-177
54. تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ، صفحات 90-689
55. پریس لسٹ - نمبر 57، سیریل نمبر 352، مٹکاف، صفحات 98-197 اور 203
56. مٹکاف، صفحات 199، 201-200
57. مٹکاف، ص205
58. مٹکاف، صفحات 206-205
59. جاسوسوں کے خطوط، ص93
60. مٹکاف، صفحات 8-206 ظہیر دہلوی کے مطابق مچھے کی فوج انگریزی فوج اور بخت خاں کی فوج کے درمیان پھنس گئی تھی۔
61. جاسوسوں کے خطوط، ص93
62. مٹکاف، ص212
63. مٹکاف، ص213
64. مٹکاف، صفحات 15-214
65. مٹکاف، ص218
66. جاسوسوں کے خطوط، ص98
67. جاسوسوں کے خطوط، ص48، مٹکاف، صفحات 224-221
68. مٹکاف، ص219
69. مٹکاف، ص224
70. James Leaser, The Red Fort (London, 1956) p. 145
71. جاسوسوں کے خطوط، ص102
72. مٹکاف، ص223
73. جاسوسوں کے خطوط، ص89
74. ملیسن، جلد دوم، صفحات 12-311، کے ای، جلد سوم، صفحات 93-592
75. کے ای، جلد دوم، ص644، بکل من، جلد چہارم، ص50
76. حسن نظامی، دہلی کی جاں کنی - صفحات 38-37، بکل من، جلد دوم، صفحات 72-71
77. قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحات 12-311، ملیسن، جلد دوم، صفحات 4-172
78. ملیسن، جلد دوم، صفحات 72-71، 74-73، کے ای، جلد سوم، ص644
79. قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحات 12-311
80. ایضاً، صفحات 14-313
81. ملیسن، جلد دوم، صفحات 3-402، قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحات 12-311
82. قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحات 12-311
83. 1857 کے مجاہد، ص 118
84. Eighteen Fifty Seven, p. 371

ظہیر علی

رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی)

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں ایک حوصلہ مند، غیور اور بہادر خاتون، رانی لکشمی بائی نے جس شجاعت اور فوجی حکمتِ عملی کا ثبوت دیا اس کی مثال نہ صرف ہندوستان کی تاریخ بلکہ تاریخ عالم میں بھی بہت کم ملتی ہے۔ اس نوجوان خاتون نے، جو وسطِ ہند کی ایک چھوٹی سی ریاست، جھانسی کی رانی تھی، انگریزوں کی بے پناہ طاقت کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا اور دلیرانہ لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں جامِ شہادت پیا۔

یوں تو اس پہلی جنگِ آزادی میں کئی فوجی سرداروں اور سپاہیوں نے داد شجاعت دی تھی لیکن رانی لکشمی بائی کی حیرت انگیز بہادری، حب الوطنی اور اپنے اصولوں کے لیے جان کی بازی لگا دینے کا جذبہ، انھیں 1857 کے معرکہ کی سب سے نڈر، قابل اور پکی نیشنلسٹ رہنما ثابت کرتا ہے۔ اس حقیقت کو وہ انگریز مورخ بھی تسلیم کرتے ہیں جنھیں ہندوستانیوں سے نہ تو جذباتی لگاؤ ہے اور نہ وہ ان کے طرفدار ہیں۔ مثال کے طور پر ونسنٹ اسمتھ — (Vincent Smith) نے رانی لکشمی بائی کو جنگِ آزادی کے رہنماؤں میں سب سے قابل رہنما تسلیم کیا ہے۔

جنگِ آزادی کی اس عظیم رہنما کی تاریخ پیدائش پر مورخین میں اختلاف رائے موجود ہے۔ اکثر مورخین کی رو سے وہ 1828 میں کاشی (وارانسی) میں پیدا ہوئی تھی البتہ اس گروہ کے مورخ دن اور مہینہ کے بارے میں خاموش ہیں۔ اس کے برعکس ایک اور مورخ ڈی. بی. پارس نس (D.B.Parasnis) کے مطابق رانی کا جنم 19 نومبر 1835 کو ہوا تھا۔ تاہم پارس نس

کے علاوہ کوئی دوسرا مستند مورخ اس تاریخ سے اتفاق نہیں رکھتا۔ رانی کے سنہ پیدائش کے تعلق سے ایک اہم شہادت جان لینگ (John Lang) کی بھی ہے جسے لکشمی بائی نے اپنے متبنیٰ بیٹے کی وراثت کا مقدمہ لڑنے کے لیے وکیل مقرر کیا تھا۔ لینگ نے 1854 میں رانی سے ملاقات کی تھی جس کے ذکر میں اس نے لکھا ہے کہ اس وقت لکشمی بائی 26 برس کی خاتون تھی۔ اس طرح ان کا سنہ پیدائش 1828 ثابت ہوتا ہے اور یہی قرین قیاس ہے۔

رانی کے والد کا نام مورو پنت تامبے تھا جو برہمن ذات کے تھے اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی والدہ بھاگیرتی بائی بھی ایک مہذب، ذہین اور مذہبی خاتون تھی۔ والدین کی روشن خیالی اور سوجھ بوجھ کے سبب لکشمی بائی کی تربیت بہت اچھے طریقے سے ہوئی تھی۔

والدین نے اپنی بیٹی کا نام منی کرنیکا (دریائے گنگا کے کئی ناموں میں سے ایک) رکھا تھا اور پیار سے اسے منو پکارتے تھے۔ چونکہ رانی کی پیدائش دریائے گنگا کے کنارے پر آباد ہندوؤں کے مقدس شہر کاشی میں ہوئی تھی اسی مناسبت سے اس کا نام منی کرنیکا رکھا گیا تھا۔ منو جب چار سال کی تھی تو اس کے سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا۔ اس طرح اس کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمے داری اس کے والد، مورو پنت، نے بخوبی نبھائی۔

مورو پنت، دراصل پیشوا باجی راؤ دوم کے دربار سے منسلک تھے۔ تیسری اینگلو۔ مراٹھا جنگ میں مراٹھوں کی شکست کے بعد مراٹھا سلطنت کا اقتدار ختم ہو گیا تھا اور 1818 میں تقریباً تمام ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر نگیں آ گیا تھا۔ نتیجتاً کمپنی نے پیشوا کو اقتدار سے بے دخل کر کے اسے جلاوطن کر دیا تھا اور بٹھور نامی ایک گاؤں (نزد کانپور) میں پیشوا باجی راؤ دوم اپنے خاندانی افراد، کچھ وفادار ملازمین اور چند سپاہیوں کے ساتھ جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ ان کے ملازمین میں مورو پنت بھی شامل تھے۔ پیشوا باجی راؤ دوم کا متبنیٰ لڑکا ڈھونڈو پنت، جو بعد میں نانا صاحب کے نام سے مشہور ہوا اور جس نے پہلی جنگ آزادی میں بہت اہم کردار ادا کیا، منی کرنیکا سے عمر میں تھوڑا بڑا تھا لیکن دونوں نے شہ سواری، تلوار بازی، نشانہ بازی اور دوسری قسم کی فوجی تربیت ساتھ ساتھ لی تھی۔

1842 میں منی کرنیکا کی شادی جھانسی کے فرمانروا، راجا گنگادھر راؤ، سے ہوئی اور اسی سبب وہ جھانسی کی رانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ شادی کے بعد ہندو رسم کے مطابق اس کا نام لکشمی بائی رکھا گیا۔ تاریخ پیدائش کے تنازعے کے ضمن میں لکشمی بائی کی شادی کا سنہ بھی اس کی صحیح تاریخ پیدائش متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے چونکہ شادی کی تاریخ متنازعہ نہیں ہے۔ اگر پارس نس کے سنہ پیدائش یعنی 1835 کو صحیح مان لیا جائے تو شادی کے وقت رانی صرف سات برس کی تھی اور یہ بات درست نظر نہیں آتی۔ اگر 1828 کو صحیح سنہ پیدائش تسلیم کرلیا جائے تو شادی کے وقت رانی 14 برس کی تھی جو اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق کسی لڑکی کی شادی کے لیے بالکل درست عمر سمجھی جاتی تھی۔ شادی کی رسم گنیش مندر میں ادا کی گئی تھی جو شہر جھانسی کے قلب میں واقع ہے۔

راجا گنگادھر راؤ کی یہ دوسری شادی تھی اور وہ لکشمی بائی سے عمر میں چالیس سال بڑے تھے۔ ان کی پہلی بیوی، بنا کوئی اولاد چھوڑے انتقال کرچکی تھی۔ گنگادھر راؤ کو اپنی گدی کے جانشین کی خاطر اولادِ نرینہ کی خواہش تھی۔ شادی کے نو برسوں بعد یعنی 1851 میں لکشمی بائی کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا لیکن راجا، رانی اور جھانسی ریاست کی بدقسمتی سے وہ بیٹا صرف چار مہینوں بعد ہی انتقال کرگیا۔ اب گنگادھر راؤ وارث کے لیے فکرمند رہنے لگے۔ 1853 میں وہ بہت بیمار ہوگئے اور ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ بالآخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جھانسی کی گدی پر اپنا خاندانی اقتدار قائم رکھنے کے لیے کسی بچے کو گود لیں گے۔ چنانچہ 20 نومبر 1853 کو انھوں نے دامودر راؤ کو گود لیا۔ لکشمی بائی بے حد عقل مند اور دوراندیش خاتون تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ایک متبنیٰ لڑکے کی وراثت کا معاملہ مستقبل میں تنازعہ پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے اس نے گود لینے کی رسم کی تقریب میں جھانسی میں مقیم کمپنی کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا تھا تاکہ متبنیٰ، دامودر راؤ، کو قانونی وارث تسلیم کرلیا جائے اور مستقبل میں ڈلہوزی کی بدنام زمانہ ضبطیس کی پالیسی (Policy of Lapse) کا اطلاق ریاست جھانسی پر نہ کیا جاسکے۔ گود لینے کی رسم کے دوسرے دن، یعنی 21 نومبر 1853 کو گنگادھر راؤ کا انتقال ہوگیا۔

اس وقت لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا اور اپنی بدنام زمانہ ڈلیپس کی پالیسی کے ذریعہ یکے بعد دیگرے بیشتر ہندوستانی ریاستوں کا خاتمہ کر کے تمام ہندوستان میں کمپنی کا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا۔ جہاں تک ریاست جھانسی کی تاریخ کا تعلق ہے تو یہ بات مدِنظر رکھنی چاہیے کہ یہ مراٹھا سلطنت کا ہی ایک حصہ تھی۔ جب پیشوا کا اقتدار حقیقی معنوں میں قائم تھا تو اس کی جانب سے مقرر کیا ہوا صوبے دار ریاست کے انتظامی امور کا نگراں ہوا کرتا تھا۔ کمپنی کی سازشوں اور بے جا مداخلتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ پیشوا کی طاقت کمزور ہوتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ صوبے دار کا عہدہ موروثی بن گیا۔ بیشتر صوبے دار راجا بن بیٹھے اور ریاستی معاملات میں انھیں تقریباً خودمختاری حاصل ہوگئی۔ جھانسی کے راجا بھی خودمختار ہو گئے۔ لیکن برائے نام پیشوا کی ماتحتی قبول کرتے تھے۔ جب 1818 میں کمپنی کے ارباب اختیار نے پیشوا کا اقتدار مکمل طور پر ختم کر کے اسے جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تو کمپنی نے جھانسی کے راجا رام چندر راؤ کے ساتھ دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے کی رو سے جھانسی کی ریاست" ہمیشہ کے لیے راجا رام چندر راؤ اس کے جانشینوں اور خاندان والوں کی موروثی ریاست رہے گی۔"

(Aitchison's Treatises etc. Revised Edn.)

لیکن جب 1853 میں گنگا دھر راؤ کا انتقال ہوا تو لارڈ ڈلہوزی نے معاہدے کی اس شق کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ریاست جھانسی کو برطانوی ہندوستان میں ملحق کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سراسر دھاندلی تھی کیونکہ ہندو مذہب کے مطابق راجا گنگا دھر راؤ نے اپنے نزدیکی رشتے دار بچے کو باضابطہ گود لیا تھا اور جھانسی میں مقیم کمپنی کے نمائندے بھی اس تقریب میں شامل تھے۔ اس حقیقت حال کے پیش نظر لارڈ ڈلہوزی کا 27 فروری 1854 کا فیصلہ، جس کی رو سے متبنیٰ بیٹے، دامودر راؤ کو راج پاٹ سے بے دخل کر کے جھانسی کی ریاست کو کمپنی کے اقتدار کا حصہ بنانا تھا، سراسر عہد شکنی اور بے ایمانی کی بدترین مثال تھا۔ اس بات کا احساس بعض انگریز افسروں کو بھی تھا۔ چنانچہ میجر ایونس بیلس (Major Evans Bells) لکھتا ہے: "گود لینے کی رسم بالکل ٹھیک ٹھیک ہندو شاستر کے مطابق ادا کی گئی تھی۔ انگریز افسر رسم کی تقریب میں موجود تھے اور راجا

نے اپنے انتقال سے قبل باضابطہ خط کے ذریعے انگریز سرکار کو اس کی خبر دے دی تھی۔" (Major Evans Bells, Empire in India) اسی طرح ٹی رائس ہومز (T.Rice Holmes) لکھتا ہے:"لارڈ ڈلہوزی کے مخالفین کو اس کی کسی پالیسی نے اس سے اتنا متنفر نہیں کیا تھا جتنا جھانسی پر قبضہ کرنے کی پالیسی نے۔"(History of Sepoy War)

بہرکیف جب جھانسی کو کمپنی سرکار کا حصہ قرار دے دیا گیا تو رانی نے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ رانی کا یہ احتجاجی جملہ کہ" میں اپنی جھانسی نہیں دوں گی۔" عوام کا ایک نعرہ بن گیا تھا۔ رانی نے برطانیہ میں اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے جان لینگ (John Lang) کو اپنا وکیل مقرر کیا تھا۔ لیکن برطانیہ میں بھی رانی کے دعوے کو مسترد کر دیا گیا۔ ان ناساعد حالات میں رانی نے بردباری اور عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے بظاہر انگریزوں کے فیصلے کو مان لیا لیکن اپنے غصے اور اپنی برہمی کی آگ کو سینے میں بجھنے نہیں دیا۔ کمپنی کے نمائندوں کے سامنے وہ اپنے برتاؤ سے یہ ظاہر کرتی کہ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے لیکن اپنے دل میں وہ اس جذبے کی پرورش کرتی رہی کہ موقع ملنے پر انگریزوں کی کمینگی کا بدلہ ضرور لے گی۔ کمپنی کے عہدے داروں نے اپنی طمع اور دولت کی ہوس کا ایک اور ثبوت اس طرح بھی دیا کہ راجا گنگادھر راؤ کی ذاتی دولت بھی ہتھیالی۔ راجا گنگادھر راؤ مرتے وقت تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے کے جواہرات اور ڈھائی لاکھ روپیہ نقد چھوڑ گئے تھے۔ ڈلہوزی نے اس ساری دولت کو کمپنی کے خزانے میں یہ کہہ کر جمع کر لیا کہ دامودر راؤ کے بالغ ہونے پر اسے یہ دولت دے دی جائے گی لیکن اسے جھانسی کا حقدار کبھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں کمپنی نے رانی پر یہ شرط بھی عاید کی کہ اسے اپنے ساٹھ ہزار روپے کے سالانہ معمولی وظیفے میں سے اس کے آنجہانی شوہر، راجا گنگادھر راؤ، کے چھوڑے ہوئے قرضوں کی اقساط بھی ادا کرنے پڑے گی۔ یہ حرکت رانی کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی۔ اس سلسلے میں ٹی۔ رائس ہومز لکھتا ہے:

> " وہ واقعی ایک ایسی خاتون تھی جسے بغاوت پر اکسانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس کا قد اونچا اور وہ ایک حسین اور پرکشش شخصیت کی مالک تھی۔ بظاہر وہ ایک ذہین اور دھن کی پکی خاتون تھی۔"(History of Sepoy War)

اپنی ذاتی پریشانیوں اور مالی مشکلات کے باوجود رانی نے اس بات پر ہمیشہ اپنی توجہ مرکوز رکھی کہ جھانسی کے عوام کے غم و غصہ کو کس طریقے سے اور کس وقت انگریزوں کے خلاف استعمال کیا جائے۔ کمپنی کے عہدے داروں کی ناعاقبت اندیش پالیسیوں نے اس کام کو اور بھی آسان کر دیا تھا۔ جھانسی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے اپنے آمرانہ اور گستاخانہ برتاؤ سے عوام کے جذبات کو بری طرح زخمی کیا تھا۔ گائے کا ذبیحہ علی الا اعلان کیا جانے لگا تھا۔ رانی نے گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگا کر اس ہتک آمیز حرکت کو بند کرنے کے لیے کئی عرضداشتیں دی تھیں کیونکہ بیشتر عوام اس حرکت کو اپنے مذہب کی توہین سمجھتے تھے۔ لیکن کمپنی کے عہدے داروں نے رانی کی عرضداشتوں پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا بلکہ رانی کے کردار کشی کی مہم شروع کر دی تا کہ عوام اس سے بدظن ہو کر ہمیشہ کے لیے کمپنی کے وفادار بن جائیں۔ انگریزوں نے کہنا شروع کیا کہ رانی محض ایک بچی ہے اور اسی وجہ سے موقعہ پرست افراد اس کی ناسمجھی کا فائدہ اٹھا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ یہ افواہ بھی اڑائی گئی کہ رانی کو نشہ کی عادت ہے۔ یہ تمام حرکتیں انگریزوں کی سامراجی حکمت عملی کے عین مطابق تھیں۔ انگریز سامراجیوں نے ہمیشہ اور ہر جگہ یہی وتیرہ قائم رکھا کہ پہلے سازشوں کے ذریعے کسی حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا جائے اور بعد ازاں اس کی کردار کشی کے لیے گھناؤنے الزامات تراش کر ان کی تشہیر کی جائے تا کہ عوام بھی اس سے بدظن ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان کا حکمراں ایک عیاش اور بدکردار شخص تھا۔ ان معنوں میں رانی کے خلاف اڑائی گئی افواہیں غیر متوقع نہیں تھیں۔ ان بے بنیاد الزام تراشیوں کی تردید ایک انگریز مورخ خود کرتا ہے: "اس (رانی) کی گفتگو بجائے خود اس بات کی غماز تھی کہ وہ محض ایک بچی نہیں تھی اور اس کے نشہ کرنے کی عادت بھی ایک جھوٹی اور بے بنیاد بات معلوم ہوتی ہے۔" (Sir John Kaye, History of the Sepoy War)۔ یہاں میجر مالکم کا حوالہ دینا اس لیے اہم ہے کہ وہ رانی کے کردار اور اس کی زندگی کے تعلق سے ذاتی طور پر بہت کچھ جانتا تھا۔ ایک سرکاری خط مورخہ 16 مارچ 1855ء میں میجر مالکم نے گورنر جنرل کو رانی کے تعلق سے یہ بات لکھی تھی: "وہ ایک انتہائی اونچے کردار کی مالک ہے اور جھانسی میں ہر شخص اس کی بے حد عزت کرتا

ہے۔" (Jhansi Papers, Cf Pandit Sunderlal, British Rule in India)

اقتدار سے بے دخل کر دیے جانے کے بعد رانی نے تقریباً 14 ہزار سپاہیوں کی فوج تیار کرلی تھی۔ اس کے فوجی سرداروں میں غلام غوث خان، دوست خان، خدا بخش، لالہ بھاؤ بخشی، موتی بائی، سندر، مندرا، کاشی بائی، دیوان رگھوناتھ اور دیوان جواہر سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ خاص بات یہ کہ رانی کی فوج میں خاصی تعداد میں خواتین بھی شامل تھیں اور مردوں کے شانہ بشانہ فوجی تربیت میں حصہ لیتی تھیں۔

یہ تھا جھانسی کا سیاسی پس منظر جب میرٹھ کے جانباز سپاہیوں نے انگریز افسروں کے خلاف جنگِ آزادی کا پرچم لہرایا اور بعد ازاں دہلی کو کمپنی کے تسلط سے آزاد کرا کے بہادر شاہ ظفر کو پھر سے شہنشاہِ ہندوستان مقرر کیا۔ جب جنگِ آزادی کی شروعات کی خبر جھانسی پہنچی تو رانی نے قلعہ میں تعینات ہندوستانی سپاہیوں سے رابطہ قائم کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی فوج کو جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم بھی دیا۔ انقلابیوں کے پلان کے مطابق جھانسی میں جنگِ آزادی کی ابتدا 4 جون 1857 کو ہونی تھی۔ تاریخ مقررہ کو کمپنی کی بارہویں انڈین انفنٹری کے حوالدار گربخش سنگھ نے کمپنی کے اسلحہ خانے اور خزانے پر قبضہ کر کے جنگِ آزادی کی ابتدا کی۔ اس کے بعد رانی نے انقلابیوں کی فوج کی کمان سنبھالی۔ 7 جون کو رسالہ دار کالے خان اور تحصیل دار محمد حسین نے رانی کے ایما پر جھانسی کے قلعہ پر دھاوا بول دیا جو جھانسی پر کمپنی کا تسلط ہو جانے کے بعد سے انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ قلعہ میں تعینات ہندوستانی سپاہی فوری انقلابیوں سے مل گئے اور اسی روز جھانسی کی ریاست انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گئی۔ رانی نے راجہ دامودر راؤ کے سرپرست کی حیثیت سے دوبارہ جھانسی کی گدی کو رونق بخشی۔ قلعہ پر سے کمپنی کے یونین جیک کو ہٹا کر شہنشاہِ ہندوستان، بہادر شاہ ظفر کا پرچم لہرایا گیا۔ جھانسی کی آزادی کا اعلان تمام ریاست میں پورے تام جھام سے کیا گیا۔ منادی کے شروع میں یہ جملہ کہا جاتا تھا: "خلق خدا کی ملک شہنشاہ کا اور حکم رانی لکشمی بائی کا۔" (پنڈت سندر لال)

بعض انگریز مورخوں نے ایک ناخوشگوار واقعہ کے حوالے سے رانی کو بدنام بھی کیا ہے۔ 8 جون کو قلعہ کے اندر ہی 67 انگریز مرد، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ گمان اغلب ہے کہ قتل کے احکامات رسالدار کالے خان نے جاری کیے تھے۔ تاہم انگریز مورخوں نے رانی کو اس قضیے میں ملوث قرار دے کر اسے ایک ظالم اور بے رحم حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرجان کی تحقیق کے مطابق رانی کا اس بدبخت واقعے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

(بحوالہ ہومز، ہسٹری آف سی پائے وار)

شمالی ہند کے دوسرے علاقوں میں جنگ آزادی زوروں پر تھی۔ کئی علاقے، بشمول دہلی، آزاد بھی ہوئے اور بعد ازاں ان پر انگریزوں نے اپنے وفادار ہندوستانی حلیفوں کی مدد سے دوبارہ قبضہ بھی کیا۔ تاہم جھانسی کا علاقہ مسلسل گیارہ مہینوں تک رانی کی حکمرانی میں آزاد رہا۔ دوسرے علاقوں میں ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کے بعد انگریزوں نے بالآخر جھانسی کو دوبارہ فتح کرنے کی طرف توجہ دی۔

چنانچہ 6 جنوری 1858 کو سرہیوروز (Sir Hugh Rose) ایک بھاری لشکر کے ساتھ مہو (Mhow) سے روانہ ہوا۔ راستے میں کئی علاقوں سے انقلابیوں کا قلع قمع کرنے کے بعد یہ بھاری لشکر 20 مارچ کو جھانسی کے نواح میں پہنچا۔ رانی نے حفاظتی اقدامات کے طور پر کمپنی کی فوج پہنچنے سے قبل جھانسی کے اطراف کے علاقے کو دور دور تک ویران کروا دیا تھا تاکہ قلعہ کے محاصرے کے دوران کمپنی کے لشکر کو رسد وغیرہ نہ مہیا ہو سکے۔ لیکن انگریزوں کے وفادار حلیف، مہاراجا سیندھیا اور ٹہری ٹیکم گڑھ کے راجا نے کمپنی کی فوج کے لیے رسد کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ اس لیے کمپنی کے لشکر کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

قلعہ بند ہو کر رانی نے اپنی فوج کی قیادت سنبھالی۔ اس نے ہر مورچے پر اپنی نگرانی میں دفاعی انتظام کروائے۔ فصیل پر توپیں چڑھانے کے ضروری ہدایات دیں۔ رانی مسلسل سرگرمی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر تمام حفاظتی اقدامات کا معائنہ کرتی تھی۔ اس طرح اس نے اپنے وفادار انقلابیوں کے دلوں میں آزادی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔

سر ہیوروز کے مطابق "رانی لکشمی بائی کے ساتھ جھانسی کی سیکڑوں خواتین توپ خانوں اور میگزینوں میں آتی جاتی اور کام کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔" (بحوالہ پنڈت سندر لال)

جنگ کا باضابطہ آغاز 24 مارچ کو ہوا۔ انگریزی فوج نے شہر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ رانی نے حالات کا معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ لیا کہ محاصرہ کو کمزور کرنے کے لیے جنگی کارروائی کی ابتدا ہندوستانیوں کی جانب سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ جھانسی کی ایک توپ، جس کا نام "گھن گرج" تھا، کا رخ کمپنی کی فوج کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس توپ کی مسلسل گولہ باری سے جنگ کا آغاز ہوا۔ اس موقعہ پر یہ بہت ضروری ہے کہ ڈی. بی. پارس نس کی مراٹھی کتاب "سوانح لکشمی بائی" سے جنگ کے متعلق چند اقتباسات نقل کیے جائیں کیونکہ پارس نس بذات خود ان دنوں جھانسی میں موجود تھا اور جنگ کو اس نے بچشم خود دیکھا تھا۔ اس کی بیان کردہ تفصیل یوں ہے:

"25 مارچ سے جنگ میں شدت پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے سارا دن اور ساری رات گولے برسائے... 26 تاریخ کی دوپہر کو کمپنی کی فوج نے شہر کے جنوبی پھاٹک پر اس شدت سے گولے برسائے کہ اس طرف انقلابیوں کی توپیں ٹھنڈی ہو گئیں... اس کے ردعمل میں مغربی پھاٹک کے توپچی نے اپنی توپ کا رخ اس طرف موڑ کر دشمن پر گولے برسانے شروع کیے۔ تیسرے گولے نے انگریزی فوج کے سب سے اچھے توپچی کا خاتمہ کر دیا... رانی نے خوش ہو کر اپنے توپچی، غلام غوث خان کو سونے کا کڑا انعام میں دیا۔ پانچویں یا چھٹے دن، چار پانچ گھنٹوں تک رانی کی توپوں نے معجزہ کر دکھایا۔ اس دن انگریزی فوج کے بے شمار سپاہی مارے گئے اور بہت سے انگریزی توپیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ پھر انگریزی توپیں زیادہ جوش سے گولے برسانے لگیں۔ جھانسی کی فوج کا حوصلہ کمزور ہونے لگا۔ ساتویں دن شام کو دشمن کی شدید گولہ باری سے شہر کی بائیں طرف کی دیوار کا ایک حصہ گر گیا... لیکن رات کے وقت گیارہ مستری کمبل اوڑھے دیوار تک پہنچے اور صبح تک مسمار شدہ حصے کی مرمت کر دی۔ جھانسی کی توپ طلوع آفتاب سے قبل پھر اپنا کام کرنے لگی۔ اس سے کمپنی کی فوج کا بڑا نقصان ہوا، یہاں تک کہ ان کی توپیں بہت دیر تک کے لیے ناکارہ ہو گئیں۔ آٹھویں دن صبح، کمپنی کی فوج شنکر قلعہ کی طرف بڑھی۔ دوربینوں کی مدد سے انگریزوں نے قلعہ کے

اندر واقع پانی کے چشمے پر گولے برسانے شروع کیے۔ چھ، سات آدمی، جو پانی لینے وہاں پہنچے تھے، ان میں سے چار وہیں پر مر گئے۔ باقی اپنے برتن چھوڑ کر بھاگ گئے۔ جوابا مغربی اور جنوبی پھاٹکوں کے توپچیوں نے کمپنی کی فوج پر لگاتار گولہ باری شروع کی اور کمپنی کی توپوں کے منہ پھیر دیے۔ املی کے درختوں کے نیچے بارود کا ایک کارخانہ تھا۔ ایک گولہ اس کارخانے پر گرا جس کی وجہ سے تیس مرد اور آٹھ عورتیں مر گئیں.....
اس دن کی جنگ غضب کی تھی۔ بندوقوں کی آوازیں دلوں کو دہلاتی تھیں۔ توپیں زوروں کے ساتھ چل رہی تھیں۔ جگہ جگہ ترہی اور بگل کی آواز سنائی دیتی تھی۔"
فصیل شہر کے کئی توپچی اور بہت سارے سپاہی مارے گئے۔ ان کی جگہ دوسرے مقرر کر دیے گئے۔ رانی لکشمی بائی اس دن بڑی محنت کے ساتھ کام کرتی رہی... وہ جہاں کہیں دیوار میں کمزوری دیکھتی تھی، اس کی فوراً مرمت کراتی تھی۔ رانی کی ذاتی سرگرمی سے سپاہیوں کا حوصلہ بڑھتا تھا اور وہ پورے جوش سے لڑتے تھے۔"

(بحوالہ پنڈت سندر لال)

جہاں ایک طرف انقلابیوں کا جذبۂ حریت اور عزم شہادت تھا وہیں دوسری طرف کمپنی کا بھاری لشکر اور اس کے بے شمار اور بہتر ہتھیار تھے۔ جھانسی کی فوج نے رانی کی قیادت میں لگاتار گیارہ دنوں تک کمپنی کی فوج سے لوہا لیا اور انگریزوں کو بھاری نقصانات اٹھانے پڑے۔ رفتہ رفتہ جھانسی کی فوج کمزور پڑنے لگی لیکن رانی کا حوصلہ اور ہمت برقرار رہی۔ 3 اپریل کو کمپنی کی فوج نے جھانسی پر ایک شدید حملہ کیا۔ شہر پر چاروں طرف سے دھاوا بولا گیا تھا۔ رانی عین میدان جنگ میں گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے فوجی سرداروں اور سپاہیوں کا عزم اور ہمت بڑھاتی رہی۔ کمپنی کی فوج نے پہلے شمال کی طرف صدر دروازے پر پوری طاقت کے ساتھ حملہ کیا۔ آٹھ مقامات پر انگریزی فوج سیڑھیاں لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ رانی کی توپوں نے گولہ باری جاری رکھی جس کے سبب آٹھ سیڑھیاں ٹوٹ کر گر پڑیں۔ شہر کے شمال کی طرف تو جنگ کی یہ شدت تھی لیکن شہر کے جنوب میں کمپنی کی فوج اپنے سب سے موثر ہتھیار، یعنی سازش کرنے میں مصروف تھی۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ جھانسی کی فوج کے کسی غدار کی مدد سے کمپنی کی فوج جنوبی دروازے سے شہر میں گھس آئی اور اس کے بعد جھانسی کے تمام مورچے یکے بعد دیگرے انگریزی فوج کے سامنے

پسپا ہوتے گئے۔

کمپنی کی فوج کے افسروں کا سب سے اہم مقصد رانی کو گرفتار کرنا تھا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے انگریزی فوج محل کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن رانی تو عین میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہی تھی۔ اس نے شہر کی فصیل پر سے جھانسی کے شہریوں کا قتلِ عام اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس بربریت نے اس کے دل میں غم و غصہ کی آگ بھڑکا دی۔ اس نے فوراً ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ انگریزی فوج پر دھاوا بول دیا۔ اب بندوقوں کی افادیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ کیونکہ جنگ دوبدو شروع ہوگئی تھی۔ دونوں فوج کے سپاہیوں نے اپنی تلواریں سونت لیں۔ جھانسی کی فوج کمپنی کی فوج پر بھاری پڑنے لگی۔ انگریزوں کو پسپا ہوکر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسی دوران میں رانی کو خبر ملی کہ شہر کے صدر دروازے کا محافظ سردار، خدا بخش اور توپ خانے کا افسر، سردار غلام غوث خان، شہید ہوگئے۔ یہ خبر رانی پر بجلی کی طرح گری کیونکہ ان بہادر سرداروں کی شہادت کا مطلب یہ تھا کہ شہر کا شمالی دروازہ بھی اب دشمن کے لیے کھل گیا تھا اور جھانسی کی فوج چاروں جانب سے انگریزی فوج کے نرغے میں گھر گئی تھی۔ اس کڑے وقت میں بھی رانی نے اپنی فوجی حکمت عملی کا بین ثبوت دیا۔ اس نے خود قلعہ کے میگزین میں آگ لگادی تاکہ یہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ سکے۔

اس کے بعد رانی نے مردانہ پوشاک پہنی۔ ہتھیار باندھے۔ اپنے متبنّیٰ بیٹے، دامودر، کو کمر پر کسا اور قلعہ کی دیوار پر سے ایک ہاتھی کی پیٹھ پر کود پڑی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوکر ہمیشہ کے لیے جھانسی کو خیرباد کہہ دیا۔ اپنے دس بارہ وفادار اور جانباز سپاہیوں کے ساتھ رانی کالپی کی طرف روانہ ہوئی۔ کمپنی کی فوج کے سپاہیوں نے رانی کا پیچھا کیا۔ لیفٹننٹ بوکر (Lt. Bookar) کی قیادت میں انگریزی فوج کے چند شہسوار رانی کے تعاقب میں روانہ کیے گئے۔ رانی اور اس کے ساتھی تمام رات، بنا کسی مقام پر رکے، تیز رفتاری سے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ علی الصبح بہت کم وقفے کے لیے رانی بھاندیر نامی گاؤں کے قریب رکی تاکہ اپنے بیٹے دامودر کو دودھ پلا سکے۔ گاؤں سے دودھ لے کر اس نے فوری کوچ کیا کیونکہ انگریزی فوج مسلسل تعاقب کر رہی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انگریزی فوج رانی اور اس کے ساتھیوں کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ لیفٹننٹ بوکر گھوڑا

دوڑا کر رانی کے قریب پہنچا اور چاہتا ہی تھا کہ اس پر وار کرے کہ رانی نے تلوار کے ایک ہی وار سے اسے گھائل کر دیا اور وہ گھوڑے پر سے گر پڑا۔ پھر رانی کے ساتھیوں اور انگریزی سپاہیوں میں تلوار بازی ہونے لگی۔ جلد ہی انگریزی فوج کے سپاہی پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد رانی اور اس کے ساتھیوں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ پورا دن اور آدھی رات گھوڑے دوڑاتے ہوئے یہ لوگ کالپی پہنچے تھے۔ اس طرح رانی نے جھانسی سے کالپی یعنی ایک سو دو میل تک کا سفر اپنے بیٹے کو کمر سے باندھ کر اور تقریباً بنا قیام کیے طے کیا تھا رانی کا چہیتا گھوڑا کالپی پہنچتے ہی تھکن اور نقاہت کی وجہ سے گرا اور اپنی جان دے دی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد صبح کو رانی نے نانا صاحب کے بھتیجے، راؤ صاحب اور فوج کے سپہ سالار، تانتیا ٹوپے سے بات چیت کی اور آئندہ کی فوجی حکمت عملی پر غور کیا۔

جس وقت رانی کالپی پہنچی اس وقت وہاں اس کے علاوہ راؤ صاحب، تانتیا ٹوپے باندہ کا نواب، شاہ گڑھ اور بانا پور کے راجا اور بعض دوسرے انقلابی رہنما اپنے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ موجود تھے۔ انقلابیوں کی یہ متحدہ طاقت انگریزی فوج کو شکست دینے کے لیے کافی تھی۔ لیکن افسوسناک بات یہ تھی کہ ان ہندوستانی انقلابیوں میں اتحاد کا فقدان تھا۔ ان تمام ہندوستانی رہنماؤں میں صرف رانی لکشمی بائی ہی، فوجی حکمتِ عملی اور فوجی قیادت کے نقطۂ نظر سے، سب سے زیادہ قابل تھی۔ لیکن اس زمانے کے مزاج کے مطابق اس کا عورت ہونا اس کے حق میں فالِ بد ثابت ہوا۔ عورت ہونے کے علاوہ وہ بہت کم عمر بھی تھی۔ اس لیے دوسرے انقلابی سردار اس کی قیادت میں جنگ لڑنے کے لیے راضی نہیں تھے۔ رانی کے بعد تانتیا ٹوپے بھی ایک بہادر اور قابل فوجی لیڈر تھا۔ لیکن وہ نہ تو کسی ریاست کا سربراہ تھا اور نہ راجا۔ لہٰذا اس کی قیادت بھی ناقابلِ قبول تھی۔ اس بدبخت صورتحال نے کالپی میں ہندوستانی انقلابیوں کو ایک متحدہ فوج میں تبدیل نہیں ہونے دیا اور تمام ہندوستانی سردار اپنے اپنے منصوبوں کے مطابق علیحدہ علیحدہ زور آزمائی کرتے رہے۔

ان نامساعد حالات میں بھی رانی نے اپنی فوج کے سپاہیوں کا عزم اور حوصلہ قائم رکھا۔ وہ اپنی فوج لے کر کالپی سے 40 میل کے فاصلے پر واقع کچ گاؤں پہنچی۔ وہاں پھر رانی کی فوج اور

انگریزی کمانڈر سرہیوروز کی فوج کا آمنا سامنا ہوا۔ ایسے نازک موقعہ پر بھی دوسرے ہندوستانی سرداروں نے رانی کی مدد کے لیے اپنی فوجیں نہیں بھجوائیں۔ رانی نے اپنی فوج کے ساتھ ہی انگریزی فوج کا مقابلہ کیا لیکن اسے شکست ہوئی اور وہ اپنی بچی کچی فوج کے ساتھ پھر کالپی لوٹ گئی۔

پھر سرہیوروز نے کالپی پر حملہ کیا۔ اس جنگ میں بھی رانی اور اس کے سپاہیوں ہی نے سب سے زیادہ دلیری اور بہادری کا ثبوت دیا۔ رانی سب سے آگے گھوڑے پر سوار، اپنی فوج کا حوصلہ بڑھا رہی تھی اور اس کے سپاہی شجاعت اور دلیری سے انگریزی فوج کو بھاری نقصانات پہنچا رہے تھے۔ لڑائی کے دوران ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ انگریزی فوج کے داہنے حصے کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ انگریزی فوج کے توپچی بھاگ کھڑے ہوئے اور اس معرکے میں رانی کی قیادت ہی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ جب ہیوروز نے یہ منظر دیکھا تو وہ خود رانی سے مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ بہت گھمسان کا رن پڑا لیکن افسوس رانی لکشمی بائی کو پھر شکست کھانی پڑی۔

24 مئی کو انگریزی فوج کالپی میں داخل ہوئی تھی۔ اسلحہ کے بھاری ذخائر انگریزوں کے ہاتھ لگے تھے۔ اب رانی، راؤ صاحب اور باندہ کے نواب کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ کالپی سے کوچ کر کے کسی دوسرے محفوظ مقام کی طرف نکل جائیں۔ کالپی میں شکست کھانے کے بعد رانی اور دوسرے انقلابیوں کی فوجوں کے پاس نہ تو ہتھیار تھے اور نہ ان کے لیے رسد کا کوئی انتظام تھا۔ ان ہمت شکن حالات میں بھی رانی اور تاتیا ٹوپے نے اپنا عزم اور حوصلہ برقرار رکھا۔

تاتیا ٹوپے خفیہ طریقے سے گوالیر میں داخل ہوا۔ گوالیر کا راجا، جیاجی راؤ سیندھیا، انگریزوں کا حلیف تھا۔ اس کے باوجود تاتیا ٹوپے نے گوالیر کی فوج اور عوام کی اکثریت کو انقلابیوں کا حمایتی بنا لیا تھا۔ اس کارہائے نمایاں کو انجام دینے کے بعد تاتیا ٹوپے نے گوپال پور میں رانی لکشمی بائی، راؤ صاحب اور باندہ کے نواب سے ملاقات کی۔ رانی نے تمام انقلابی سرداروں کو مشورہ دیا کہ سب سے پہلے گوالیر کو فتح کرنا چاہیے تاکہ انقلابیوں کو پھر سے ایک نیا مرکز مل سکے۔ اس تجویز کو منظور کر لیا گیا اور تمام انقلابی سردار اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ گوالیر کے نواح

میں پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے مہاراجا سیندھیا کو ایک خط بھیجا جس کا متن یہ تھا:

> "ہم لوگ آپ کے پاس دوستانہ طریقے سے آرہے ہیں۔ آپ ہمارے (پیشوا) اور اپنے پرانے تعلقات کو یاد کیجیے۔ ہمیں آپ سے مدد کی امید ہے تاکہ ہم جنوب کی طرف بڑھ سکیں۔" (بحوالہ پنڈت سندرلال)

مہاراجا سیندھیا نے دوستی کی اس پیش کش کا جواب انقلابیوں پر فوج کشی کرکے دیا۔ یکم جون 1858 کو مہاراجا کی فوج انقلابیوں کی بچی کھچی فوج کے مقابلے کو نکلی۔ رانی لکشمی بائی نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے تین سو سپاہیوں کے ساتھ مہاراجا کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ تاہم مہاراجا سیندھیا کی فوج کی اکثریت نے پہلے ہی تاتیا ٹوپے سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ انقلابیوں کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا اور بیشتر فوج انقلابیوں سے مل گئی۔ جب مہاراجا اور اس کے وزیر دنکر راؤ نے یہ منظر دیکھا تو وہ میدان چھوڑ کر آگرہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح گوالیر پر انقلابیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس فتح میں رانی نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ گوالیر کو انقلابیوں کے لیے فتح کروانے میں تاتیا ٹوپے کی مساعی بھی قابلِ قدر تھی۔

گوالیر کی فتح، ظاہر ہے، خوشی کا باعث تھی لیکن رانی کی دوررس نگاہ اور فوجی قابلیت اسے یہ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی کہ انقلابی جدوجہد کی یہ آخری جنگ نہیں ہوسکتی۔ اسے پتہ تھا کہ انگریزی فوج اپنی پوری طاقت کے ساتھ گوالیر پر حملہ آور ہوگی۔ اس لیے رانی نے تمام انقلابی سرداروں کو مشورہ دیا کہ سب سے پہلے فوجی طاقت کو منظم کرکے اسے انگریزوں کے متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کا اہل بنایا جائے۔ لیکن افسوس انقلابی سرداروں نے اس کے مشورے کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور زیادہ تر وقت فتح کے جشن منانے میں گنوا دیا۔

رانی کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ سر ہیو روز نے مہاراجا سیندھیا کو اپنے ساتھ لے کر گوالیر پر حملہ کیا۔ تاتیا ٹوپے کی قیادت میں گوالیر کی فوج مقابلے کے لیے آگے بڑھی لیکن تھوڑی دیر ہی میں یہ اندازہ ہوگیا کہ انگریزی فوج کو شکست دینا آسان کام نہ ہوگا۔ گوالیر کی فوج کا حوصلہ پست ہونے لگا اور اس میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس خطرناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے رانی نے فوج کا حوصلہ بڑھانا شروع کیا۔ اس نے شہر کے مشرقی پھاٹک کے دفاع کی ذمہ داری اپنے ذمے لی۔ اس

معرکے میں اس کی دو سہیلیاں مندرا اور کاشی بھی اس کے شانہ بشانہ لڑ رہی تھیں۔ مشرقی پھاٹک کے مورچے پر رانی کا مقابلہ انگریزی فوج کے مشہور سپہ سالار جنرل اسمتھ (General Smith) سے تھا۔ اس نے کئی مرتبہ پھاٹک پر زبردست حملے کیے لیکن رانی نے ہر بار اسے پسپا کیا اور وہ مجبور ہو کر پیچھے ہٹتا رہا۔ پھر رانی نے پھاٹک سے نکل کر انگریزی فوج پر حملہ کیا اور دشمن کی فوج کے کئی سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 17 جون 1858 کو رانی صبح سے شام تک، گھوڑے پر سوار، مسلسل لڑتی رہی اور اپنی شجاعت اور ہمت سے جنرل اسمتھ کو کئی محاذوں پر شکست دیتی رہی۔

دوسرے دن جنرل اسمتھ ایک بھاری لشکر کے ساتھ مشرقی پھاٹک پر حملہ کرنے پہنچا۔ اسی کے ساتھ ہی انگریزی فوج نے چاروں جانب سے گوالیر کے قلعہ پر شدید حملہ کیا۔ سر ہیوروز بھی رانی کا مقابلہ کرنے جنرل اسمتھ کی مدد کر رہا تھا۔ رانی مردانہ پوشاک پہنے، اپنی سہیلیوں کے ساتھ مقابلے کے لیے ڈٹی ہوئی تھی۔ ایک چشم دید بیان کے مطابق:

> "سر ہیوروز کی فوج کے مقابلے میں اس (رانی) نے مضبوطی کے ساتھ اپنی فوج کو کھڑا کیا۔ بار ہا اس نے زبردست تیزی کے ساتھ سر ہیوروز کی فوج پر حملہ کیا۔ رانی کا دستہ کئی مقامات پر دشمن کے گولوں کا شکار ہو گیا۔ اس کے فوجیوں کی تعداد لگاتار کم ہوتی چلی گئی۔ پھر بھی رانی ہمیشہ سب سے آگے دکھائی دیتی تھی۔ وہ بار بار اپنی بکھری ہوئی فوج کو جمع کرتی رہی اور قدم قدم پر غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیتی رہی۔"
>
> (بحوالہ پنڈت سندر لال)

تاہم دوسرے محاذوں پر انقلابیوں کے قدم اکھڑتے گئے اور بالآخر انگریزی فوج انقلابیوں کی فوج کو چیرتی ہوئی پیچھے سے رانی کے دستے پر حملہ آور ہوئی۔ اب رانی چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر گئی۔ اس کے ساتھ اس وقت اس کی دونوں سہیلیوں کے علاوہ پندرہ یا بیس جانباز سپاہی تھے۔ رانی نے اپنے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور اسے سرپٹ دوڑاتے ہوئے انگریزی فوج کو چیر کر انقلابیوں کی فوج سے ملنا چاہا۔ انگریز سواروں نے اس کا پیچھا کیا۔ اسی وقت ایک گولی اس کی سہیلی مندرا کے آ کر لگی۔ وہ وہیں ختم ہو گئی۔ رانی نے پلٹ کر تلوار سے اس انگریز پر حملہ کیا جس نے مندرا کو گولی کا نشانہ بنایا تھا اور ایک ہی وار میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ رانی نے

پھر اپنے گھوڑے کو سرپٹ چھوڑ دیا اور انگریزی فوج کے نرغے سے باہر چلی گئی۔ اب اس کے سامنے سورن ریکھا نہر تھی۔ اگر گھوڑا صحیح وقت پر چھلانگ لگا کر نہر پار کر لیتا تو انگریز سوار رانی کا تعاقب کرنے میں ناکام رہتے۔ لیکن افسوس اس دن رانی ایک نئے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار تھی۔ گوالیر کی جنگ کے دوران میں اسے کئی گھوڑے بدلنے پڑے تھے۔ نیا گھوڑا چھلانگ نہ لگا سکا اور انگریز سواروں نے چاروں طرف سے رانی کو گھیر لیا۔

اب رانی بالکل اکیلی تھی اور اس کا مقابلہ دس بارہ انگریز سواروں سے تھا۔ ایک انگریز نے پیچھے سے رانی کے سر پر کڑا وار کیا جس کے سبب اس کے سر کا داہنا حصہ الگ ہو گیا اور داہنی آنکھ بھی باہر نکل آئی۔ اتنی زخمی حالت میں بھی تلوار چلاتی رہی۔ پھر ایک وار اس کی چھاتی پر ہوا۔ اب رانی تقریباً بے ہوش ہو رہی تھی پھر بھی اس نے اس انگریز کا سر تن سے جدا کر دیا جس نے اس کی چھاتی پر وار کیا تھا۔ اس اثنا میں رانی کا محافظ گل محمد، رگھوناتھ سنہا اور رام چندر راؤ دیشکھ وہاں پہنچ گئے۔ گل محمد نے جب دم توڑتی ہوئی رانی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ تینوں نے مل کر رانی کو گھوڑے سے اتارا۔ رگھوناتھ سنہا کے ایما پر رانی کو بابا گنگا داس کو کٹیا میں لے جایا گیا جو قریب ہی واقع تھی۔ اندھیرے میں بھی بابا نے رانی کا زخمی چہرہ پہچان لیا۔ اس نے ٹھنڈے پانی سے رانی کے چہرے کو دھویا۔ پھر مقدس گنگا جل کے قطرے رانی کے منہ میں ٹپکائے گئے۔ رانی کو ایک لمحے کے لیے قرار آیا اور اس نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "ہر ہر مہادیو"۔ وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور گیتا کے شلوک پڑھنے لگی لیکن آواز بہت کمزور تھی۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ "واسودیو! میں تجھے سجدہ کرتی ہوں۔" پھر اس نے دم توڑ دیا۔ گل محمد، رگھوناتھ سنہا، رام چندر راؤ دیشکھ اور رانی کے متبنّیٰ بیٹے دامودر راؤ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ گنگا داس بابا کی کٹیا ہی میں رانی کے جسدِ خاکی کو خفیہ طور پر نذرِ آتش کیا گیا۔

رانی لکشمی بائی نے اپنی مختصر زندگی میں اپنی شجاعت اور وطن پرستی کے ذریعے یہ ثابت کر دکھایا کہ دلیری، فوجی قابلیت اور اپنے اصولوں کی خاطر جان دینے جیسے معاملات میں خواتین کسی بھی طرح مردوں سے کمتر نہیں ہیں۔ رانی کی پوری زندگی ایک مقدس شلوک کی طرح تھی۔ وہ ایک دلیر

فوجی سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مدبّر سیاست داں اور ایک قابل حکمراں بھی تھی۔

عصری ہندوستان میں رانی کا نام شجاعت اور وطن پرستی کا استعارہ ہے۔ لیکن اس کی ذات میں ان کے علاوہ بھی بہت سی دوسری خوبیاں تھیں۔ اپنی مختصر زندگی میں اس نے مختلف مذاہب اور مختلف ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں کو نہ صرف وطن پرستی کے جذبے سے سرشار کیا بلکہ انھیں متحد کر کے بیرونی حکمرانوں کے ناپاک شکنجہ سے ملک کو آزاد کرانے کی ترغیب بھی دی۔

ایک ایسے دور میں جب کہ نہ صرف مسلم خواتین بلکہ اعلا طبقے سے تعلق رکھنے والی ہندو خواتین بھی پردہ کی سخت پابندی کرتی تھیں، رانی نے خود کو پردے کی جکڑ بندی سے آزاد کیا۔ وہ صرف انگریزوں کے سامنے پردہ کرتی تھی۔ اس طرح اس نے اپنی سہیلیوں اور جھانسی کی عام خواتین کو یہ درس بھی دیا کہ ایک عورت بھی ہر وہ کام بخوبی کر سکتی ہے جو روایتی طور پر مردوں کے لیے مختص ہے۔ اسی سبب اس کی فوج میں خواتین بھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ رانی لکشمی بائی نے اپنے وقت کے مروّجہ سماجی اقدار سے انحراف کرتے ہوئے ایک ترقی پسند اور جہد و عمل میں ایقان رکھنے والی عورت کا تصور پیش کیا تھا۔ ان معنوں میں وہ نہ صرف ایک جری اور بہادر محبِ وطن خاتون تھی بلکہ عورتوں کے حقوق کی اوّلین اور سب سے اہم علم بردار بھی تھی۔

حوالہ جاتی کتب:

1. History of the Indian Mutiny by T. Rice Holmes.
2. British Rule in India by Pandit Sunderlal.
3. Empire in India by Major Evans Bell.
4. History of the Sepoy War by T. Rice Holmes.
5. History of the Sepoy War by Sir John Kaye

ظہیر علی

ناناصاحب

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں ڈھونڈو پنت عرف ناناصاحب پیشوا کے رول پر اظہار خیال کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پیشوا باجی راؤ دوم کے بارے میں مختصراً پیرایے میں بنیادی حقائق پر روشنی ڈالی جائے۔

باجی راؤ دوم، پیشوا رگھوناتھ راؤ کا بیٹا تھا، رگھوناتھ راؤ، اپنے بھتیجے، پیشوا مادھوراؤ نارائن کے قائم مقام تھے۔ مادھوراؤ نے 1796 میں خودکشی کرلی تھی۔ ان کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ اس صورت حال میں نانافرنویس کی مساعی کے سبب باجی راؤ دوم کو پیشوا بنایا گیا۔ تاہم باجی راؤ دوم بحیثیت پیشوا بہت ناکام ثابت ہوا۔ اکثر مورخین کا خیال ہے کہ مراٹھا سلطنت کے زوال کی زیادہ تر ذمے داری اسی کے سر جاتی ہے۔ مشہور مصنف منوہر مالگاؤنکر اپنی کتاب The Devil's Wind (شیطانی ہوا) میں باجی راؤ دوم کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''صرف ایک بدبخت اور ناکارہ شخص ہی اپنے انتہائی عظیم اور وسیع ورثے کو اتنے کم وقت میں برباد کرنے میں یا اپنے خاندان کے نام کو بری طرح بدنام کرنے میں، کامیاب ہوسکتا تھا۔ وہ ایک کم ظرف، ظالم، کینہ پرور اور لالچی لیکن حیرت انگیز طور پر بہت پڑھا لکھا شخص تھا۔ مال و متاع کی سودے بازی میں وہ بہت ہشیار تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ اخلاقی اور جسمانی اعتبار سے ایک بزدل شخص تھا۔ وہ واحد پیشوا گزرا ہے جو اس کی رعایا کی نظروں میں قابل نفرت تھا۔ اس کے تعلق سے ایک مقبول عام گیت کے چند بول یوں ہیں:

ہم نے کنواں خالی کردیا
اور دھرتی کو پیاسا کردیا
تا کہ ایک کانٹوں بھرا درخت اُگ آئیں،
"بھگوڑا باجی راؤ"

1800 میں نانا فرنویس کے انتقال کے بعد اندور کے یشونت راؤ ہولکر اور گوالیر کے دولت راؤ سیندھیا کے مابین، مراٹھا سلطنت پر اقتدار حاصل کرنے کی رسہ کشی شروع ہوئی۔ اس کے نہایت منفی اثرات، مراٹھوں کی راجدھانی، پونے پر بھی مرتب ہوئے جہاں پیشوائی کا مرکز تھا۔ بالآخر 1802 میں اندور کے ہولکر اقتدار پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے۔ نتیجتاً باجی راؤ دوم انگریزوں کی مدد حاصل کرنے ممبئی کو فرار ہو گیا۔ انگریز تو ایسے ہی موقع کی تاک میں تھے کہ کسی طرح مراٹھا اقتدار کا خاتمہ کرسکیں۔ باجی راؤ دوم نے دسمبر 1802 میں انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا جسے تاریخ میں معاہدۂ بسین (وسی) کہا جاتا ہے۔ معاہدہ کی رو سے انگریزوں نے باجی راؤ دوم کو پھر سے پیشوا کی گدی پر بٹھانے کی ذمے داری قبول کر لی۔ بدلے میں باجی راؤ دوم نے نہ صرف مراٹھا علاقے میں انگریزی فوج کے مستقل قیام کی منظوری دی بلکہ اس فوج کے تمام اخراجات کی ذمے داری بھی قبول کی۔ باجی راؤ نے اس بات کو بھی قبول کیا کہ پونے میں انگریزوں کا ریذیڈنٹ رہا کرے گا۔ اس بدبخت اور ہتک آمیز معاہدے کے پیش نظر ہولکر اور سیندھیا نے مراٹھا علاقوں میں انگریزوں کی مداخلت کے خلاف متحدہ محاذ کھڑا کیا۔ اس کا نتیجہ دوسری اینگلو۔ مراٹھا جنگ کی صورت میں نمودار ہوا جو 1802 سے 1805 تک جاری رہی۔ جنگ میں انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور مراٹھوں کے بہت سے علاقے انگریزوں کے قبضے میں چلے گئے۔ تاہم مراٹھوں نے گوریلا جنگ جاری رکھی۔ مراٹھوں کی بے قاعدہ فوج جو پنڈاریوں پر مشتمل تھی انگریزی علاقوں پر حملے کر کے بھاری نقصان پہنچاتی رہی۔ اس کے ردِ عمل میں 1817 میں تیسری اینگلو۔ مراٹھا جنگ شروع ہوئی جو ایک سال تک جاری رہی۔ اس جنگ میں سیندھیا اور دوسرے مراٹھا سرداروں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

تیسری اینگلو۔مراٹھا جنگ کے دوران پونے میں باجی راؤ دوم اور انگریز ریذیڈنٹ کے درمیان اختلافات نمودار ہوئے۔ چنانچہ 15 نومبر 1817 کو ریذیڈنٹ کی فوج نے باجی راؤ کے محافظوں پر اچانک حملہ کردیا۔ محافظوں نے بھی مقابلہ کیا اور اچھی خاصی لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ لڑائی پونے شہر میں واقع پروتی پہاڑ کے قریب ہوئی تھی اور تاریخ میں اسے کرکی کی لڑائی کہا جاتا ہے۔ باجی راؤ میدان جنگ سے فرار ہوگیا تھا۔ پانچ مہینوں تک ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھاگتے رہنے کے بعد باجی راؤ نے خود کو سر جان مالکم (Sir John Malcom) کے حوالے کردیا۔ اس وقت کمپنی کا گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگ تھا جو باجی راؤ کے خلاف سختی سے پیش آنا چاہتا تھا۔ تاہم سر مالکم اسے زندگی بھر کے لیے برائے نام حکمراں رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے باجی راؤ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا اس کی ذاتی جائیداد ضبط نہیں کی جائے گی اور انگریزوں کی جانب سے اسے سالانہ ایک ہزار پونڈ کا وظیفہ ملتا رہے گا۔ ان عنایات کے عوض باجی راؤ دوم کو ہمیشہ کے لیے پونے کو خیرباد کہہ کر انگریزوں کے متعین کیے ہوئے کسی مقام پر زندگی گزارنی پڑے گی۔ اسے اپنی وراثت کے تمام اختیارات کو چھوڑنا ہوگا اور وہ خود کو پیشوا بھی نہیں کہلوائے گا۔ البتہ انگریزوں نے اسے اس بات کی اجازت دی تھی کہ اگر وہ چاہے تو خود کو مہاراجا کہلوا سکتا ہے۔ لارڈ ہیسٹنگ تو باجی راؤ سے کسی قسم کا معاہدہ کرنے کے حق میں ہی نہیں تھا لیکن سر مالکم نے اسے یہ کہہ کر معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے راضی کرلیا کہ باجی راؤ کے عیاشانہ طرز زندگی کو دیکھتے ہوئے وہ بہت دنوں تک زندہ نہیں رہے گا۔ اس کا خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ باجی راؤ دوم مزید 33 برسوں تک ایک ذلت آمیز زندگی گزارتا رہا۔

باجی راؤ کو اپنی کڑی نگرانی میں رکھنے کے لیے انگریزوں نے گنگا کے کنارے اور کانپور کے قریب واقع ایک چھوٹے سے گاؤں بٹھور کو منتخب کیا تھا۔ اس گاؤں کے نواح میں انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ بٹھور کا پورا رقبہ چھ مربع میل پر مشتمل تھا جہاں باجی راؤ کو اپنے پندرہ ہزار رشتہ داروں اور امرا کے ساتھ رہنا تھا۔ اس طرح 1817 میں باجی راؤ کو بٹھور منتقل کردیا گیا۔ 1851 میں باجی راؤ دوم کا انتقال ہوا۔

مراٹھوں کے آخری پیشوا، نانا صاحب باجی راؤ دوم کے متبنیٰ بیٹے تھے۔ ان کا اصلی نام گوبند ڈھونڈو پنت تھا۔ باجی راؤ دوم کے انتقال کے بعد کمپنی نے ''لپس کی پالیسی'' کے تحت نانا صاحب کو باجی راؤ کا جانشین ماننے سے انکار کر دیا اور نہ صرف ان کا وظیفہ بند کر دیا گیا بلکہ ان سے وہ تمام بے سود اور فضول القاب بھی چھین لیے گئے جنھیں استعمال کرنے کی اجازت باجی راؤ دوم کو تھی۔ نانا صاحب نے اپنے وظیفے کی بحالی اور خود کو باجی راؤ کا وارث ثابت کرنے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ کمپنی کے ارباب اختیار کے نام عرضداشتیں بھیجیں۔ نانا صاحب کا سکریٹری، عظیم اللہ خاں، انتہائی قابل شخص تھا۔ وہ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ نانا صاحب کے ساتھ ان کے دو بھائیوں، بالا صاحب اور بابا صاحب، ان کے بھتیجے راؤ صاحب اور ان کے سکریٹری، عظیم اللہ خان نے بھی پہلی جنگ آزادی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

نانا صاحب کے ساتھ کمپنی کی ناانصافی کی وجہ سے بھی وسطی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ انگریزوں سے نانا صاحب کے تعلقات کبھی بھی ناخوشگوار نہیں رہے تھے اور اس بات کا اعتراف خود انگریز مورخ کرتے ہیں۔ چنانچہ سر جان کے (Sir John Kaye) اپنی مشہور کتاب 'ہسٹری آف دی سپائز' (History of the Sepoys) میں لکھتا ہے: ''نانا صلح کن، صاف اور سچا نوجوان تھا۔ اس میں کوئی بھی بری عادت نہیں تھی اور وہ انگریز کمشنر کی صلاح پر کام کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔'' اس طرز عمل کے باوجود لارڈ ڈلہوزی نے باجی راؤ دوم کے انتقال کے ساتھ ہی نانا صاحب کو وظیفہ دینا بند کر دیا تھا۔ جب ہندوستان میں مقیم کمپنی کے ارباب اختیار نے نانا صاحب کی عرضداشتوں کو رد کر دیا تو انھوں نے اپنے قابل سکریٹری، عظیم اللہ خاں، کو انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ برطانوی حکومت سے انصاف کی اپیل کی جائے۔ برطانوی حکومت نے بھی نانا صاحب کی اپیل کو مسترد کر دیا۔ برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران عظیم اللہ خان کی ملاقات ستارا کے راجا کے وکیل رنگو باپوجی سے ہوئی۔ دونوں وکلا کی اپیلیں مسترد ہونے کے بعد دونوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے

جذبات نے شدت اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے آپس میں صلاح ومشورہ کیا اور اس بات پر متفق ہوئے کہ وقت کے تقاضے کے مطابق انگریزوں کے خلاف مسلح جدو جہد شروع کرنی چاہیے۔ پلان کے مطابق رنگو باپو جی تو ہندوستان واپس آ گئے تا کہ جنوبی ہند کے راجاؤں کو انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی ترغیب دیں جبکہ عظیم اللہ خان یورپ کے دورے پر روانہ ہوئے تا کہ انگریز مخالف یورپی ممالک سے ہندوستانی حریت پسندوں کے لیے مدد حاصل کی جاسکے۔

عظیم اللہ خان ایک قابل شخص ہونے کے علاوہ ایک وجیہہ اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے لندن کی اعلا سوسائٹی میں تعلقات قائم کر لیے تھے۔ لندن کے مشہور اخبار، ٹائمز، کے نمائندے رسل (Russell) نے ماسکو میں عظیم اللہ خان سے ملاقات کی تھی۔ ان دنوں روس اور برطانیہ میں جنگ جاری تھی اور عظیم اللہ خان اس غرض سے روس گئے تھے کہ روس اور نانا صاحب کے درمیان انگریزوں کے خلاف معاہدہ کرسکیں۔ رسل نے عظیم اللہ خان کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن جب انگریزوں اور روسیوں کے درمیان آتشی اسلحہ کی جنگ جاری تھی تو ایک بم تقریباً عظیم اللہ خان کے پیروں کے قریب ہی آکر پھٹا تھا۔ لیکن عظیم اللہ خان نہ تو گھبرائے اور نہ ہی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹے۔

روس کے علاوہ عظیم اللہ خان اٹلی، ترکی اور مصر بھی گئے تھے انگریزوں کے خلاف مدد حاصل کرنے کی بہت کوششیں کی تھیں۔ لیکن انھیں اپنے مشن میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اپنے مقدمے کی ناکامی کے سبب نانا صاحب بھی انگریزوں کے سخت مخالف بن گئے تھے اور انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ وہ مسلح جدوجہد کے ذریعے اپنے ملک کو انگریزوں کے استبداد سے آزاد کرائیں گے۔

لہٰذا جب 1857 میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کی شروعات ہوئی تو نانا صاحب نے کانپور کے مورچے پر انقلابیوں کی قیادت کرکے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ کانپور کے علاوہ بریلی اور گورکھپور کے محاذوں پر بھی نانا صاحب اور ان کے انقلابی ساتھیوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔

انگریزی تسلط سے دہلی کے آزاد ہونے کی خبر نانا صاحب کو 15 مئی 1857 کو ملی تھی۔ اس وقت کانپور میں سر ہیو میسی وہیلر (Sir Hugh Massy Wheeler) انگریزی فوج کا سپہ سالار تھا۔ دہلی کی آزادی کی خبر ملتے ہی کانپور شہر میں ہندوستانیوں نے جشن منانا شروع کر دیا تھا۔ انگریزی فوج میں جو ہندوستانی سپاہی شامل تھے وہ بھی بہت خوش تھے اور آپس میں خفیہ میٹنگیں کر رہے تھے۔ تاہم نانا صاحب نے اپنی طرف سے فوری طور پر کسی بھی طرح کا ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ 31 مئی کا انتظار کر رہے تھے کیونکہ خفیہ منصوبے کے مطابق کانپور میں 31 مئی ہی کو جنگِ آزادی کی شروعات ہونا طے پایا تھا۔ سر ہیو وہیلر نے گنگا کے جنوب میں ایک نیا قلعہ تعمیر کروایا تھا تاکہ مصیبت کے وقت انگریز سپاہی اور دوسرے افراد اس میں پناہ لے سکیں۔

انگریزوں کو بھروسا تھا کہ نانا صاحب ہر وقت ان کی مدد کریں گے۔ وہیلر نے ان سے مدد کی درخواست کی۔ نانا صاحب بھی انگریزوں کو یہی باور کرانا چاہتے تھے کہ وہ انقلابیوں کے ساتھ نہیں ہیں۔ چنانچہ 22 مئی 1857 کو نانا صاحب اپنی فوج اور توپوں سمیت کانپور شہر میں داخل ہوئے۔ سر وہیلر نے کمپنی کا خزانہ اور میگزین نانا صاحب کی تحویل میں دے دیا۔ انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی نانا صاحب کو ہی اپنا اصلی حکمران سمجھتے تھے۔ ان ہندوستانی سپاہیوں میں چار خاص اور قابلِ اعتبار رہنما تھے جو مسلسل نانا صاحب اور ان کے سکریٹری، عظیم اللہ خاں سے رابطہ قائم رکھے ہوئے تھے۔ ان کے نام صوبیدار ٹیکا سنگھ، صوبیدار شمس الدین خان، جوالا پرشاد اور محمد علی تھے۔

خفیہ میٹنگوں میں یہ طے پایا کہ 4 جون کو کانپور میں جنگِ آزادی شروع کی جائے گی۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر، یعنی آدھی رات کو کانپور کی چھاؤنی میں اچانک تین فائر ہوئے۔ یہ ہندوستانی سپاہیوں کے لیے ایک اشارہ تھا کہ جنگ کی ابتدا ہو چکی ہے۔ اشارہ ملتے ہی صوبیدار ٹیکا سنگھ ہندوستانیوں کی قیادت کرتا ہوا شہری حدود میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ سیکڑوں ہندوستانی سپاہی تھے۔ منصوبے کے مطابق سپاہیوں نے انگریزی عمارتوں کو آگ لگا دی، انگریزی جھنڈوں کو نوچ کر پھینک دیا اور ان کی جگہ مغل شہنشاہ، بہادر شاہ ظفر کے ہرے جھنڈے لہرا دیے۔ اس وقت tt

صاحب اپنے کیمپ، نواب گنج، میں موجود تھے۔ ان کے سپاہی انقلابیوں سے مل گئے اور صبح ہونے تک یعنی 5 جون کو، کانپور شہر پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا۔ ہندوستانی فوج اور کانپور کے شہریوں نے متفقہ طور پر یہ اعلان کیا کہ نانا صاحب، شہنشاہ ظفر کے حقیقی نمائندہ ہیں اور انھیں راجا تسلیم کر لیا گیا۔

دوسرے دن سر وہیلر کے تعمیر کردہ نئے قلعہ کا محاصرہ شروع ہوا جس کے اندر انگریز سپاہی اور دوسرے انگریز افراد پناہ گزین تھے۔ نانا صاحب نے سر وہیلر کو پیغام بھیجا کہ وہ قلعہ انقلابیوں کے حوالے کردے ورنہ شام کو اس پر دھاوا بول دیا جائے گا۔ وہیلر نے اس وارننگ کی پروا نہ کی اور قلعہ پر اپنا قبضہ قائم رکھا۔ نتیجتاً 6 جون کی شام کو نانا صاحب کی توپوں نے قلعہ کے اندر گولے برسانے شروع کیے۔ مسلسل گولہ باری سے انگریزوں کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ وہیلر نے اپنے ایک وفادار ہندوستانی کے ذریعے لکھنؤ کی چھاؤنی کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔

اس اثنا میں نانا صاحب نے کانپور شہر کا تمام انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ معزز شہریوں سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد انھوں نے بلاس سنگھ نامی ایک شخص کو خاص جج کے عہدے پر نامزد کیا۔ فوج کو رسد پہنچانے کی ذمے داری ملاّ نامی ایک شخص کو سونپی گئی۔ دیوانی مقدموں پر فیصلہ صادر کرنے کے لیے جوالا پرشاد، عظیم اللہ خاں اور بابا صاحب پر مشتمل ایک عدالت قائم کی گئی۔

اُدھر ہندوستانی فوج نے قلعہ کا محاصرہ جاری رکھا اور قلعہ کے اندر گولے برساتی رہی۔ 18 جون اور 23 جون کو شدید بمباری کے بعد انگریزوں کی مدافعت نے دم توڑ دیا اور بالآخر وہیلر نے قلعہ پر صلح کا سفید پرچم لہرا دیا۔ نانا صاحب نے لڑائی بند کرنے کا حکم دیا اور ایک خط سر وہیلر کو بھیجا جس کا متن یہ تھا:

> "ملکہ وکٹوریہ کی رعایا کے نام۔ جن لوگوں کا لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا ہے جو ہتھیار رکھ دینے اور اپنے آپ کو حوالے کر دینے کے لیے تیار ہیں انھیں حفاظت کے ساتھ الہ آباد پہنچا دیا جائے گا۔" (بحوالہ پنڈت سندرلال)

سر وہیلر کے پاس نانا صاحب کی شرائط ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ 26 جون کو دونوں طرف کے نمائندوں میں بات چیت ہوئی اور وہیلر نے نانا کی شرائط کو قبول کر لیا جن کی رو

سے قلعہ میں محصور تمام انگریزوں نے خود کو نانا صاحب کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی قلعہ کا توپ خانہ، تمام ہتھیار اور خزانہ بھی نانا صاحب کے حوالے کر دیے گئے۔ نانا صاحب نے انگریزوں سے وعدہ کیا کہ ان تمام کو کشتیوں کے ذریعے اور خاطر خواہ رسد کے ساتھ الٰہ آباد بھیج دیا جائے گا۔

اُسی رات نانا صاحب نے چالیس کشتیوں کا انتظام کر دیا اور ان میں رسد بھی رکھوا دی گئی تھی۔ نانا کے ساتھی انگریزوں کو ہاتھیوں اور پالکیوں میں بٹھا کر قلعہ سے ڈیڑھ میل دور ستی چورا گھاٹ لے گئے اور وہاں انھیں کشتیوں میں سوار کرا دیا۔ انگریز اپنی متوقع آزادی پر نانا صاحب کے شکر گزار تھے لیکن جلد ہی ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ادھر الٰہ آباد پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو جانے کے بعد وہاں ہندوستانی عوام کے خلاف ظلم اور بربریت کے جو واقعات ہوئے تھے ان کی بھنک کانپور کے شہریوں کو مل گئی تھی۔ علاوہ ازیں الٰہ آباد سے لٹے پٹے ہندوستانی افراد بھی کانپور میں وارد ہونے لگے تھے۔ انھی لوگوں کی زبانی انگریزی فوج کے کالے کرتوتوں اور انسانیت سوز حرکتوں کی تفصیل کانپور کے عوام تک پہنچی تھی۔ ظلم اور بربریت کے ان واقعات کو سن کر کانپور کے عوام اور ہندوستانی سپاہیوں میں غم و غصے کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔

پروگرام کے مطابق 27 جون کو صبح دس بجے کشتیاں انگریزوں کو لے کر ستی چورا گھاٹ سے روانہ ہونے والی تھیں۔ کانپور کے بپھرے ہوئے شہری اور ہندوستانی سپاہی گھاٹ پر پہنچ گئے اور وہاں کشتیوں پر سوار انگریزوں پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ بہت سارے انگریز تو گولیوں کی پہلی باڑھ ہی میں ختم ہو گئے تھے۔ کچھ انگریزوں کے پاس بندوقیں تھیں۔ انھوں نے جوابی فائر کیے لیکن بہت جلد وہ بھی ختم کر دیے گئے۔

تقریباً تمام مورخ، بشمول انگریز مورخوں کے، اس بات کو قبول کرتے ہیں کہ ستی چورا گھاٹ کے قتل عام میں نانا صاحب کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ جیسے ہی نانا صاحب کو اس واقعہ کی خبر ملی تھی انھوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ صرف انگریز مردوں کو قتل کیا جائے لیکن عورتوں اور بچوں کو گزند نہ پہنچائی جائے۔ پیغام ملنے کے بعد ہندوستانیوں نے صرف انگریز مردوں کو قتل کیا جن میں سر وہیلر بھی شامل تھا۔ تقریباً ایک سو پچیس انگریز عورتیں اور بچے قید کر لیے گئے۔ بعد ازاں، نانا صاحب

کے حکم پر انھیں بی بی گھر منتقل کر دیا گیا تھا۔ بی بی گھر نانا صاحب کی ذاتی ملکیت تھی۔ یہ ایک بہت بڑا گھر تھا تاہم اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ اس میں دو سو سے زائد عورتوں اور بچوں کی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا۔ انگریز عورتوں اور بچوں کی تعداد میں یہ اضافہ یوں ہوا تھا کہ ہندوستانی انقلابیوں نے کانپور کے اردگرد کے علاقوں پر دھاوا بول کر وہاں کے انگریز مردوں کو قتل کر دیا تھا اور تقریباً 180 انگریز عورتیں اور بچے گرفتار کر کے بی بی گھر پہنچائے گئے تھے۔

بی بی گھر میں مقید انگریز عورتوں اور بچوں کے ساتھ نانا صاحب کا سلوک انتہائی مناسب اور رحم دلانہ تھا۔ ان کے بارے میں اس وقت انگریز عہدے داروں نے بہت سی جھوٹی باتیں پھیلائی تھیں کہ نانا صاحب نے انگریز عورتوں اور بچوں پر بہت ظلم کیے تھے۔ یہ سب افواہیں تھیں جن کی تردید خود انگریزوں کے ایک کمیشن کی رپورٹ سے ہوتی ہے جو بی بی گھر کے بدبخت واقعہ کی تحقیقات کرنے کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ اس کمیشن سے منسلک جسٹس میکارتھی، نانا صاحب کے خلاف پھیلائی گئی افواہوں کے تعلق سے لکھتا ہے:

> ''لوگوں کے غصے کی آگ کو اس طرح کی افواہیں اڑا اڑا کر بھڑکایا گیا کہ عام طور پر عورتوں کی بے عزتی کی گئی اور بے رحمی کے ساتھ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے۔ خوش قسمتی سے یہ افواہیں جھوٹی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ سوائے ان سے غلط برتاؤ کرنے کے اور کسی طرح کی بے عزتی انگریز عورتوں کی نہیں کی گئی۔ عام معنوں میں کسی عورت پر زیادتی نہیں کی گئی۔ نہ کسی انگریز عورت کے کپڑے اتارے گئے، نہ کسی کی بے عزتی کی گئی اور نہ جان بوجھ کر کسی کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔'' (بحوالہ پنڈت سندر لال)

بی بی گھر میں محصور انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل عام کا سانحہ بھی عوام اور ہندوستانی سپاہیوں کے غم و غصے کا نتیجہ تھا۔ انگریز فوجی کمانڈروں مثلاً نیل (Neill) اور ہیولاک نے الٰہ آباد اور اودھ میں عام ہندوستانیوں پر جن مظالم کا پہاڑ توڑا تھا ان کی تفصیل کسی بھی ہندوستانی کا خون کھولانے کے لیے کافی تھی۔ الٰہ آباد کی مہم میں شامل ایک انگریز اینڈریو وارڈ (Andrew Ward) نے اپنی کتاب ''ہماری ہڈیاں بکھری پڑی ہیں، (Our Bones Are Scattered) میں لکھا ہے کہ جنرل نیل نے ہندوستانیوں سے انتقام لینے کے لیے خاص

کمشنروں کو نامزد کیا تھا جن میں ایک سفاک اور اذیت پسند غیر فوجی شخص بھی شامل تھا۔ اس شخص نے 26 جون 1857 کو ببانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ اس کے ہاتھوں میں ہندوستانیوں کی زندگی اور موت کا اختیار ہے اور اس نے انگریزوں سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ کسی ہندوستانی کو نہیں بخشے گا۔ سولی دینے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک بیل گاڑی پر کسی ہندوستانی کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر اس کے دوسرے سرے کو پیڑ کی شاخ سے باندھ دیا جاتا تھا۔ گاڑی کے ہٹائے جانے پر بد قسمت ہندوستانی پھانسی پر لٹک جاتا تھا۔

ظلم اور اذیت کے اور بھی کئی طریقے اپنائے گئے تھے۔ ہندوستانیوں کو ان کے خاندان کے افراد کے سامنے بے دردی سے زدو کوب کرنا اور بعد ازاں انھیں گولی سے اڑا دینا بھی انگریز سپاہیوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ان وحشی فوجیوں کو اس بات میں مسرت ملتی تھی کہ ہندوستانی خواتین ان کے سامنے گڑگڑائیں، ان کے پیروں پر اپنے سر رکھ کر اپنے شوہروں یا بیٹوں کی زندگیوں کی بھیک مانگیں۔ اس کے باوجود وہ ہندوستانی مردوں کو بخشتے نہیں تھے بلکہ ہندوستانی خواتین کو ٹھوکریں مار مار کر بے ہوش کر دیتے تھے۔

ان مظالم کی خبریں کانپور میں لگاتار آ رہی تھیں اور کانپور کا تقریباً ہر شہری انگریزوں کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔ لہٰذا بی بی گھر میں مقید انگریز عورتوں اور بچوں پر بھی ایسے ہی ہندوستانی سپاہیوں نے گولیاں چلائی تھیں جو انگریزوں سے انتقام لینے کے لیے بے چین تھے۔ نہ تو tt صاحب نے اس قتل عام کا حکم دیا تھا اور نہ ان کے کسی قریبی ساتھی نے۔ بہر کیف غصے سے بپھرے ہوئے ہندوستانیوں نے 15 جولائی کو بی بی گھر پر دھاوا بولا اور تمام انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ بی بی گھر کا قتل عام ہندوستانیوں کی بربریت کی بدترین مثال تھا تاہم ہمیں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ نتیجہ تھا ان انسانیت سوز مظالم کا جو انگریزی فوج کے اٹھترویں ہائی لینڈرز 78th Highlanders دستے اور اس کے کمانڈروں، یعنی ہیولاک اور نیل نے عام بے گناہ ہندوستانیوں پر کیے تھے۔

نانا صاحب کی قیادت میں انقلابیوں نے کانپور اور اس کے اطراف کے چھوٹے

موئے شہروں اور گاؤں سے انگریزی تسلط کے تمام نام و نشان مٹا دیے تھے۔ 28 جون 1857 کو نانا صاحب نے اپنا دربار منعقد کیا تھا۔ اس دربار میں تمام انقلابی فوجیوں کے علاوہ بہت سے زمینداروں اور عوام کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ دربار میں نانا صاحب نے ہندوستانی سپاہیوں اور کانپور کے شہریوں کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے نام پر ایک سو ایک توپوں کی سلامی دی گئی اور ایک لاکھ روپے بطور انعام فوجیوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔ دربار کے اختتام پر نانا صاحب بٹھور کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ وہاں یکم جولائی کو نانا صاحب ڈھونڈو پنت کو باضابطہ پیشوائی کی گدی پر بٹھائے جانے کی رسم ادا کی گئی تھی۔

کانپور میں انگریزی فوج کی شکست کی خبر جب الہٰ آباد پہنچی تو جنرل نیل نے ایک بڑی فوج میجر رنارڈ کی قیادت میں کانپور کی طرف روانہ کی۔ اس فوج نے کانپور کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے راستے کے دونوں جانب کے گاؤں کو مسمار کر ڈالا تھا اور بے گناہ گاؤں کے لوگوں کو پھانسیوں پر لٹکا دیا تھا۔ بعد ازاں جنرل ہیولاک بھی اپنے انگریز اور سکھ سپاہیوں کو لے کر کانپور کے لیے روانہ ہوا اور بہت جلد رنارڈ کی فوج سے جا ملا۔ راستے کے تمام گاؤں کو نذر آتش کرنے اور ہندوستانی عوام کا قتل عام کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ انگریزی فوج کے مظالم اور بے رحمی کے واقعات سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک انگریز مورخ سر چارلس ڈلک لکھتا ہے:

> "1857 میں جو خط انگلستان پہنچے ان میں ایک اونچے درجے کا افسر، جو کانپور کی طرف انگریزی فوج کی کوچ میں ساتھ تھا، لکھتا ہے کہ "میں نے آج کی تاریخ میں خوب شکار مارا۔ باغیوں کو اڑا دیا" یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کو اس طرح پھانسی دی گئی یا توپ سے اڑا دیا گیا وہ ہتھیار بند باغی نہ تھے، بلکہ گاؤں کے رہنے والے تھے جنھیں صرف شبہ پر پکڑ لیا جاتا تھا۔ اس کوچ میں گاؤں کے گاؤں اس بے رحمی کے ساتھ جلا دیے گئے اور اس بے رحمی کے ساتھ بے قصور گاؤں والوں کا قتل عام کیا گیا کہ جسے دیکھ کر ایک بار محمد تغلق بھی شرما جاتا۔" (بحوالہ پنڈت سندر لال)

انگریز فوج کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے نانا صاحب نے اپنی فوج کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ 12 جولائی کو فتح پور کے نواح میں دونوں فوجوں میں لڑائی ہوئی جس میں نانا صاحب کی

فوج کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ نانا صاحب نے پھر اپنی فوج کے ساتھ، نئے جوش اور حوصلے سے، ہیولاک کی قیادت میں کوچ کرتی ہوئی فوج پر حملہ کیا۔ اس بار بہت گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں طرف بھاری جانی نقصان ہوا لیکن ہیولاک کے بڑے لشکر اور بے پناہ طاقت کے سامنے نانا صاحب کی فوج کو شکست ہوئی اور وہ بٹھور کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے انھوں نے اپنے خزانے اور رہی سہی فوج کے ساتھ گنگا کو پار کیا اور فتح گڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔

17 جولائی کو فاتح انگریز فوج کانپور میں داخل ہوئی اور شروع ہوا انگریزی فوج کے مظالم کا وہ سلسلہ جس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس ضمن میں انگریز مورخ چارلس بال (Charles Ball) کا بیان دیکھیے۔

> "جنرل ہیولاک نے سر وہیلر کی موت کا زبردست انتقام لینا شروع کیا۔ ہندوستانیوں کے گروہ کے گروہ، پھانسی پر لٹکا دیے گئے۔ مرتے وقت کچھ انقلابیوں نے جس طرح دلی سکون اور اپنے برتاؤ میں جو شرافت دکھلائی وہ انھی لوگوں کے شایانِ شان تھا جو کسی اصول کے نام پر شہید ہوتے ہیں۔" (بحوالہ پنڈت سندر لال)

جنرل ہیولاک نے سب سے پہلے اپنی فوج کے انگریز اور سکھ سپاہیوں کو حکم دیا کہ شہر کو بری طرح لوٹا جائے۔ اس کے بعد بے قصور شہریوں کو پھانسیاں دینے کا لمبا سلسلہ شروع ہوا۔ انگریز سپاہیوں کو بی بی گھر میں ایک بڑا سا دھبہ دکھائی دیا تھا۔ انھوں نے اندازہ لگایا کہ وہ خون انگریز عورتوں اور بچوں کا ہی ہوگا۔ پھر کیا تھا، حکم دیا گیا کہ شہر کے برہمنوں کو گرفتار کر کے بی بی گھر لایا جائے۔ جب گرفتار شدہ برہمن افراد بی بی گھر پہنچے تو انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ خون چاٹیں۔ پھر ان کو جھاڑو سے خون کا دھبہ صاف کرنا پڑا اور آخر میں ان تمام برہمنوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔

چارلس بال ایک انگریز افسر کے حوالے سے اس سزا کا جواز اس طرح بیان کرتا ہے:

> "میں جانتا ہوں کہ فرنگیوں کے خون کو چھونے اور پھر اسے مہتر کی جھاڑو سے صاف کرنے سے ایک اونچی ذات کا ہندو اپنے مذہب سے گر جاتا ہے۔۔۔ چونکہ میں یہ جانتا ہوں اسی لیے میں ان سے ایسا کرواتا ہوں۔ جب تک ہم انھیں پھانسی دینے سے پہلے ان کے سب مذہبی جذبات کو پیروں تلے کچل نہ دیں گے تب تک ہم پورا

بدلہ نہیں لے سکتے، تا کہ انھیں یہ اطمینان نہ ہو سکے کہ وہ ہندو دھرم پر قائم رہتے ہوئے مرے۔"
(بحوالہ پنڈت سندرلال)

اس اثنا میں نانا صاحب کو کئی مراٹھا ریاستوں اور دوسرے انقلابیوں کی طرف سے کافی مدد مل چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے کانپور پر پھر حملہ کیا۔ اس وقت کانپور میں جنرل نیل اپنی فوج کے ساتھ شہر کی حفاظت کے لیے رکا ہوا تھا جبکہ جنرل ہیولاک ایک بڑی فوج کے ساتھ لکھنؤ پر فوج کشی کی غرض سے روانہ ہوا تھا۔ جنرل نیل نے فوراً ہیولاک کو مدد کے لیے پیغام بھیجا۔ ہیولاک نے لکھنؤ پر چڑھائی کا پروگرام ملتوی کیا اور کانپور لوٹا جہاں اسے خبر ملی کہ نانا صاحب نے بٹھور پر پھر سے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ انگریزی فوج نے بٹھور پر حملہ کیا۔ بہت گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دونوں فوجوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ نانا صاحب نے کالپی میں ایک بڑی فوج جمع کر رکھی تھی۔ انھوں نے طے کیا کہ اپنی پوری فوجی طاقت کے ساتھ نئے سرے سے کانپور پر حملہ کیا جائے۔ ہیولاک اس نئی صورت حال کے باعث شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ اب اگر وہ لکھنؤ کے لیے کوچ کرتا تو نانا صاحب کانپور کو یقیناً فتح کر لیتے اور اگر وہ وہیں رکا رہتا تو اودھ پر انگریزی فوج کا قبضہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے مزید فوج کے لیے کلکتہ پیغام بھجوایا۔ کلکتہ نے حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے فوری ایک بڑی فوج ہیولاک کی مدد کے لیے روانہ کی جس کی قیادت سرجیمس اوٹ رم (Sir James Oatram) کر رہا تھا۔ یہ فوج 5 ستمبر کو کانپور میں داخل ہوئی۔

ادھر نانا صاحب کے سپہ سالار تانتیا ٹوپے نے اپنی فوجی قابلیت کے جوہر دکھانے شروع کر دیے تھے۔ گوالیر کے قریب مرار چھاؤنی میں مہاراجا سیندھیا کی ایک بڑی فوج تھی۔ تانتیا نے انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے کے لیے اس فوج کو اپنا طرفدار بنا لیا تھا۔ اس فوج کو ساتھ لے کر تانتیا نے کالپی کا رخ کیا۔ کالپی کا قلعہ جو ایک اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا جب تک انگریزی فوج کے قبضہ ہی میں تھا۔ تانتیا نے اس پر حملہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اب کالپی شہر اور قلعہ پر نانا صاحب کی فوج کا مکمل قبضہ تھا اور ایک طرح سے یہی مقام ان کی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ نانا صاحب کے سپہ سالار تانتیا ٹوپے، اپنی شجاعت، فوجی قابلیت اور دور اندیشی کے لحاظ سے لاثانی شخص تھے۔ انھوں نے 19 نومبر کو دوبارہ کانپور پر چڑھائی کی۔ اس وقت انگریزی فوج

کی قیادت جنرل وِنڈھم کر رہا تھا۔ تاتیا نے شہر کا تقریباً محاصرہ کر لیا تھا اور اس طرح انگریزی فوج کو رسد ملنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ مجبوراً ونڈھم کو شہر سے نکل کر تاتیا ٹوپے کی فوج کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلی لڑائی میں انقلابیوں کی فوج کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن تاتیا ٹوپے کی بہادری اور حوصلہ مندی نے انگریزی فوج کو فتح کا جشن منانے کا موقع نہیں دیا۔

27 نومبر کو تاتیا ٹوپے نے انقلابی فوج کو پھر سے منظم کر کے کانپور شہر پر تین طرف سے حملہ کیا اور تین دنوں کی لگاتار جنگ کے بعد شہر پر قبضہ کر لیا۔ انگریزی فوج کے افسران اور سپاہی میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جب انگریزی فوج کی شکست کی خبر سر کولن کیمپ بیل کو ملی تو مجبوراً اسے لکھنؤ چھوڑ کر کانپور کا رخ کرنا پڑا۔ تاتیا ٹوپے کو اس اقدام کا اندیشہ تھا۔ اس لیے انھوں نے گنگا کے پل کو توڑ دیا اور گنگا کے کنارے پر توپیں لگا دیں۔ اس کے باوجود سر کولن کیمپ بیل کی قیادت میں انگریزی فوج گنگا کو پار کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

تاتیا ٹوپے انگریزی فوج کو شہر کانپور میں داخل ہونے سے ہر قیمت پر روکنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے انگریزی فوج پر گنگا کے کنارے ہی دھاوا بول دیا۔ چھ دنوں تک یعنی یکم دسمبر سے 6 دسمبر تک شدید لڑائی ہوتی رہی۔ انگریزوں اور سکھوں کی متحدہ فوج نے چھٹے دن، انقلابیوں کی فوج پر شدید حملہ کیا اور اس طرح سر کولن کیمپ بیل کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد تاتیا ٹوپے دکن کی طرف نکل گئے تھے۔ انگریزوں نے کانپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور سر کولن کیمپ بیل کے حکم پر بٹھور کی تمام عمارتوں کو مسمار کر دیا گیا۔

کانپور میں انقلابیوں کی شکست کے بعد نانا صاحب اپنے وفادار سرداروں، سپاہیوں اور عام لوگوں کے ساتھ پہلے بریلی کے محاذ پر پہنچے۔ وہاں سے وہ گورکھپور کے لیے روانہ ہوئے۔ بعد ازاں نانا صاحب کس طرف نکل گئے یا ان کے ساتھ کیا بیتی، اس تعلق سے قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس ضمن میں کوئی ٹھوس تاریخی شواہد موجود نہیں ہیں۔ گو انگریزی ذرائع سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اکتوبر 1858 میں نانا صاحب کے نمائندے کولہاپور میں خفیہ طور پر داخل ہوئے تھے اور وہاں کے راجا کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکسا رہے تھے۔

پہلی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد بہت سے انقلابی یا تو جنگلوں میں مصیبت زدہ زندگی گزار رہے تھے یا نیپال میں جا کر پناہ لے لی تھی۔ نیپال کا راجا، جنگ بہادر، اپنے ملک میں ہندوستانی انقلابیوں کی موجودگی کو خطرہ سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے لارڈ کیننگ سے درخواست کی تھی انگریزی فوج ان انقلابیوں کو گرفتار کر کے یا تو ہندوستان لے جائے یا ان کا خاتمہ کر دے۔ نتیجتاً 1859 کی شروعات میں انگریزی سرکار نے ہوپ گرانٹ (Hope Grant) کی قیادت میں ایک فوجی دستہ تیار کیا جس کے ذمے یہ کام سونپا گیا کہ نہ صرف نیپال بلکہ ہمالیہ کے دوسرے علاقوں سے انقلابیوں کو ڈھونڈ نکالا جائے۔ اس دستے کے سپاہیوں نے ایک مرتبہ دو انقلابیوں کو گرفتار کیا تھا۔ ان دونوں کے پاس سے ہوپ گرانٹ کو دو خطوط ملے تھے۔ ایک خط تو نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب کا تھا جس میں انھوں نے صفائی دی تھی کہ وہ کانپور کے قتلِ عام میں بالکل ملوث نہیں تھے۔ دوسرا خط نانا صاحب کا تھا جس میں انھوں نے یہ بنیادی سوال اٹھایا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستانی سرزمین پر موجود رہنے کا کیا حق ہے اور کس اختیار کا استعمال کرتے ہوئے انگریزوں نے انھیں مفرور مجرم قرار دیا ہے؟ تاہم اس خط کے ملنے کے بعد بھی انگریز نانا صاحب کو گرفتار کرنے میں ناکام رہے۔

پھر نانا صاحب کی موت کی خبریں بھی سنی گئیں۔ سینٹ جیمز گزٹ (St. James's Gazett) کی 12 اگست 1895 کی اشاعت میں ایک خط شائع ہوا تھا۔ خط کا لکھنے والا ای ایس رابرٹسن (E.S. Robertson) تھا جس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ نانا صاحب کے ایک سردار، جوالا پرشاد سے، ملاقات کر کے معلومات حاصل کرے۔ اس ملاقات کے بعد جوالا پرشاد کو پھانسی دے دی گئی تھی۔ رابرٹسن کے بیان کے مطابق جوالا پرشاد نے اسے بتایا تھا کہ اکتوبر 1860 سے قبل نانا صاحب جنگلوں کی مصیبت سہتے سہتے مر گئے تھے۔ اس کے برعکس لندن کے مشہور اخبار، ٹائمز کی 23 نومبر 1860 کی اشاعت میں اخبار کے نمائندے نے کلکتے سے یہ خبر بھیجی تھی کہ گو نانا صاحب کے سردار اور سپاہی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے لیکن درحقیقت وہ تبت میں زندہ ہیں۔ بہرصورت اس طرح کی خبریں یا افواہیں بہت برسوں تک آتی

رہیں۔ شمالی ہند میں 1877 میں یہ افواہ تو بہت گرم تھی کہ نانا صاحب روس کی فوج کو ساتھ لے کر ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ حقیقتاً کیا بیتی، تاریخ اس تعلق سے خاموش ہے۔ جنگ آزادی کا یہ بہادر سپہ سالار، اور مراٹھوں کا آخری پیشوا محبان وطن کی فہرست میں اپنا نام جلی حروف میں درج کر گیا۔

(بحوالہ: ہسٹری آف انڈین میوٹنی، ٹی رائیس ہومز)

حوالہ جاتی کتب:

1. History of Indian Mutiny, By T. Rice Holmes.
2. British Rule in India, by Pandit Sunderlal.
3. Empire in India by Major Evans Bell.
4. History of the Sepoy War, by T. Rice Holmes.
5. History of the Sepoy War, by Sir John Kaye.
6. What Really Happenned During the Mutiny, by P.J.O. Taylor.

اقبال حسین

عظیم اللہ خاں

1857 کی جنگ آزادی کے عظیم رہنماؤں میں عظیم اللہ خاں بھی تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ غلام رسول مہر نے بغیر کسی ماخذ کو بتلاتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے والد کا نام عبداللہ خاں اور غالباً افغان النسل تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات کے متعلق انگریزوں نے جو لکھا ہے اسے پوری طرح سے تسلیم کرنا مشکل ہے۔ مثلاً منٹو برے تھامسن لکھتا ہے کہ عظیم اللہ خاں ابتدا میں کسی اینگلو انڈین خاندان میں خدمت گار تھے۔ اس قربت کا فائدہ اٹھا کر انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ وہ دونوں زبانوں میں بخوبی گفتگو کر سکتے تھے اور اچھی طرح لکھ سکتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور کان پور گورنمنٹ اسکول میں مدرس کے عہدہ پر کام کرنے لگے۔ انتظام اللہ شہابی ان کی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں کہ مسٹر فارس ٹکل نے اپنے روزنامچہ میں محمد علی عرف جے جی گرین کے ذکر میں محمد علی روہیلکھنڈی کے حوالہ سے لکھا ہے:

> "میں نے اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول کان پور میں لنگا دین سے انگریزی سیکھی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ خاں ملازم اس اسکول میں ہوئے۔(1)

عظیم اللہ خاں کے متعلق شہابی مزید لکھتے ہیں کہ وہ ذہین اور تیز طبع تھے بہت مطالعہ سے استعداد فاضلانہ بڑھائی۔ تھوڑے عرصہ میں عظیم اللہ خاں کی انگریزی دانی کی دھوم مچ گئی جو انگریز آتا اس کے لیے یہی سپاس نامہ لکھتے۔ بقول مہر اس کی وجہ سے حکام ضلع میں ان کا بڑا رسوخ ہو گیا۔ کلکٹر کان پور نے نانا صاحب پیشوا سے ان کی اعلیٰ قابلیت کا ذکر کیا۔ نانا صاحب نے

عظیم اللہ خاں کو بلایا اور ان کی گفتگو سے متاثر ہوا۔ کچھ دنوں بعد نانا صاحب نے عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ کار بنالیا اور ان کی کارکردگی سے ایسا خوش ہوا کہ ان کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔[2] شہابی کے بیان سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ کان پور میں عظیم اللہ خاں ہی سب سے بڑے انگریزی داں تھے اور باوجود یہ کہ بہت سے انگریز حکام موجود تھے لیکن گورنر کا سپاس نامہ عظیم اللہ خاں ہی لکھتے تھے۔ دوم انگریز کلکٹر نے ان کے نام کی سفارش نانا صاحب سے کی تھی۔ دونوں ہی باتیں تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ بہرحال نانا صاحب سے عظیم اللہ خاں کے تعلقات کیسے قائم ہوئے وہ آنے والی سطروں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک انگریز شیپرڈ لکھتا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے ایک یتیم خانہ میں پرورش پائی تھی۔ جہاں 38-1837 کے دوران یہ اپنی والدہ کے ساتھ فاقہ کشی کی موت سے بچ کر آئے تھے۔ ان کی والدہ پکی مسلمان خاتون تھیں اور انہیں کسی حال میں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کا بیٹا عیسائی مذہب اختیار کرے۔ سال ڈیوڈ ایک جدید مورخ لکھتا ہے کہ کارشور کے جاں نشین پادری پرکنسن نے عظیم اللہ خاں کی ذہانت دیکھ کر ان کی حوصلہ افزائی کی اور وہ فری اسکول میں داخل ہوئے۔ عظیم اللہ خاں نے اسی اسکول میں انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں۔ پادری پرکنسن، عظیم اللہ خاں کو عیسائیت کی طرف راغب نہ کرسکے۔ سال ڈیوڈ لکھتا ہے کہ ان کے (عظیم اللہ خاں) کے مربیوں کی کاوشیں کہ ان کو عیسائی بنالیا جائے کامیاب نہ ہوسکیں۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عیسائی مبلغین کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کو عوام اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ عظیم اللہ ذہین آدمی تھے وہ اس معاملے میں اپنے ہمدردوں کو خوش نہیں کرسکے جس کی وجہ سے سال ڈیوڈ ان پر احسان ناشناسی کا بھی الزام لگاتا ہے۔[3]

بہرحال یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے کان پور فری اسکول میں مسٹر پیٹن کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی تھی جو وہ بطور ماسٹر ملازم تھے۔ گذارہ کے لیے عظیم اللہ خاں کو تین روپے ماہوار ملتے تھے۔ ان کی والدہ گذر بسر کے لیے بطور آیا کام کر کے کچھ کمالیتی تھیں۔ دس سال کی تعلیم کے بعد عظیم اللہ خاں اسی اسکول میں ملازم ہوگئے۔ دو سال کے بعد وہ بریگیڈیر اسکاٹ کے منشی کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ اسکاٹ نے اپنے بعد عظیم اللہ خاں کو اپنے جانشین بریگیڈیر ایشمر

نہام کے حوالہ کردیا تھا مگر وہ وہاں سے رشوت خوری اور بدعنوانیوں کی پاداش میں برطرف کردیے گئے۔[4] انگریز مورخین کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ انھوں نے یہ الزامات عظیم اللہ خاں کی شخصیت اور کردار کو مسخ کر کے پیش کرنے کی دانستہ کوشش کی ہو۔ بہر حال یہی انگریز مورخین مزید لکھتے ہیں کہ اشمر نہام کے یہاں سے نکالے جانے کے بعد وہ پیشوا کے متبنّیٰ فرزند کی ملازمت میں آ گئے جن کو انھوں نے بٹھور میں 1840 میں انگریزی کی تعلیم دی تھی۔ بعد ازاں وہ پیشوا باجی راؤ دوم کی موت کے بعد وہ ان کے متبنّیٰ فرزند نانا صاحب کے معتمد ترین صلاح کار بن گئے۔ انگریز مورخین کی صداقت سخت مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ اس دور میں کسی بھی ہندوستانی کا جسے انگریزوں نے رشوت خوری اور بدعنوانی کے الزامات میں نکال دیا ہو اسے کوئی ہندوستانی بالخصوص نانا صاحب جو خود برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے رحم و کرم پر تھے اور اپنے حقوق کی بحالی کے لیے کوشاں تھے۔'' کیسے ملازمت میں رکھنے کی ہمت کر سکتا تھا۔

عظیم اللہ خاں کئی برس تک نانا صاحب کی ملازمت میں رہے۔ اسی دوران نانا صاحب نے ان کو اپنے مقدمہ کے سلسلے میں 1854 میں ایک اور صاحب محمد علی کے ساتھ انگلینڈ بھیج دیا۔[4] نانا صاحب کو، ہندوستان کے بیشتر برطرف راجاؤں کی طرح یہ امید تھی کہ اگر ان کا مقدمہ صحیح طور پر انگلینڈ کے اکابرین مملکت کے سامنے پیش کیا گیا تو ان کے ساتھ انصاف ہوگا۔

عظیم اللہ خاں ایک شاندار شخصیت رکھتے تھے۔ قدرت نے ان پر کشش اور متاثر کرنے والے خدوخال بخشے تھے۔ اس شخصیت کو عظیم اللہ خاں کی اپنی کاوشوں، ذہانت، حسن اخلاق، بہترین طور طریقوں نے اور نکھار دیا تھا۔ جب وہ لندن پہنچے تو وہاں کی اعلیٰ اور بہترین سوسائٹی میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔[5] وہاں وہ اپنی ذہانت، حسن اخلاق اور لیاقت سے مقبول ہو گئے۔ ایسٹ انڈیا ہاؤس، لندن میں وہ مشہور فلاسفر جان ایسٹورٹ مل سے ملے جو وہاں کمپنی کے رابطہ افسر تھے اور ہندوستانی رجواڑوں کے معاملات کے نگراں تھے۔ ان کی ملاقات لیڈی ڈف گارڈن سے بھی ہوئی تھی جو وزیر اعظم برطانیہ کی بہت قریبی خوب صورت رشتہ مند تھیں۔ یہاں عظیم اللہ خاں کا تعارف چارلس ڈکنس، مشہور شاعر ٹینی سن، تھیکرے اور میکالے وغیرہ سے ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ لندن کی سوسائٹی میں عظیم اللہ خاں عورتوں میں بہت مقبول تھے اور ان کے تعلقات لیڈی ڈف گارڈن سے دوستی کی حدوں سے کچھ زیادہ ہی تھے اور بہت سے لوگ ان کے متعلق شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پیار میں گرفتار تھے۔ سال ڈیوڈ عظیم اللہ خان کے لندن میں خواتین کے درمیان مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ نجی طور پر وہ مغربی خواتین کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔

عظیم اللہ خاں نے اپنے لندن کے قیام کے دوران لاکھوں روپے مقدمہ اور وکیلوں کی فیس پر خرچ کیے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کی دعوت اور مدارات کیں جن سے مقدمہ میں مدد کی امید تھی لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرز اس کے لیے تیار نہ تھے کہ نانا صاحب کو پنشن اور وہی اعزاز وخطاب دیے جائیں جو باجی راؤ دوم پیشوا کو حاصل تھے۔

عظیم اللہ خاں جس مقصد کے لیے انگلینڈ گئے تھے اس کی تکمیل مشکل تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بہت سے مددگار وہاں موجود تھے۔ عظیم اللہ خاں کی تمام کوششیں کہ نانا صاحب کو ان کا جائز حق دیا جائے، کامیاب نہ ہوسکیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ وہاں کے تجربہ کار سیاست دانوں پر ان کی وکالت کا کوئی اثر نہیں ہوسکتا تھا۔ دوم ملکہ وکٹوریہ کے صلاح کاروں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کا خاصہ اثر تھا۔ وہاں بھی ان کو کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ ان حالات میں انھوں نے محمد علی کے ساتھ ہندوستان لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ سیاحت کے شوق نے بجائے براہ راست ہندوستان آنے کے، ان کو مغرب وسطی کے ممالک کی سیر پر اکسایا۔ جب وہ مالٹا میں تھے تو ان کو روسیوں کی اینگلو فرانسیسی افواج پر فتح کی خبر ملی۔ انھوں نے قسطنطنیہ جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی ملاقات مشہور انگریز صحافی ولیم ہورڈ رسل سے ہوئی تھی۔ رسل اپنی ڈائری میں عظیم اللہ خاں کے متعلق لکھتا ہے:

> ''میں چند دنوں کے لیے قسطنطنیہ گیا، مصری ہوٹل میں میں نے بارہا ایک چھریرے جسم والے سانولے خوب صورت نوجوان کو دیکھا جو مشرقی لباس میں تھا جو میرے لیے نیا تھا کیوں کہ اس پر خوش وضع دائرے بنے ہوئے تھے۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بول سکتا تھا اور عام مہمانوں کے ساتھ میز پر کھانا کھاتا تھا۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکا

وہ مجھے ایک ہندوستانی شہزادہ لگا جو لندن سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ناکامی کے بعد وطن لوٹ رہا تھا۔"(6)

اس وقت کریمیا میں جنگ کا بازار گرم تھا۔ عظیم اللہ خاں ان روسی بہادروں کو دیکھنے کو بے تاب تھے جنھوں نے برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ فوج کو شکست دی تھی۔ انھوں نے دور سے روسی توپ خانوں کو بمباری کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ عظیم اللہ خاں سے رسل کی مذہب اور مذہبی پابندیوں پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس دوران انھوں نے رسل سے دوران گفتگو مذاقاً کہا تھا کہ" میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں کہ اس قسم کی احمقانہ باتوں میں یقین کروں۔ میرا کوئی مذہب نہیں ہے۔"(7)

عظیم اللہ خاں بہت مضبوط اعصاب کے آدمی تھے۔ کریمیا کی جنگ کا منظر دیکھتے وقت ایک گولہ ان کے سامنے آگرا۔ ان کے قریب کھڑے تمام لوگ سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلے۔ جب گرد وغبار صاف ہوا تو رسل یہ دیکھنے آیا کہ عظیم اللہ خاں پر کیا گذری۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی نشست گاہ کے قریب کھڑے گرد وغبار جھاڑ رہے ہیں۔ رسل نے سوال کیا کہ وہ اور لوگوں کی طرح کیوں نہیں بھاگے۔ عظیم اللہ نے جواب دیا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا پھر بھاگنے سے کیا فائدہ۔ کہا جاتا ہے کہ عظیم اللہ خاں کی جرات اور استقامت سے روسی متاثر ہوئے اور ان سے آکر ملاقات کی۔ عظیم اللہ خاں کو آمادہ کیا کہ وہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مہم چلائیں۔ شہنشاہ روس سے مدد ملے گی۔ ترکی سے عظیم اللہ خاں ہندوستان آگئے۔ نانا صاحب سے تمام واقعات بیان کیے اور ان کو آمادہ کیا کہ وہ اس کام کے لیے ہندوستان کے نوابوں اور راجاؤں کے پاس سفیر بھیجیں۔ نانا صاحب نے اس کام کی پوری ذمہ داری عظیم اللہ خاں ہی کو سونپ دی۔ عظیم اللہ خاں کی مہم کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ نوابین اور راجگان انگریزوں کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ پھر عظیم اللہ خاں اور نانا صاحب نے مشورہ کے بعد طے کیا کہ دونوں یاترا کے بہانہ سے ہندوستان کا سفر کریں۔ اس پروگرام پہ عمل کیا گیا۔ نانا صاحب کے ساتھ تانیتا ٹوپے اور ان کے والد سری پانڈورنگ بھٹ بھی تھے۔ نانا صاحب کی بیٹی مینابائی بھی اس سفر میں ساتھ تھیں۔ تانتیا ٹوپے فقیرانہ لباس میں دورہ کرتے وقت اپنے چیلوں کو سرکاری فوج میں چھوڑتے جاتے تھے۔ اودھ میں احمد اللہ شاہ بھی انگریزوں کے خلاف ایسی ہی مہم میں مشغول تھے۔ احمد اللہ شاہ اور

عظیم اللہ کی ملاقات بھی اسی دوران ہوئی تھی۔ 1856 میں نواب واجد علی شاہ والی اودھ کی معزولی نے اودھ کے عوام کو انگریزوں سے ناراض کر دیا تھا۔ عظیم اللہ خاں اور نانا صاحب کا دورہ کامیاب رہا یہ لوگ جہاں جہاں پہنچے لوگوں کو انگریزوں کے خلاف پایا۔ دورہ کے بعد نانا صاحب کی طرف سے بغاوت کی تاریخ 20 جون 1857 مقرر کی گئی تھی لیکن 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں قبل از وقت بغاوت شروع ہو جانے سے پورا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔[8] میرٹھ کی بغاوت کی اطلاع کان پور قدرے دیر سے پہنچی تھی۔ بہر حال یہاں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی خفیہ سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ صوبہ دار ٹیکہ سنگھ اور شمس الدین خاں کے مکانات پر خفیہ مذاکرات ہونے لگے جن میں نانا صاحب کی نمائندگی جوالا پرساد اور محمد علی کرتے تھے۔ انگریزوں کو شک ہو چکا تھا کہ 31 مئی بروز عید الاضحیٰ بغاوت ہوگی۔ مگر یہ تاریخ گذر گئی مگر اچانک 4 جون 1857 کو بغاوت ایک منصوبہ کے تحت شروع ہوئی تھی جس کا فیصلہ خفیہ طور پر نانا صاحب، عظیم اللہ خاں بالا راؤ، رحیم خاں، مدد علی اور دوسرے ہندوستانی فوجیوں نے سوکھا ملاح گھاٹ کی نشست میں لیا تھا۔[9] خفیہ فیصلہ کے مطابق نانا صاحب معہ عظیم اللہ خاں اور فوج کے ساتھ نواب گنج کی طرف بڑھے۔ نانا کی فوج نے خزانہ اور کلکٹری پر قبضہ کر لیا۔ میگزین بھی ہاتھ لگا وہاں سے نانا صاحب دہلی کی طرف بڑھے۔

کلیان پور پہنچے تو عظیم اللہ خاں نے نانا صاحب کو دہلی نہ جانے کی رائے دی ٹریولین لکھتا ہے:

"دہلی جانے کا مشورہ باغی فوج کے ایک وفد نے نانا صاحب کو نواب گنج میں دی تھی (10) لیکن اس وفد کی واپسی کے بعد عظیم اللہ خاں نے دہلی نہ جانے کی صلاح دی کیونکہ دہلی جا کر ان کی انفرادیت اور خصوصی پہچان مغل بادشاہ کے سامنے ختم ہو جاتی اور وہ اپنا اثر کھو دیتے۔ عظیم اللہ خاں نے مشورہ دیا کہ وہ کان پور کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کریں پورا ملک ان کے سامنے ہے۔ وہ گنگا کی وادی میں اپنی حکومت مستحکم کر کے انگریزوں کو مار بھگائیں۔ (11) نانا صاحب نے تجویز مان کر اپنے بھائی بالا صاحب سے ملنے کلیان پور کی طرف ہاتھی موڑ دیا۔ (12) کلیان پور سے کان پور آئے۔ انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ جنگ کا آغاز 6 جون سے ہو گیا۔ انگریز محصور ہو گئے۔ 23 جون کو مجاہدین آزادی نے انگریزوں پر شدید حملہ کیا جس۔۔۔"

کی ہمت ٹوٹ گئی۔ 25 جون کو انگریزوں نے صلح کی بات شروع کی۔ فارسٹ لکھتا ہے کہ انگریزوں سے گفت وشنید میں عظیم اللہ خاں نے اہم کردار انجام دیا تھا اور انگریزوں کو مورچہ خالی کر کے چلے جانے پر تیار کرلیا تھا۔" (13)

انگریزوں کے کان پور کے انخلا اور ان پر نانا صاحب کے اشارہ پر فائرنگ کے متعلق انگریز مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے اور ان پر عظیم اللہ خاں پر انگریزوں کے قتل عام کا الزام لگایا ہے۔ (14) لیکن مسز ہورنسٹ کے بیان سے اس الزام کی نفی ہوتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"میں اور میرے بچے ایک گاڑی میں اور دوسرے لوگ دوسری گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دریا کے کنارے جہاں بہت سی کشتیاں موجود تھیں چلے جاتے تھے۔ چونکہ نانا راؤ نے عہد کیا تھا کہ ہم کو نہایت عزت و آبرو کے ساتھ اپنی حفاظت میں گنگا کے پار اتارے گا اس لیے ہماری حفاظت کو دونوں طرف مسلح سپاہی شفا خانہ سے گنگا کے کنارے تک کھڑے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ایک کثیر جماعت شہر کے تماشائیوں کی کھڑی ہوئی ہمارے جانے کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔"

27 جون کو یہ منظر عظیم اللہ خاں، بالا صاحب اور تانتیا ٹوپے قریب کی مندر سے دیکھ رہے تھے۔ تانتیا ٹوپے نے کشتیوں کو چلنے کا اشارہ کیا کہ اچانک دھماکہ ہوا اور گولیاں چلنے لگیں۔ بہت سے انگریز بدحواسی میں دریا میں کود پڑے، کچھ گولیوں کا شکار ہو گئے، کچھ ڈوب گئے، اس واقعہ کو انگریز مورخین نے عظیم اللہ خاں اور تانتیا ٹوپے کی سازش لکھا ہے۔ (15) لیکن مسز ہورنسٹ انگلیسی جو موقع واردات پر موجود تھیں لکھتی ہیں:

"اس کی وجہ یہ تھی کہ جنرل ہیولاک، جنرل ویلر کی رہائی کے لیے کان پور کے نزدیک آیا ہوا تھا۔ جس وقت ہم لوگ کشتیوں میں الہٰ آباد کے لیے بیٹھے۔ بارود کا ذخیرہ جو شفا خانہ (انگریزوں کی پناہ گاہ) میں تھا محافظوں کی غفلت سے جل اٹھا۔ ہندوستانیوں نے سمجھا کہ انگریز پھر جنگ پر آمادہ ہو گئے اور کان پور سے نہیں نکلے اور جنرل ہیولاک کی آمد کے منتظر ہیں۔ اس وجہ سے ہم سب لوگوں کے قتل کا حکم دیا گیا لیکن بعد میں جب ہم لوگوں کی بے گناہی معلوم ہوئی تو نانا راؤ نے ان لوگوں کو جو قتل سے محفوظ رہے تھے۔ نجات دی۔" (16)

بچے ہوئے انگریز مرد وعورتوں کو کان پور لایا گیا اور ایک مکان میں پناہ دی گئی جہاں ہر قسم کی سہولت نانا کے حکم سے پہنچائی گئی۔[17] بہر حال انتظام اللہ شہابی کان پور حادثہ کے متعلق بالا صاحب کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں کی قیادت میں جنرل وہیلر سے معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت انگریزوں کو سامان، آلات وحرب وسواریوں کے ساتھ کان پور سے چلے جانا تھا۔ انگریزوں کو سات کشتیوں پر بٹھایا گیا لیکن بالا صاحب نے عہد شکنی کی اور کشتیوں پر گولی چلوادی بہت سے ڈوب گئے اور مارے گئے۔ جنرل وہیلر بھاگ کر الٰہ آباد پہنچا۔[18] شہابی کے مطابق اس واقعہ سے تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں اور دینا، نانا صاحب سے کبیدہ ہو گئے۔ عظیم اللہ خاں کا نام اس واقعہ کے بعد نانا صاحب کے ساتھ نہیں آتا۔[19]

کان پور کے واقعہ کے بعد مورخین عظیم اللہ خاں کے متعلق خاموش ہیں۔ شہابی بہر حال لکھتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں لکھنؤ چلے گئے اور وہاں احمد اللہ شاہ کے لشکر میں شامل ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ آزما رہے۔ بیلی گارد کی جنگ میں وہ موجود تھے۔ عظیم اللہ خاں شاہ جہان پور تک احمد اللہ شاہ کے ساتھ رہے۔ دریں اثنا نانا صاحب بھی فرار ہو کر اودھ آ گئے۔ غالباً احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد عظیم اللہ دوبارہ نانا صاحب کے پاس آ گئے تھے کیونکہ کمال الدین کی روایت کے مطابق جب انگریزوں کا دباؤ بڑھا تو وہ نانا صاحب کے ساتھ نیپال چلے گئے جہاں 1859 میں ان کا انتقال ہو گیا۔[20]

حواشی:

1. غدر کے چند علما، سرقی، ص-104
2. ایضاً، ص-104
3. Saul Davis, The Indian Mutiny, 1857, Viking 2002, pp. 48-9
4. Shepherd, A Personal Narrative of the Outlook and massacre at cawnpore p 14
5. Sen S.N. Eighteen Fifty Seven, pp. 226-27, Trevelyan, pp. 58-59
6. Russell, My Indian Diary, Vol. I, pp 98-99
7. ایضاً
8. غدر کے چند علما، ص-108-9
9. رضوی، جلد چہارم، صفحات-521-22
10. Cawnpore, p 104
11. ایضاً ص105
12. ایام غدر، 1923 (مترجم ظفر حسن ہاشمی)، ص170، Cawnpore p. 105
13. C.W. Forrest, A History of the Indian Mutiny, 1857-59, Vol I, reprint Delhi. 2006, pp. 457-58 کا ترجمہ، ص128
14. Forrest Vol. I, pp-457-58, Trevelyan, Cawnpore, p.226
15. Forrest, Vol. I, pp 457-58, Malleson, Vol V, p. 308
16. ایام غدر، ص 170
17. ایضاً
18. غدر کے چند علما، ص-110
19. ایضاً
20. کمال الدین حیدر، قیصر التواریخ، جلد دوم، ص-248

ظہیر علی

تاتیا ٹوپے

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی میں یوں تو لاکھوں جانباز محبِ وطن اشخاص نے اپنی بہادری اور سرفروشی کے سبب ہندوستان کی تاریخ میں اپنے کارنامے محفوظ کرائے ہیں لیکن ان تمام مجاہدینِ آزادی میں تاتیا ٹوپے کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

تاتیا ٹوپے کا اصلی نام رام چندر پانڈو رنگ تھا اور ان کی ولادت مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے گاؤں یولا (Yeola)، ضلع ناسک میں 1814 میں ہوئی تھی۔ ان کے والد پانڈو رنگ راؤ ٹوپے، پیشوا باجی راؤ دوم کے دربار کے ایک معزز امیر تھے۔ جب پیشوا باجی راؤ کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی سازش کی وجہ سے کمزور ہوگیا تو انگریزوں نے انھیں پونا سے جلاوطن کردیا۔ مجبوراً انھیں مہاراشٹر چھوڑ کر کانپور کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں بٹھور میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ پیشوا کے ساتھ ان کے قریبی رشتہ دار اور معزز درباری بھی بٹھور منتقل ہوئے تھے۔ انھیں میں تاتیا ٹوپے اور ان کے والد پانڈورنگ راؤ ٹوپے شامل تھے۔ یہ 1818 کا واقعہ ہے اور اس وقت تاتیا ٹوپے کی عمر صرف 4 برس تھی۔ بٹھور میں تاتیا ٹوپے بہت جلد پیشوا کے متبنیٰ بیٹے، ڈھونڈو پنت عرف نانا صاحب کے جگری دوست بن گئے تھے۔ اس کے علاوہ مہاراجہ مادھو سنگھ سے بھی تاتیا کے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے۔

1851 میں جب لارڈ ڈلہوزی نے اپنی بدنام زمانہ لیپس کی پالیسی (Policy of Lapse) کے تحت نانا صاحب کو پیشوا باجی راؤ دوم کا جانشین ماننے سے انکار کردیا اور ان کا وظیفہ

بھی بند کر دیا تو نانا صاحب کے ساتھ ساتھ تانتیا ٹوپے بھی انگریزوں کے سخت دشمن بن گئے تھے۔
اس طرح مئی 1857 میں جب پہلی جنگِ آزادی کی شروعات ہوئی تو تانتیا ٹوپے کی فوجی قابلیت اور قیادت کے جوہر چمک اٹھے۔ انھوں نے اپنی انتھک مساعی اور تدبیر سے کمپنی کی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو اپنا ہم نوا بنایا اور کانپور میں نانا صاحب کی خود مختار حکمرانی کا اعلان کیا۔ اس درمیان انھوں نے نانا صاحب کی فوج کی کمان سنبھال لی تھی اور اس حیثیت سے انھوں نے اپنی فوجی حکمتِ عملی کے انمٹ نقوش ہندوستان کی تاریخ میں چھوڑ گئے۔

دہلی پر انقلابیوں کے قبضے کی اطلاع نانا صاحب کو 15 مئی 1857 کو ملی۔ تاہم پلان کے مطابق نانا صاحب نے فوری کانپور میں جنگِ آزادی کی شروعات نہیں کی۔ انھوں نے کمپنی کی فوج کے ہندوستانی سرداروں اور سپاہیوں کو جنگِ آزادی کے حمایتی بنانے کا کام خفیہ طور پر شروع کر رکھا تھا۔ کمپنی کی فوج کے دو ہندوستانی سردار، صوبیدار ٹیکا سنگھ اور صوبیدار شمس الدین نانا صاحب کی فوج کے دو سرداروں، جوالا پرساد اور محمد علی سے ساز باز کیے ہوئے تھے۔ نانا صاحب، ان کے سکریٹری، عظیم اللہ خاں اور ان فوجی سرداروں میں خفیہ میٹنگیں ہوتی تھیں۔

منصوبے کے مطابق 4 جون کو آدھی رات گئے کانپور میں انقلاب کی شروعات ہوئی۔ چند گھنٹوں کے اندر ہی شہر کی بہت سی عمارتیں جو انگریزوں کے تصرّف میں تھیں جلا دی گئیں۔ ہر جگہ سے برطانیہ کا یونین جیک ہٹا کر بہادر شاہ ظفر کا ہرا پرچم لہرا دیا گیا۔ دوسرے دن صبح یعنی 5 جون کو کانپور کے شہریوں نے نانا صاحب کو اتفاق رائے سے "راجا" منتخب کر لیا۔ 6 جون کو نانا صاحب نے کمپنی کی فوج کے جنرل وہیلر، جو ایک نئے تعمیر شدہ قلعہ میں انگریز مرد، عورتوں، بچوں اور سپاہیوں کے ساتھ پناہ گزیں تھا، کو یہ وارننگ دی کہ اگر اس نے شام ہونے سے قبل قلعہ کو انقلابیوں کے حوالے نہیں کیا تو شام ہوتے ہی قلعہ پر حملہ کر دیا جائے گا۔ وہیلر نے قلعہ ہندوستانیوں کے حوالے نہیں کیا اور شام ہوتے ہی نانا صاحب کی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر کے اس پر حملے کرنا شروع کیا۔

قلعے کا محاصرہ 25 جون تک جاری رہا اور اسی دوران میں دو گھمسان لڑائیاں (18

جون اور 23 جون) بھی ہوئیں۔ انگریز مرد اور عورتیں بیماریوں اور پیاس کی وجہ سے قلعے میں مر رہے تھے۔ بالآخر 25 جون کو جنرل وہیلر نے صلح کے لیے سفید جھنڈا لہرا دیا۔ صلح نامے کی رو سے جنرل وہیلر اور اس کے انگریز ساتھیوں کو دریا کے راستے سے الہٰ آباد جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ تاہم شہر کانپور کے بپھرے ہوئے عوام نے ان تمام کو ستی چورا گھاٹ پر قتل کر دیا جس کی تفصیل نانا صاحب کے بیان میں درج ہے۔

کانپور پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ 8 جولائی کو ہوا جب الہٰ آباد سے جنرل ہیولاک نے ایک زبردست لشکر کے ساتھ کانپور کو فتح کیا۔ 17 جولائی کو نانا صاحب نے اپنے بھائی بالا صاحب، بھتیجے راؤ صاحب، سپہ سالار، تانتیا ٹوپے، گھر کی خواتین اور خزانے کو ساتھ لے کر بٹھور سے فتح پور چلے گئے۔ نانا صاحب نے کانپور کو پھر سے فتح کرنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے تانتیا ٹوپے کو شیوراج پور روانہ کیا۔ شیوراج پور میں اپنی عقلمندی اور تدبیر سے تانتیا ٹوپے نے کمپنی کی فوج (پلٹن نمبر 42) کے ہندوستانی سپاہیوں کو انقلاب کا حامی بنالیا۔ اس نئی فوج کی مدد سے تانتیا ٹوپے نے بٹھور پر دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا۔ اس دوران میں جنرل ہیولاک نے کانپور کے شہریوں پر مظالم کا پہاڑ توڑ دیا تھا۔ شہر پر کمپنی کے مکمل قبضہ کے بعد وہ لکھنؤ کی جانب اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ ایسے وقت تانتیا ٹوپے نے کمپنی کی فوج پر پیچھے سے حملہ کیا۔ اب سر ہیولاک کو لکھنؤ جانے کا ارادہ ترک کر کے تانتیا ٹوپے سے مقابلہ کرنا پڑا۔ 16 اگست کو کمپنی کی بھاری فوج نے تانتیا ٹوپے کی فوج کو شکست دی۔ تانتیا ٹوپے اپنی بچی ہوئی فوج کے ہمراہ فتح پور کے لیے روانہ ہوئے۔ تاہم اس حالیہ شکست سے تانتیا ٹوپے کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔ وہ خفیہ طریقے سے گوالیر پہنچے جہاں مرار چھاؤنی میں مہاراجہ سیندھیا کی ایک بڑی فوج مقیم تھی۔ تانتیا ٹوپے اس فوج کو انقلاب کی دعوت دی اور اپنی مقناطیسی شخصیت سے تمام فوج کو قائل کر لیا۔

اس نئی فوج کی مدد سے تانتیا نے کالپی پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ اب نانا صاحب نے کالپی ہی کو اپنی انقلابی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا۔ تاہم تانتیا ٹوپے کی نگاہ پھر سے کانپور پر لگی

ہوئی تھی۔ وہ کانپور کو دوبارہ نانا صاحب کے لیے فتح کرنا چاہتے تھے۔ جنرل ہیولاک نے کانپور کا انتظام جنرل وِنڈھیم کے حوالے کر کے لکھنؤ کی جانب کوچ کر لیا تھا۔ 19 نومبر کو تانتیا ٹوپے کی فوج نے کانپور شہر کا محاصرہ کر کے شہر میں رسد وغیرہ پہنچنے کو تقریباً ناممکن بنا دیا۔ اس تکلیف دہ صورت حال سے تنگ آ کر جنرل ونڈہم اپنا لشکر لے کر شہر سے نکلا اور 26 نومبر کو پانڈو ندی کے کنارے اس کی فوج کا مقابلہ تانتیا ٹوپے کی فوج سے ہوا۔ جنگ کی شروعات میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تانتیا ٹوپے کی فوج پسپا ہو رہی ہے اور اسے کافی نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے لیکن تانتیا ٹوپے کی بے انتہا کارگر اور پُرعزم فوجی قیادت نے ہندوستانیوں کو شکست کی ذلت سے بچالیا۔ اس معرکہ میں تانتیا ٹوپے نے جس بہادری اور فوجی قابلیت کا ثبوت دیا تھا اسے تو انگریز بھی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مورخ مالے سین کی رائے یہ ہے:

"باغی فوج کا رہنما (تانتیا ٹوپے) بے وقوف نہیں تھا۔ ونڈھیم نے اسے جو نقصان پہنچایا اس سے ڈر جانے کے بجائے وہ انگریز سپہ سالار کی کمزوری کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ تانتیا ٹوپے نے ونڈھیم کی حالت اور اس کی ضرورتوں کو اس طرح پڑھ لیا جس طرح کوئی کھلی کتاب پڑھتا ہے۔ تانتیا میں ایک حقیقی سپہ سالار کے قدرتی اوصاف موجود تھے۔" (بحوالہ پنڈت سندر لال)

جنگ کے دوسرے دن تانتیا ٹوپے نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ انگریزوں کی فوج کو تین طرف سے گھیرا جائے۔ اس منصوبے میں انقلابیوں کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی اور ونڈھم کی فوج پسپا ہونے لگی۔ اس طرح دوسرے ہی دن آدھے کانپور شہر پر تانتیا ٹوپے کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد جنگ کی شدت بہت بڑھ گئی اور تین دنوں تک دونوں فوجیں لگاتار لڑتی رہیں۔ بالآخر میدان جنگ تانتیا ٹوپے کے ہاتھ رہا اور انگریزی فوج کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ اب پورے کانپور شہر پر تانتیا ٹوپے کا قبضہ ہو گیا تھا اور انگریزی فوج بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔ اس جنگ میں کئی انگریز افسران مارے گئے تھے۔ جنگ کے آخری دن کا حال بیان کرتے ہوئے ایک انگریز افسر لکھتا ہے:

"آج کی جنگ کا حال پڑھ کر آپ کو تعجب ہوگا۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ کس طرح انگریزی فوج اپنے فتح کے پرچموں، اچھے اصولی نعروں اور اپنی مشہور بہادری کے باوجود پیچھے ہٹا دی گئی۔ اُن ہندوستانیوں نے جنھیں ہم حقیر سمجھ رہے ہیں اور

چڑھاتے رہے ہیں، انگریزی فوج سے اس کا کیمپ، اس کا سامان، اس کا میدان
سب کچھ چھین لیا۔ دشمن کو اب یہ کہنے کا حق ہو گیا ہے کہ فرنگی پٹ گئے۔''

(بحوالہ ایضاً)

جب اس شکست کی خبر سر کولن کیمپ بیل کو ملی تو اسے لکھنؤ چھوڑ کر کانپور پر چڑھائی کے لیے لوٹنا پڑا۔ اس اثنا میں تانتیا ٹوپے نے انگریزی فوج کی پیش رفت روکنے کے لیے گنگا کے پل کو مسمار کروا دیا تھا اور گنگا کے کنارے پر توپیں لگا دی تھیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر انگریزی فوج نے ایک دوسرے مقام سے گنگا کو پار کیا اور ہندوستانی توپوں کی بمباری سے بچتے ہوئے یہ فوج کولن کیمپ بیل کی قیادت میں 30 نومبر 1857 کو کانپور کے نواح میں پہنچ گئی۔

اس درمیان میں نانا صاحب بھی اپنی فوج کے ساتھ تانتیا ٹوپے کی مدد کے لیے کانپور پہنچ چکے تھے۔ تانتیا ٹوپے نے اپنی قدرتی فوجی صلاحیت کا ثبوت دیتے ہوئے اس بات کو مناسب سمجھا کہ انگریزی فوج کو کانپور شہر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اس لیے انھوں نے گنگا کے کنارے پر ہی انگریزی فوج پر دھاوا بول دیا۔ یکم دسمبر سے 6 دسمبر تک گھمسان جنگ ہوتی رہی۔ مقابلہ بڑا سخت تھا۔ تانتیا ٹوپے نے اپنی فوج کی داہنی طرف گوالیر کی فوج کے سپاہیوں کو تعینات کیا تھا۔ فوج کے اسی حصے پر انگریزوں اور سکھوں کی متحدہ فوج نے شدید حملہ کیا اور تانتیا ٹوپے کی فوج کا یہ حصہ پسپا ہو گیا۔ یہ ایک ضرب کاری تھی جو بالآخر انگریزوں کی فتح کا سبب ثابت ہوئی اور تانتیا ٹوپے کو اپنی رہی سہی فوج کو لے کر جنوب کی راہ لینی پڑی۔ اس جنگ کے بعد پیشوا نانا صاحب، تانتیا ٹوپے سے جدا ہو گئے۔ اب تانتیا ٹوپے نے انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ کی حکمت عملی اختیار کی۔

تانتیا ٹوپے نے پہلے کالپی کا رخ کیا تاکہ وہاں رانی لکشمی بائی کی مدد کر سکیں۔ بعد ازاں انھوں نے بندیل کھنڈ میں انقلابیوں کو منظم کیا اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کا پرچم لہرایا۔ وہ مسلسل انگریزی فوج کے خلاف سرگرم عمل رہے اور اپنی گوریلا فوجی حکمتِ عملی کے سبب کئی محاذوں جیسے جیتوا، کچ گاؤں، کالپی وغیرہ میں انگریزی فوج پر چھاپے مارے اور اس کا بھاری جانی اور مالی نقصان کرتے رہے۔

پہلی جنگِ آزادی کے دوران میں تانتیا ٹوپے کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے

گوالیر فوج کے ہندوستانی کمانڈروں اور سپاہیوں کو انقلابیوں کا طرفدار بنالیا تھا جبکہ وہاں کا سربراہ حکومت، مہاراجہ جیاجی راؤ سیندھیا، انگریزوں کا وفادار تھا۔ جب کالپی کی جنگ میں رانی لکشمی بائی اور دوسرے انقلابیوں کی متحدہ فوج کو شکست ہوئی تو رانی صاحبہ اور راؤ صاحب نے گوپال پور میں پناہ لی جو گوالیر کے جنوب مغرب میں واقع ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ اسی مقام پر بہت جلد ان سے تاتیا ٹوپے بھی آملے۔ تینوں انقلابی رہنماؤں نے آپسی صلاح ومشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ ان نامساعد حالات میں گوالیر پر قبضہ کر کے اسے ایک نئے انقلابی مرکز میں تبدیل کیا جائے۔

تاریخی شواہد کی روشنی میں قطعی طور پر یہ طے کرنا تو دشوار ہے کہ گوالیر پر قبضہ کرنے کا اہم فیصلہ آیا رانی لکشمی بائی کی فوجی حکمت عملی کا نتیجہ تھا یا تاتیا ٹوپے کی فوجی قابلیت کا۔ میلے سن (Malleson) کی رائے کے مطابق تاتیا ٹوپے نے اپنی سوانح میں اس بات کی توثیق کی ہے کہ یہ تاریخی فیصلہ رانی صاحبہ نے کیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہی بات صحیح ہو، تاہم اس حقیقت کو بھی مدِّنظر رکھنا ضروری ہے کہ تاتیا ٹوپے نے اپنی سوانح عمری میں کسی بھی مہم کی کامیابی یا اہمیت کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا ہے۔ شروع سے آخر تک انھوں نے خود کو نانا صاحب اور رانی صاحبہ کا ملازم لکھا ہے۔ لہٰذا گوالیر پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کس نے کیا تھا یہ بات متنازعہ ہی رہے گی۔

بہر کیف فیصلہ کرنے کے بعد تینوں انقلابی رہنماؤں نے پہلے پُرامن طریقے سے مہاراجہ سیندھیا کو انقلابیوں کا طرفدار بنانا چاہا اور اس غرض سے اسے ایک خط بھی لکھا۔ خط کا متن یہ تھا:

> "ہم لوگ آپ کے پاس دوستانہ طریقے سے آرہے ہیں۔ آپ ہمارے پیشوا کے اور اپنے پرانے تعلقات کو یاد کیجیے۔ ہمیں آپ سے مدد کی امید ہے تاکہ ہم جنوب کی طرف بڑھ سکیں۔" (بحوالہ پنڈت سندرلال)

اس اثنا میں تاتیا ٹوپے خفیہ طریقے سے گوالیر میں داخل ہو کر مہاراجہ سیندھیا کے ردِّعمل کا انتظار کر رہے تھے۔ مہاراجہ نے دوستی کی پیش کش کے جواب میں انقلابی فوجوں پر حملہ کردیا۔ یکم جون 1858 کو مہاراجہ سیندھیا کی فوج نے انقلابی فوج، جس کی فوج کے زیادہ تر سردار اور سپاہی تاتیا ٹوپے سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ انقلابیوں کا ساتھ دیں گے، تو انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا

اور انقلابیوں سے مل گئے۔ اس یک لخت بدلی ہوئی صورت حال کے پیشِ نظر مہاراجہ سیندھیا نے راہِ فرار اختیار کی اور آگرہ میں جاکر پناہ لی۔ اس طرح گوالیر پر انقلابیوں کا قبضہ ہوگیا اور اس کارہائے نمایاں میں رانی لکشمی بائی کے علاوہ تانیتا ٹوپے نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔

گوالیر پر قبضہ ہونے کے بعد تانیتا ٹوپے نے نانا صاحب کی پیشوائی کا اعلان کیا اور ان کی جانب سے رانی لکشمی بائی کے ہمراہ، گوالیر میں انقلابیوں کی طاقت کو منظم کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ اگر گوالیر میں انقلابیوں کی طاقت مستحکم ہوجاتی تو انگریزوں کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ سب سے پہلی اور اہم بات تو یہ کہ انگریزوں کے لیے ممبئی اور شمالی ہند کے درمیان رابطہ قائم رکھنا بہت مشکل ہوجاتا۔ دوسری اہم بات یہ ہوتی کہ نانا صاحب کی پیشوائی اور تانیتا ٹوپے کی سپہ سالاری کی وجہ سے مغربی صوبجات اور دکن میں انگریزوں کا اقتدار متزلزل ہوجاتا۔ یہ بھی بہت ممکن تھا کہ مراٹھے نانا صاحب اور تانیتا ٹوپے کی قیادت میں متحد ہوکر کم از کم دکن سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ کردیتے۔

لیکن افسوس، صد افسوس، اس سے پہلے کہ تانیتا ٹوپے اور رانی لکشمی بائی، انقلابی فوج کو پوری طرح منظم کرکے گوالیر کو ایک طاقتور انقلابی مرکز بناتے، انگریزی فوج کے کمانڈر، سر ہیوروز، نے گوالیر پر فوج کشی کردی۔ سر ہیوروز نے مہاراجہ سیندھیا کو بھی اپنے ساتھ رکھا تھا تاکہ گوالیر کے عام لوگوں اور سپاہیوں کو یہ باور کروایا جاسکے کہ انگریزی فوج صرف مہاراجہ سیندھیا کا اقتدار بحال کرنا چاہتی ہے۔ لیکن انگریز اپنی اس سازش میں کامیاب نہ ہوسکے کیونکہ گوالیر کے عام لوگوں اور سپاہیوں نے انقلابیوں کی حمایت سے دست برداری نہیں کی۔ تاہم انگریزی فوج اپنی بے پناہ طاقت اور بہتر ہتھیاروں کی وجہ سے گوالیر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ گوالیر کی اس جنگ میں رانی لکشمی بائی نے شجاعت اور فوجی قابلیت کی بہترین مثال قائم کی تھی اور میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑتی ہوئی شہید ہوئی تھی۔ تانیتا ٹوپے نے بھی بڑی بہادری سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا تھا۔

گوالیر کی شکست کے بعد تانیتا ٹوپے چمبل سے ہوتے ہوئے راجپوتانہ کے علاقے

میں داخل ہوئے تھے۔ شکست نے ان کے حوصلے کو پست نہیں کیا تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ انگریزی سامراج کے خلاف مسلسل برسرِ پیکار رہیں گے اور اپنی رہی سہی فوج کو گوریلا جنگ کے طریقے میں ماہر بنا دیں گے۔ ان کے ساتھ بہت کم سپاہی رہ گئے تھے لیکن ان کی گھوڑ سوار فوج بہت زیادہ تربیت یافتہ تھی۔ انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ مغربی صوبوں اور دکن میں زیادہ تر عوام اور شاید کچھ حکمران بھی انگریزوں کے خلاف ان کے مشن کی پرزور حمایت کریں گے۔

راجپوتانہ کی صورت حال یہ تھی کہ 30 مارچ 1858 کو انگریزی فوج کے میجر جنرل رابرٹس نے انقلابیوں کے سردار مہاراؤ کو شکست دی تھی اور کوٹا پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ جب تاتیا ٹوپے اس علاقے میں پہنچے تو انگریزی فوج ان سے مقابلہ کرنے تیار بیٹھی تھی۔ تاتیا ٹوپے نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جے پور کو اپنے قاصد روانہ کیے جہاں انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ مل کر جنگِ آزادی میں حصہ لینا چاہتی تھی۔

رابرٹس کو جب اس بات کی خبر ملی تو اس نے نصیر آباد سے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ جے پور کی جانب کوچ کیا تاکہ تاتیا ٹوپے کے منصوبے کو ناکام بنا سکے۔ تاتیا ٹوپے نے اس نئی صورت حال کے مدِ نظر جنوب کا رخ کیا لیکن رابرٹس کی فوج برابر ان کے تعاقب میں لگی رہی۔ اس وقت راجپوتانہ میں گرمی کی شدت کا یہ حال تھا کہ تین دنوں میں انگریزی فوج کے بائیس سپاہی لُو لگنے سے مر گئے تھے۔ لیکن تاتیا ٹوپے کی فوج کے سپاہیوں، خصوصاً گھوڑ سواروں کو، ہر قسم کے موسم کی شدت کو برداشت کرنے کی عادت تھی۔ تاتیا ٹوپے نے اپنا سفر جاری رکھا اور ٹونک پہنچے۔ وہاں سے انھوں نے چار توپیں حاصل کیں۔ پھر انھوں نے مغرب کی جانب کوچ کر کے بندھیاچل کی پہاڑیوں کو پار کیا۔ اس وقت تک برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ شدید بارش کی وجہ سے راجپوتانہ کی تمام ندیوں میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ اس ناموافق موسم کے سبب بارہ دنوں تک تاتیا ٹوپے کی پیش قدمی رُکی رہی۔

جب رابرٹس کو پتہ چلا کہ تاتیا ٹوپے نے وندھیاچل کی پہاڑیوں کو پار کر لیا تو اس نے جمیر کا رخ کیا۔ وہاں اسے خبر ملی کہ تاتیا ٹوپے کی فوج نیچ کی جانب جا رہی ہے۔ رابرٹس ان کا

پیچھا کرتا رہا۔ جب انگریزی فوج کوٹاریا ندی کے کنارے پہنچی تو تانتیا ٹوپے کی انقلابی فوج ندی کے دوسرے کنارے پر بھیل واڑہ شہر کے قریب تھی۔ دوسرے دن دونوں فوجوں کے مابین چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئیں لیکن انگریزی فوج کو کوئی کامیابی نہیں ملی۔ اس دوران میں بریگیڈیر پارک (Parke) بھی اپنے سپاہیوں کے ساتھ رابرٹس سے آملا تھا۔ انگریزوں کو یہ خدشہ تھا کہ تانتیا ٹوپے اُجین جیسے دولت مند شہر پر حملہ کر کے اسے لوٹ نہ لے۔ لہٰذا کرنل لوک ہارٹ (Lockhart) کی قیادت میں مہو سے ایک دستہ اُجین کو بھیجا گیا۔ پھر فوراً ہی ایک دوسرا دستہ لیفٹیننٹ کرنل ہوپ (Hope) کی قیادت میں روانہ کیا گیا۔

تاہم تانتیا ٹوپے کے منصوبے دوسرے ہی تھے۔ وہ جھالراپاٹن (ایک راجپوت ریاست کی راجدھانی) پہنچے جہاں لوگوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ وہاں ان کی فوج کے لیے رسد کا بہت اچھا انتظام کیا گیا۔ توپیں اور دوسرے ہتھیار بھی مہیا کیے گئے۔ کئی مقامی انقلابی ان کی فوج میں شامل بھی ہو گئے۔ جب ستمبر 1858 میں تانتیا ٹوپے نے جھالراپاٹن سے اندور کی جانب کوچ کیا تو ان کے ساتھ نو ہزار انقلابی اور تیس توپیں تھیں۔ اگر تانتیا ٹوپے اندور پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو نانا صاحب پیشوا کے سپہ سالار کی حیثیت سے وہاں کے مراٹھا حکمراں، ہولکر، ان کی حمایت ضرور کرتے اور عوام تو ہمیشہ ہی نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے کے طرفدار رہے تھے۔

اس خطرے کو ہر قیمت پر ٹالنے کے لیے انگریزوں نے ایک بہت بڑی فوج تانتیا ٹوپے سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کی۔ لوک ہارٹ اور ہوپ کے دستوں کے ساتھ میجر جنرل مائیکل (Michel) بھی اپنی فوج کے ساتھ نال کیرا مقام پر آملا اور اس بڑی انگریزی فوج کی کمان اپنے ہاتھوں میں لی۔ راج گڑھ کے قریب انگریزوں کی اس بھاری بھرکم فوج نے تانتیا ٹوپے کی انقلابی فوج پر اچانک حملہ کیا۔ انقلابی اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہ تھے لہٰذا انھیں پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس شکست کے بعد انقلابیوں کے نہ صرف حوصلے پست ہوئے بلکہ ان کے آپسی اتحاد کو بھی زک پہنچی۔ تقریباً نصف سے زیادہ انقلابی تانتیا ٹوپے سے منحرف ہو کر راؤ صاحب کی قیادت میں شمال کی جانب کوچ کر گئے۔ تانتیا ٹوپے نے اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ

ہوشنگ آباد کے قریب نربدا ندی کو پار کیا۔ ان کا ارادہ ناگپور کی جانب پیش قدمی کا تھا لیکن جب انھیں یہ خبر ملی کہ ناگپور میں ان کی متوقع آمد کے انتظار میں انگریزی فوج گھات لگائے بیٹھی ہے تو وہ کارگن چلے گئے۔ وہاں سے ان کا ارادہ گجرات کی طرف جانے کا تھا لیکن بڑودا کے راجا نے بھی انگریزوں سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ وہاں بھی انقلابیوں کے لیے جائے پناہ نہ تھی۔ تانتیا ٹوپے کچھ دنوں تک بانسواڑا کے جنگلوں میں رکے رہے۔ اس بدبخت صورت حال میں یکا یک ایک امید کی کرن نمودار ہوئی۔ تانتیا ٹوپے کو اطلاع ملی کہ اودھ سے شہزادہ فیروز شاہ اور ان کے انقلابی ساتھی ان سے ملنے آرہے ہیں۔

اس ہمت افزا خبر کو سنتے ہی تانتیا ٹوپے نے فیروز شاہ سے ملنے کے لیے پرتاپ گڑھ کا رخ کیا۔ وہاں انگریزی فوج، جس کی قیادت میجر روک (Rocke) کر رہا تھا، سے تانتیا کے انقلابیوں کی جھڑپ ہوئی جس میں انگریزی فوج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اندرگڑھ مقام پر تانتیا ٹوپے اور فیروز شاہ کی ملاقات ہوئی۔ اب دونوں انقلابی قائدین کی متحدہ فوج دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔

انقلابیوں نے وسطی مالوہ سے شمالی راجپوتانہ کا رخ کیا۔ انگریزی فوج کرنل ہومز کی قیادت میں انقلابیوں کا پیچھا کرتی رہی۔ ریگستان کا ایک مشکل اور لمبا سفر طے کرنے کے بعد انقلابی فوج نے سیکر نامی مقام پر آرام کی خاطر پڑاؤ ڈالا۔ اچانک کرنل ہومز کی فوج نے سوتے ہوئے انقلابیوں پر حملہ کر کے، تانتیا ٹوپے اور فیروز شاہ، دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ انقلابی فوج اس غیر متوقع شب خون کے لیے تیار نہیں تھی نتیجتاً انھیں بھاری جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس شکست کے بعد تانتیا ٹوپے نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے چند قریبی انقلابیوں کو ساتھ لے کر پھر سے جنگل کا رخ کریں گے۔ انھوں نے فیروز شاہ کو الوداع کہا اور سرونج کے جنگلات کی طرف چلے گئے۔

سرونج کے جنگلات کا علاقہ مان سنگھ نامی ایک جاگیردار کی ملکیت تھا جو دراصل سیندھیا سرکار کا ایک امیر تھا۔ مان سنگھ اور سیندھیا کے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے سیندھیا سرکار نے اسے جاگیر سے بے دخل کر دیا تھا۔ جواباً مان سنگھ نے بغاوت کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا اور اپنے

ساتھیوں کے ساتھ وہ بھی سرونج کے جنگلات میں پناہ گزیں تھا۔ تاتیاٹوپے، مان سنگھ سے واقف تھے۔ سرونج کے جنگلات میں دونوں کی ملاقات ہوئی اور دونوں نے متحدہ طور پر جدوجہد جاری رکھنے کا تہیہ کیا۔

انگریزی فوج کو اس بات کا پتہ تھا کہ تاتیاٹوپے اور مان سنگھ سرونج کے جنگلات میں چھپے ہوئے ہیں اور کسی وقت بھی انگریزوں کے حلیف مہاراجا سیندھیا کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ میجر جنرل رچرڈ میڈ (Richard Meade) کو تاتیاٹوپے اور مان سنگھ کی سرکوبی کے لیے مامور کیا گیا۔ میڈ نے مان سنگھ کے ایک رشتہ دار سے ربط پیدا کر کے اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ کسی طرح مان سنگھ کو انگریزوں کی امان میں آنے کے لیے راضی کر لے۔ چنانچہ انگریزوں کی چال کامیاب ہوئی۔ مان سنگھ کو اس کی ضبط شدہ جاگیر کی بحالی کا لالچ دے کر میڈ نے اسے اس بات پر راضی کرا لیا کہ وہ تاتیاٹوپے کو گرفتار کرنے میں انگریزوں کی مدد کرے۔ چنانچہ مان سنگھ کی غداری کی وجہ سے تاتیاٹوپے کو سوتے میں گرفتار کر کے شیوپوری لے جایا گیا۔

15 اپریل 1859 کو شیوپوری میں تاتیاٹوپے کا کورٹ مارشل کیا گیا اور انھیں موت کی سزا سنائی گئی۔ تین دنوں بعد یعنی 18 اپریل کو انھیں پھانسی دے دی گئی۔ آج اس جگہ جہاں تاتیاٹوپے کو پھانسی دی گئی تھی، ان کا ایک مجسمہ نصب ہے اور یہ جگہ شیوپوری کلکٹریٹ سے بہت قریب ہے۔

ان تاریخی حقائق کے علاوہ مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش میں تاتیاٹوپے کے متعلق ایسے قصے بھی مشہور ہیں جو اپنی نوعیت میں دیومالائی داستانیں کہے جاسکتے ہیں۔ یہاں ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ مہاراشٹر کے اکولہ ضلع میں شری گجانن مہاراج کی سمادھی اور اس سے منسلک آشرم عقیدتمندوں کے لیے ایک مقدس تیرتھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عوامی روایت کے مطابق گجانن مہاراج اور کوئی نہیں بلکہ تاتیاٹوپے ہی تھے۔ ایک قصے کی رو سے جب تاتیاٹوپے کو گرفتار کیا گیا اور انھیں شیوپوری منتقل کیا گیا تو وہاں کا انسپکٹر تاتیاٹوپے کا گہرا دوست تھا۔ اس نے تاتیاٹوپے کو یہ صلاح دی کہ اگر وہ کسی دوسرے شخص کو ان کی جگہ پھانسی پر چڑھ جانے کے لیے راضی کر لیں تو وہ انھیں ہمیشہ کے لیے آزاد کر دے گا۔ لیکن آئندہ انھیں اپنی شناخت کو پردۂ راز میں رکھنا ہوگا۔

چنانچہ تاتیا ٹوپے کے ایک وفادار ساتھی نے ان کی جگہ خود پھانسی لے لی۔ بعدازاں تاتیا ٹوپے نے رہبانیت کی طرز زندگی اختیار کر کے شری گیان مہاراج کا روپ دھارن کر لیا تھا۔

ایک دوسری روایت کے مطابق تاتیا ٹوپے اور مان سنگھ بہت گہرے دوست تھے۔ چنانچہ یہ بات گمان میں بھی نہیں لائی جاسکتی کہ مان سنگھ نے غداری کرتے ہوئے تاتیا ٹوپے کو انگریزوں کے حوالے کیا ہوگا۔ دراصل مان سنگھ کے ایما پر تاتیا ٹوپے کا ایک وفادار ساتھی خود کو انگریزوں کے حوالے کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ جنرل میڈ اور دوسرے انگریزوں کو تھوڑا شبہ تو ضرور ہوا تھا کہ گرفتار شدہ شخص تاتیا ٹوپے ہے یا نہیں۔ تاہم ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ اس لیے تاتیا ٹوپے کے ساتھی ہی کو پھانسی دے دی گئی اور تاتیا نے خود گیان مہاراج کا بھیس اختیار کر لیا۔

یہ افسانوی روایات اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ وسطی ہندوستان اور مہاراشٹر میں تاتیا ٹوپے کو کس عقیدت اور عزت سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں وہ ایک انتہائی بہادر اور زیرک فوجی قاید تھے۔ ان کی فوجی حکمتِ عملی کے سبب کانپور میں انگریزوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ ان کی بہادری اور فوجی قابلیت کا اعتراف تو خود انگریز مورخ بھی کرتے ہیں چنانچہ پی جے او ٹیلر (P.J.O. Taylor) جسے ہندوستانیوں کی پہلی جنگ آزادی کا مستند مورخ سمجھا جاتا ہے اپنی مشہور کتاب، غدر کے دوران درحقیقت کیا بیتی، (What Really Happenned During the Mutiny) میں تاتیا ٹوپے کے تعلق سے ان خیالات کا اظہار کرتا ہے:

> "تاتیا ٹوپے کو 1857 کے غدر کا سب سے قابل لیڈر سمجھا جاتا ہے۔ اس نے پرانے مراٹھا طرز پر جنگ لڑی۔ اپنی پوری فوج کو کسی ایک لڑائی کے لیے کبھی بھی استعمال نہیں کیا۔ اکثر اپنی طاقت کو ایک شدید جنگ کی تیاری کے لیے "پیچھے ہٹنے" کی ترکیب استعمال کی حتیٰ کہ بعض ایسے حالات میں بھی وہ پیچھے ہٹا جو اس کے حق میں تھے۔ اس طرح وہ دشمن کو تھکا دینا چاہتا تھا۔ اس کی گوریلا جنگ کی وجہ سے وسطی ہندوستان میں غدر نے کافی طول کھینچا جب کہ اودھ اور شمالی ہند میں بہت پہلے اس کا خاتمہ ہو گیا تھا۔۔۔ اسے کانپور کی دوسری لڑائی میں ایک شبت فتح حاصل ہوئی تھی جس

میں اس نے گوالیر فوج کی قیادت کمانڈر انچیف سرکولن کیمبل (Sir Colin Campbell) کے خلاف کی تھی۔"

بہرکیف ہندوستانیوں کی پہلی جنگِ آزادی کے سورما تانتیا ٹوپے کا شمار ہمیشہ ہندوستان کے عظیم شہیدوں میں ہوتا رہے گا۔

حوالہ جاتی کتب:

1. History of the Indian Mutiny by T. Rice Holmes
2. Bntish Rule in India by Pandit Sunderlal.
3. Empire in India by Major Evans Bell.
4. History of the Sepoy War by T. Rice Holmes.
5. History of the Sepoy War by Sir John Kaye.
6. What Really Happened During the Mutiny by P.J.O. Taylor.

اقبال حسین

مولوی لیاقت علی، الہ آبادی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 کی پہلی جنگ آزادی کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس سال ہندوستان کے عوام میں گزشتہ ایک صدی سے انگریزی حکومت کے طور طریقوں، استحصال کی پالیسی کے خلاف پنپنے والا جوالا مکھی پھوٹ پڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور حکومت کی باگ ڈور ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ جنگ راجاؤں، مہاراجاؤں اور نوابوں نے نہیں شروع کی تھی اس کے پیچھے عوام کی غریب اور مفلوک الحال اکثریت تھی جس میں فوجی، کسان، مدرسین، سرکاری ملازمین، بنکر، دستکار اور دوسرے محنت کش افراد تھے۔ اس جنگ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس جنگ میں بعض نوابین، راجاؤں، تعلقہ داروں اور زمینداروں نے بھی مجاہدین آزادی کا ساتھ دیا تھا لیکن ان کی جدو جہد کے پس پشت ان کی اپنی محرومیاں، ناکامیاں اور برطانوی حکومت کے خلاف غم وغصہ کارفرما تھا۔ مثلاً بہادر شاہ ظفر، مہارانی لکشمی بائی، کنور سنگھ، بیگم حضرت محل، نانا صاحب وغیرہ کی حکومت وقت سے ذاتی شکایتیں اور ناراضگیاں تھیں۔ یہ لوگ جب برطانوی حکمرانوں کے طرز عمل سے مایوس ہوگئے تو سوائے جنگ کے اور کوئی راستہ نہ تھا جس کی راہیں بنگال آرمی کے فوجیوں نے میرٹھ میں 10 مئی 1857 کو جنگ آزادی کا علم اٹھا کر استوار کی تھیں۔ یہ امر بہرحال قابل قدر ہے کہ ایک بار ہتھیار اٹھا لینے کے بعد یہ لوگ آخر دم تک برطانوی حکومت سے برسرپیکار رہے۔ لیکن اس جنگ میں اصلاً ان غریب اور نادار بیکار و مفلوک الحال دستکاروں، بنکروں، کاشتکاروں، فوجیوں کا

ہاتھ تھا جو برطانوی اقتدار کی توسیع اور استحصال کی حکمت عملی کا شکار ہو کر فقر و فاقہ کی زندگی گذار رہے تھے۔ اس جنگ آزادی میں دستکاروں، کاشتکاروں اور دیگر محنت کشوں کی طرح مدرسوں کے معلموں اور مسجد کے اماموں کا بھی بڑا ہاتھ تھا جن کی روزی حکومت وقت کی پالیسی سے مشکلات کا شکار تھی۔ اس طبقہ نے مدد معاش کے بند ہونے اور مدرسوں و مساجد کو جاری رکھنے کے لیے دین کا سہارا لیا، کیوں کہ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں عیسائی مشنریوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تبدیلی مذہب کی تلقین کرنی شروع کر دی تھی۔ ان کی دینی حمیت کا تقاضہ تھا کہ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی منظم کوششوں کا تدارک کیا جائے بالخصوص جب کہ عیسائی مبلغین کو فوج میں بھی تبلیغ کی پوری اجازت دے دی گئی تھی جو اعلانیہ اسلام اور ہندو مذاہب کی مذمت کرتے تھے۔ ملک کے لوگ پہلے ہی برطانوی حکومت سے بیزار تھے جب ان کے عقائد اور ایمان پر حملے ہونے لگے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا وہ حکومت وقت کے خلاف صف آرا ہو گئے اور بغاوت شروع ہو گئی۔ اس بغاوت میں الہ آباد کے ایک مدرسہ کا بوریہ نشین ایک مدرس بھی تھا جسے مولوی لیاقت علی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ غالباً موضع مہاگاؤں، پرگنہ چائل کے رہنے والے تھے۔ شہابی کے مطابق فقہ میں بھی دخل تھا اور ان کے تقدس کی بڑی شہرت تھی۔ [1] آپ کے سن پیدائش اور ابتدائی زندگی کے حالات قدرے تاریکی میں ہیں۔ تاہم روزنامچہ نیشنل ہیرالڈ، یکم ستمبر 1957 میں شائع ہونے والے ایک مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی لیاقت علی موضع مہاگاؤں کے باشندہ تھے اور منصب قضا پر فائز تھے۔ یہاں انتظام اللہ شہابی کا یہ بیان قابل ذکر ہے:

> "مولانا لیاقت علی صاحب قادریہ سلسلہ کے شیوخ میں تھے۔ چائل اور الہ آباد کے کثیر التعداد نفوس آپ سے بیعت تھے۔" [2] قرائین سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم رسم زمانہ کے مطابق حاصل کی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی تعلیم کہاں تک ہوئی لیکن ان کی تحریر اور قرآنی معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اچھی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ [3] آپ نے زندگی کا آغاز فوج کی ملازمت سے کیا تھا لیکن حکومت مخالف سرگرمیوں کے الزام پر آپ کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔ [4] نوکری

چھوٹ جانے کے بعد مولوی لیاقت علی الٰہ آباد اپنے گاؤں لوٹ آئے۔ مہا گاؤں کی مسجد میں امامت کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اپنی علمی صلاحیتوں، مذہبی انہماک، خدا ترسی اور عوام دوستی کی وجہ سے مولوی صاحب کی شہرت قرب و جوار میں پھیل گئی۔ آپ کے تقدس نے لوگوں کو متاثر کیا۔ الٰہ آباد اور چائل کے بہت سے لوگ آپ کے مرید ہو گئے۔(5)

10 مئی 1857 کو میرٹھ میں فوجیوں نے انگریزی سامراج کے خلاف بغاوت کر دی۔ جلد ہی شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقے انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ الٰہ آباد میں انگریزی حکومت کے خلاف بے چینی مئی سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ انگریزوں کے لیے پورا ماہ مئی سخت گذرا۔ انگریزوں نے اپنی حفاظت کے لیے الٰہ آباد کے قلعہ کو اپنا مستقر بنایا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہیں منتقل ہو گئے۔ لیکن جون کی ابتدا میں، الٰہ آباد کو محفوظ سمجھ کر انگریز اپنے اپنے مسکنوں پر لوٹ آئے۔ 6 جون 1857 کو الٰہ آباد میں تعینات چھٹی رجمنٹ کے سردار رام چند نے بغاوت کا علم بلند کیا۔[6] اس کے بعد پورا ضلع انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔[7] مولوی لیاقت علی جو عرصے سے انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل تھے اور بقول شہابی اپنے وعظ و تذکیر میں اقتدار نصاریٰ پر تلمیحاً اشارہ کر جاتے، اپنے مریدین کو جہاد کی ترغیب و تشویق کی تلقین کرتے۔[8] مولوی صاحب گویا اس وقت کے منتظر تھے وہ بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ نے مہا گاؤں کو اپنا مستقر بنایا۔[9] ان کے جہاد کے نعرہ پر ان کے مریدوں نے لبیک کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے موضع صمد آباد، رسول پور اور دوسرے علاقہ کے مسلمانوں کے علاوہ بہت سے دوسرے طبقہ کے لوگ جن میں فوجی بھی شامل تھے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔[10] مسلمانوں کے اتحاد اور جوش کا اندازہ پنڈت کنہیا لال کی درج ذیل تحریر سے کیا جا سکتا ہے۔

> "ایک مسلمان جہادی نے جس کا نام اب تک بخوبی صحت کو نہیں پہنچا مگر نام زد یہ مولوی صاحب لقا جھنڈا سرکشی بخلاف سرکار انگریزی قائم کر کے اکثر بدمعاشوں کو جمع کیا۔ مشہور ہے کہ یہ شخص کسی مکتب میں پڑھاتا تھا۔ لیکن جب ان احسان فراموش محسن کش سپاہ نے بلوہ عام کیا اور سپاہ گورہ کا ان کی سرکوبی کو موجود نہ تھی۔ مگر یہ دو امر ظاہر تھے۔ ایک تو یہ کہ اتفاق مسلمانوں میں جیسا کہ مشہور ہے اور دوسرے یہ کہ

> مسلمان انگریزوں کو کلیتہً ناپسند کرتے ہیں کیونکہ جس وقت مسلمانوں نے سنا کہ ایک مولوی کھڑا ہوا ہے صدہا روز آ کر جمع ہو جاتے تھے اور غرض سب کی یہ تھی کہ گورہ لوگ یعنی انگریزوں کو بیخ و بن سے نیست و نابود کر دیں۔(11)

اس شہادت سے یہ امر ثابت ہے کہ مولوی لیاقت علی کا نہ صرف ضلع الہ آباد کے مسلمانوں میں بڑا اثر تھا بلکہ ان کی جہادی تحریک پر لوگ ان کے گرد کثرت سے جمع ہو گئے تھے۔ شہر الہ آباد میں مولوی صاحب نے اپنا جہادی مستقر مشہور تاریخی عمارت خسرو باغ میں قائم کیا تھا۔[12] فوج کے باغی افسر رام چند اور بہت سے دوسرے فوجی مولوی صاحب کے حلیف تھے۔ رام چند کی تجویز پر مولوی صاحب کو 7 جون 1857 کو الہ آباد کا حاکم منتخب کیا گیا۔[13] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولوی صاحب کو ضلع الہ آباد کے میواتیوں کا زبردست تعاون حاصل تھا۔ 5 جون 1857 کو موضع شمس آباد میں میواتیوں کی پنچایت ہوئی تھی جس میں سوائے سیف خاں کے تمام لوگوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔[14] 6 جون 1857 کو کیپٹن (Gwyn) پلٹن نے مع سواروں اور میواتیوں کے بغاوت کر دی۔[15] خزانہ لوٹ لیا گیا۔ بغاوت میں شمس آباد، رسول پور، موضع بیلی، بگھرا، شادی آباد، جون الل، سیوری یا سلوری، فتح پور، بچھوا، کٹرہ، کرنل گنج، جہاد پوری، بختیارا، بختاوری، رسول پور، منہاج پور اور دوسری جگہوں کے میواتیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خسرو باغ میں مولوی لیاقت علی کے آ جانے کے بعد رسول پور اور شمس آباد کے میواتیوں کے علاوہ دوسرے لوگ مولوی لیاقت علی کے گرد جمع ہو گئے۔ مولوی صاحب نے شہر کا نظم و نسق قائم کرنے کے لیے کوتوال، تھانہ دار، تحصیل دار اور فوج کے افسران کا تقرر کیا۔[16] مولوی لیاقت علی کی قیادت دن بہ دن مضبوط ہوتی گئی اور جن میں مہا گاؤں، کویلہا، سرائے سلیم، سیورودھا، فتح پور، برمہر، چائل خاص، کشیا بڑا گاؤں، شیخ پور، انگڑ عرف کڑ گاؤں شاہا عرف نبل گاؤں، محی الدین پور غوث، بیگم سرائے، اودانی، امراؤتی، چک راج پور، لودھرا، کورئی، امرچاہا، بختیارا...... بگھرا، بیلی، چھت پور، نیمی باغ، رسول پور، دیہہ، منہاج پور، ردحی، غیاث الدین، کسمندھ، سرائے موجہ یا سرائے، مانجا، عمر پور ساداں یا عمر پور رضوان، منو کے لوگ ان کے شریک اور مددگار رہے۔[17]

الہ آباد میں قیادت سنبھالنے کے بعد مولوی لیاقت علی کے سامنے کئی مسئلے تھے ان میں اہم ترین مسئلہ خود مسلمانوں میں اتحاد قائم رکھنا اور ان کو جہاد کے لیے تیار رکھنا تھا۔ مسلمانوں کے ایک طبقہ کا نظریہ تھا کہ جہاد کا نعرہ صرف رسول اللہ یا امام ہی دے سکتا تھا۔ سنی مسلمانوں میں بھی ایک چھوٹا طبقہ ایسا تھا جس کی قیادت حافظ رحمت اللہ کر رہے تھے، جہاد کے خلاف تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ یہ جہاد نہیں بلکہ سیاسی جنگ ہے۔[18] صورت حال کے پیش نظر مولوی لیاقت علی نے مسلمانوں کو متحد رکھنے اور جہاد کی فضیلت اور ثواب سمجھانے کے لیے دو اعلانیے جاری کیے تھے۔ ایک منظوم اور دوسرا غیر منظوم۔ ان اشتہارات کو بقول پنڈت کنہیا لال، مولوی صاحب نے شاہ اودھ یعنی برجیس قدر کو بھیجا تھا اور قرب و جوار میں مشتہر کیا تھا۔[19] اس اعلانیہ کے ذریعہ مولوی لیاقت علی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جہاد کی اہمیت اور فضیلت بتا کر جہاد کی ترغیب دی تھی۔ غیر منظوم اعلانیہ جہاں ایک طرف جہاد کا پیغام دیتا ہے وہیں برطانوی حکومت کے سوسالہ سیاہ کارناموں کا مختصر جائزہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس اعلانیہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کی برطانوی حکومت سے شدید شکایت اور ناراضگی کی وجہ ملک میں قتل و غارت گری، آتش زنی، پھانسی، انہدام مکانات، چھاپہ زنی، خونریزی، علما اور مشائخ کے ساتھ برے سلوک، احراق کلام اللہ واحادیث و کتب فقہ سرفہرست تھے۔[20] نثری اشتہار میں مولوی لیاقت علی نے جہاد کے متعلق قرآن کی آیات اور ان کا اردو ترجمہ بھی دیا ہے تا کہ لوگوں پر جہاد کی مذہبی حیثیت اور اہمیت واضح ہو سکے۔

مولوی لیاقت کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ آس پاس کے اہم اور بااثر حضرات جن میں نظام اشرف، غلام اسمٰعیل، محمد حسین، چودھری میراں بخش، مولوی سید احمد علی، مولوی غلام حیدر، مولوی امجد علی، حسین علی خاں، شیر خاں، شیخ لطف علی، شیخ نجف علی نائب کوتوال وغیرہ شامل ہیں مولوی صاحب کے ساتھ شریک جہاد ہو گئے۔[21] مولوی صاحب نے اتحاد اور جہاد کی عملی کوششوں کے بعد دوبارہ ضلع کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی۔ آپ نے سیف اللہ خاں اور سکھ رائے کو چائل کا تحصیلدار مقرر کیا۔[22] قاسم علی خاں اور نعمت اشرف کو کوتوال کے عہدہ پر مامور کیا۔ چودھری شہاب الدین نائب کوتوال مقرر کیے گئے۔ موضع بھکا کے زمینداران ہادی اور فیض اللہ،

مولوی صاحب کی فوج میں افسر مقرر ہوئے۔[23] ان تقریروں اور مولوی لیاقت علی کی توجہ کا فوری اثر یہ ہوا کہ الٰہ آباد شہر غنڈوں کی لوٹ مار سے محفوظ ہو گیا، قرب و جوار میں بھی امن قائم ہو گیا اور لوٹ مار کا بازار بند ہو گیا۔[24]

مولوی صاحب کے سامنے انگریز اور ان کی فوج بڑے مسائل تھے۔ وہ مولوی صاحب کے الٰہ آباد پر قبضہ کے بعد سے قلعہ بند ہو گئے تھے۔ قلعہ میں گولہ بارود، اسلحوں کے علاوہ ضروریات زندگی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ قلعہ میں انگریزوں کے علاوہ تقریباً چار سو تربیت یافتہ سکھ فوجی موجود تھے۔ برخلاف اس کے مولوی لیاقت علی اور ان کے رفقا کو نفری برتری ضرور حاصل تھی لیکن ان کی کثیر تعداد جدید ہتھیاروں کے استعمال سے ناواقف تھی، انھیں کوئی جنگی تجربہ نہیں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ بغاوت کی ابتدا میں ان کے ہاتھ سامان حرب اور گولہ بارود خاصی مقدار میں لگا تھا لیکن ان کا مقابلہ ایسے افراد سے تھا جو آداب جنگ سے پوری طرح واقف اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔ تاہم مولوی لیاقت علی نے الٰہ آباد قلعہ پر حملہ کر کے قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔[25] دریں اثنا 7 جون 1857 کو لیفٹیننٹ آرنلڈ انگریزی فوج کے لیے کمک لے کر الٰہ آباد پہنچا۔ انگریزوں کی دوسری کمک 9 جون کو کشتیوں کے ذریعہ قلعہ الٰہ آباد میں پہنچی۔ مجاہدین آزادی کی توجہ صرف شہر اور بعض اہم کشتی کے پلوں تک محدود تھی اور غالباً وہ قلعہ کی مکمل طور پر ناکہ بندی نہیں کر سکے تھے۔ اس کے علاوہ الٰہ آباد کو مجاہدین آزادی سے واپس حاصل کرنے کے لیے برطانوی گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے آزمودہ اور جنگی تجربہ کار کرنل گورڈن نیل کو مامور کیا۔[26] کرنل نیل تیسری کمک کے ساتھ 11 جون کو الٰہ آباد پہنچا اور مجاہدین آزادی کے خلاف محاذ آرا ہو گیا۔[27] 14 جون 1857 کے ایک انگریز کے مراسلہ سے پتہ چلتا ہے کہ پورے ضلع میں انگریزوں کے خلاف سخت غصہ تھا وہ لکھتا ہے: "یہاں ہم چاروں طرف سے سپاہیوں، مسلمانوں، گنواروں اور حقیقتاً تمام خلقت سے گھرے ہوئے ہیں۔ اناج کی سخت کمی ہے اور ہمارے آدمی کام کی زیادتی اور کھلے ہونے کی وجہ سے دردناک موت مر رہے ہیں۔ دشمن بہت مضبوط حالت میں ہے یہاں سے تین میل دور شاہی باغ میں ہے۔"[28] ایک دوسرا مراسلہ میں کہا گیا ہے: "تمام

ملک ہتھیار اٹھا چکا ہے۔ چند دیسی ملازمین جو قلعہ میں رہ گئے ہیں وہ بھی جلد ہی بھاگنے والے معلوم ہوتے ہیں۔"[29] دل چسپ بات یہ ہے کہ قلعہ میں موجود چار سو سکھ فوجی، اپنی اہمیت سے آگاہ ہو کر من مانی پر اتر آئے تھے۔ وہ تمام فوجی ضابطوں کو خیر باد کہہ کر نہ صرف لہو ولعب اور شراب نوشی میں مبتلا ہو گئے تھے بلکہ انگریزوں سے بھی درشتگی سے پیش آنے لگے تھے۔[30] کرنل نیل نے بہر حال بڑی ہوشیاری سے قلعہ کے نظم و نسق کو سنبھال لیا۔

دریں اثنا مولوی لیاقت علی نے شہر پر اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ دارا گنج کا پل بھی ان کے قبضہ میں تھا۔ گرد و نواح میں جہادیوں نے آزاد حکومت کا اعلان کر کے انگریزی حکومت کے خاتمہ کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ خاص طور پر رسول پور، صمد آباد، فتح پور، کچھوا، بکسارا، سالوری، شادی آباد، منہاج پور، بخشی وغیرہ کے مسلمان زمیندار مولوی صاحب کے ساتھ ہو چکے تھے۔ مجاہدین آزادی کے ہدف انگریزوں کی رہائش گاہیں، جائیداد، تحصیل، تھانے اور اسٹیشن تھے جو ان کی حکومت اور اقتدار کی علامت تصور کیے جاتے تھے۔[31] مولوی لیاقت کا اثر جمنا پار کے جنوبی علاقوں پر کم تھا غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ منڈا راجہ کا اس علاقہ پر بہت اثر تھا جو برطانوی حکومت کا مددگار تھا۔ اس علاقہ میں کچھ لوگوں نے جب بغاوت کی تو راجہ مذکور نے اسے ناکام بنا دیا۔ اس کے ساتھ راجہ دتا اور ہیرا بھی تھے۔[32] بہر حال جمنا سے متصل موضع دھراول کے زمیندار ڈھاکن سنگھ نے بغاوت میں پورا تعاون کیا اس کے قرب و جوار کے زمیندار اس کے شریک تھے۔ ڈھاکن سنگھ اور ہنومنت سنگھ کی گرفتاری کے لیے برطرف انگریزی حکومت نے ایک ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ الٰہ آباد اور اس کے قرب و جوار میں مجاہدین آزادی کی سرگرمیاں بہت تیز تھیں۔ ایک انگریز افسر لکھتا ہے کہ دوآبہ کی مسلمان آبادی، مسلمان زمینداروں کی قیادت میں جنونی مذہبی جنگ کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔[33] الٰہ آباد کے شمال مشرق کے گنگا پار کے علاقہ میں عوام تیج مل سنگھ تعلقدار فقیر بخش تعلقہ دار پرگنہ جھوسی کی قیادت میں انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے۔[34] ایشوری بخش، اور چھتر پتی سنگھ موضع سوماپور، پرگنہ نواب گنج میں مجاہدین آزادی کی قیادت کر رہے تھے جب کہ راجہ گلاب سنگھ (الٰہ آباد) بغاوت میں پہلے ہی پیش پیش تھے۔[35] مجموعی طور پر ضلع کے بیشتر حصہ میں لوگ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے۔ مولوی لیاقت

علی کا ان سب کو غیر ملکی حکومت کے خلاف صف آرا کرنے میں بڑا ہاتھ تھا۔

یوں الہ آباد انگریزوں کے خلاف ہو چکا تھا لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کی کوششوں کے باوجود، مجاہدین آزادی کے مختلف قائدین کے درمیان کوئی موثر رابطہ نہیں قائم ہو سکا تھا۔ ہر علاقہ کا اپنا خود آزاد رہنما تھا۔ مولوی لیاقت علی نے ضلع میں جس طرح کا نظم قائم کرنے کی کوشش کی تھی اس کا اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ ضلع کے شر پسند عناصر قابو میں کر لیے گئے تھے۔ بہر نوع چونکہ الہ آباد میں کوئی ایسا مرکزی نظم نہیں قائم ہو سکا تھا اس لیے ضلع کے تمام مجاہدین آزادی منتشر ہی رہے، ان کا آپس میں کوئی رابطہ نہیں قائم ہو سکا جن کی وجہ سے ان کی قوت منتشر رہی۔ مولوی لیاقت کے پاس جو جمعیت تھی وہ بھی ایک شکست کے بعد بے سروسامانی کا شکار تھی۔ جیسا کہ ان کے اعلان (دیکھیے ضمیمہ) سے معلوم ہوتا ہے ایسی صورت حال میں مولوی صاحب کا انگریزوں کے خلاف زیادہ دنوں تک برسر پیکار رہنا ممکن نہ تھا۔ انگریزوں کو فوجی مدد 7 جون سے ہی ملنے لگی تھی۔ 12 جون کو کرنل نیل کی قیادت میں انگریزی فوج نے دارا گنج کے کشتیوں کے پل پر ایک سخت مقابلہ کے بعد قبضہ کر لیا۔ [36] کرنل نیل اور اس کی معاون سکھ فوج نے عوام پر ظلم اور بربریت کی بدترین مثالیں قائم کیں۔ کپتان ہمینڈ کے توپ خانہ نے دریاباد اور اس کے نواح کے علاقوں پر آگ برسائی اسی وقت سکھ نے فوجی ٹکڑی کپتان بریزیر (Brasyer) اور لیفٹننٹ بیلی کی قیادت میں قائد گنج، مواہہ گنج وغیرہ کے علاقوں پر قلعہ سے بمباری کر کے ان مواضع پر حملہ کر کے دریاباد کے علاقوں تک کو تہس نہس کر دیا۔ [37] اس فتح کے بعد کرنل نیل نے سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کو اپنے مراسلہ میں لکھا کہ وہ حملہ کرے گا اور مکمل طور پر شہر کے گرد و نواح کے تمام مواضعات کو برباد کر دے گا کیونکہ باغیوں کو یہیں سے مدد مل رہی تھی۔ [38] 14 جون کو انگریزی فوج نے مولوی لیاقت علی پر حملہ کیا لیکن مولوی صاحب اور ان کے رفقا نے انھیں شکست فاش دی۔ [39] انگریزی فوج فرار ہو کر قلعہ الہ آباد میں پناہ گزین ہوئی۔ [40] اس فتح نے مولوی لیاقت علی اور ان کے رفقا کے حوصلے بلند کر دیے۔ [41] مگر 16 جون کو مزید انگریزی کمک آ جانے سے طاقت کا توازن بالکل بدل گیا۔

کرنل نیل نے اپنے منصوبہ کے تحت 16 جون سے ہی الہ آباد کے گرد و نواح میں

فوجی کارروائی شروع کردی۔ دریا آباد کی مسلمان پٹھان آبادی، سعد آباد، رسول پور اس کا پہلا ہدف بنیں۔ اس نے ان آبادیوں کو تہس نہس کر دیا۔ کنہیالال کے الفاظ میں: "وہاں جاکر خوب قتل عام کیا اور مسلمانوں کو اچھی طرح نصیحت دی۔"[42] عصبیت کے شکار کرنل نیل نے الٰہ آباد کے قلعہ کے مغربی سرے پر واقع جامع مسجد کو بھی نہیں بخشا۔ اسے شہید کر کے بیرک میں تبدیل کر دیا۔[43] مولوی لیاقت علی نے اپنے رفقا کے ساتھ ایک بار پھر کرنل نیل کے خلاف صف آرائی کی لیکن اسلحہ کی کمی اور غیر تربیت یافتہ فوج کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ مجبوراً تین ہزار رفقا کے ساتھ وہ اپنے مستقر خسرو باغ لوٹ آئے۔[44] کرنل نیل نے مولوی لیاقت کی پسپائی سے پورا فائدہ اٹھا کر خسرو باغ کا محاصرہ کر لیا۔ دریں اثنا غالباً برطانوی افسران یا انگریز نواز مفاد پرستوں کی طرف سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ انگریزی فوج شہر کو تباہ کرنے کے لیے گولہ باری کی تیاریوں میں مصروف ہے تاکہ مولوی لیاقت علی اور ان کے رفقا کو مع ان کے معاونین کے تباہ کر دیا جائے۔ کرنل اور اس کی فوج کی بربریت اور شقاوت قلبی کا علم مولوی لیاقت علی کو صمد آباد، رسول پور، اور دیگر علاقوں کے قتل عام سے ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب کے پاس دو ہی راستے تھے یا جنگ جاری رکھتے ہوئے پورے الٰہ آباد کو انگریزوں کے توپ خانہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں یا شہر خالی کر کے چلے جائیں تاکہ آبادی کو کم سے کم نقصان ہو۔ مولوی صاحب نے دوسری راہ اختیار کی تاہم انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کی آگ جو ان کے دل میں جل رہی تھی، انھیں کھینچ کر مراٹھا باغی سردار نانا صاحب پیشوا کے پاس لے گئی۔[45] مولوی لیاقت علی اور ان کے ساتھی کس طرح انگریزوں کے حصار کو توڑ کر نکلنے میں کامیاب ہو سکے، یہ واضح طور پر نہیں معلوم ہوتا۔ انگریز اور ہندوستانی مورخین بھی اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔[46]

مولوی لیاقت علی کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے انگریزوں کو مایوسی ہوئی۔ ان کی گرفتاری کے لیے اشتہارات شائع کیے گئے اور انعامات کا اعلان کیا۔ مولوی صاحب، نانا صاحب کی فوج کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے خلاف جنگ آزما رہے لیکن نانا صاحب بھی زیادہ دنوں تک انگریزوں سے جنگ جاری نہ رکھ سکے۔ نانا صاحب اپنے رفقا کے ساتھ کان پور سے فرار ہو گئے تو مولوی صاحب کا کان پور میں رہنا بے کار تھا۔ مولوی لیاقت علی کان پور سے

کہاں گئے یہ نہیں معلوم ہوتا۔ بعد کے حالات سے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مولوی صاحب برسوں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھرتے رہے۔ غالباً بارہ برس کی صحرانوردی کے بعد مولوی صاحب کو ممبئی میں گرفتار کیا گیا۔ ان پر حکومت برطانیہ کے خلاف بغاوت کرنے کی فرد جرم عائد کی گئی۔ مقدمہ چلا اور ایسے مقدمات میں حکومت کا جو رویہ ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بہرحال بارہ سال کی صحرانوردی اور جیل کی سختیوں کے باوجود، مولوی صاحب اپنے موقف پر جمے رہے۔ انھوں نے نہ صرف بغاوت میں شرکت اور باغیوں کی رہنمائی کو تسلیم کیا بلکہ برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد اور حرب آرائی پر فخر کیا۔ اس یقین کا بھی اظہار کیا کہ ہندوستان سے انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہوکر رہے گا۔ مولوی صاحب کی صاف گوئی نے عدالت کا کام آسان کر دیا۔ آپ مجرم قرار دیے گئے اور حبس دوام کی سزا ہوئی۔ آپ کو ممبئی سے جزیرہ انڈمان بھیج دیا۔ چند دنوں بعد وہیں انتقال ہو گیا۔[47]

مولوی لیاقت علی کے اخلاف کے متعلق کچھ نہیں ملتا،[48] تاہم روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ نے اپنے خصوصی نامہ نگار کے حوالہ سے یکم ستمبر 1958 کو مہاگاؤں 1857 کا ہیرو کے عنوان سے ایک خصوصی رپورٹ شائع کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے تین پوتے قاضی ابو احمد، قاضی ایوب اور قاضی حافظ نظیر احمد 1958 کی وسط تک حیات تھے۔ اس وقت قاضی ابو احمد کی عمر ستر سال کی تھی جو سب سے بڑے تھے۔ مولوی لیاقت علی کی انقلابی سرگرمیوں اور حب الوطنی کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت ہند نے دو سو روپے ماہانہ کی پنشن مقرر کی تھی۔ قاضی ابو احمد صاحب نے نمائندہ نیشنل ہیرالڈ کو اپنے انٹرویو میں بتلایا تھا کہ ان کو وراثت میں مولوی لیاقت علی کی ذاتی ڈائری ملی تھی جو کوئی صاحب مستعار لے گئے اور واپس نہیں کی۔ نیشنل ہیرالڈ کے نامہ نگار نے یہ بھی لکھا تھا کہ مولوی لیاقت علی کی ایک تصویر جس میں وہ امیر افغانستان کے ساتھ ہیں پشاور کے میوزیم میں موجود ہے۔ ممکن ہے کہ کان پور سے نکلنے کے بعد اپنی صحرانوردی میں مولوی صاحب افغانستان جا پہنچے ہوں اور امیر افغانستان سے ملاقات کی ہو، یہ امر بہرحال تحقیق طلب ہے۔

اقبال حسین

بیگم حضرت محل

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں کئی خواتین نے حصہ لیا تھا ان میں رانی لکشمی بائی اور بیگم حضرت محل کا مورخین نے کثرت سے ذکر کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں بیگم حضرت محل کی شخصیت اور ان کے اعلانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بیگم صاحبہ نے آزادی کی پہلی جنگ میں حصہ لینے کے بعد بے حد صعوبتیں برداشت کیں اور انگریزوں کی تمام ترغیب کے باوجود ہتھیار نہیں ڈالے اور آخر تک جنگ جاری رکھی اور بالآخر وطن سے دور نیپال کی ترائی میں مالک حقیقی سے جاملیں۔

بیگم حضرت محل کا نام مولوی نجم الغنی امراؤ[1] بتلاتے ہیں جو 1848 میں واجد علی شاہ کی حرم میں داخل ہوئیں۔[2]

تقریباً ایک سال بعد ان کے بطن سے برجیس قدر پیدا ہوئے جن کا اصل نام رمضان علی تھا۔[3]

مئی 1857 میں جب جا بجا انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ ہونے لگا، لکھنؤ بھی اس سے الگ نہیں رہ سکا۔ اودھ میں واجد علی شاہ کی برطرفی سے پہلے ہی عوام میں ناراضگی تھی۔ لندن میں بھی واجد علی شاہ کی برطرفی پر اور اودھ کی ضبطی پر ایک حلقہ کی رائے تھی کہ یہ ناجائز اقدام تھا۔[4]

مئی 1857 سے پہلے ہی لکھنؤ بدامنی اور لوٹ مار کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کا سبب واجد علی شاہ کی برطرفی اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری تھی۔ لکھنؤ میں بدامنی کا حال ہفتہ وار طلسم

برابر اپنی اشاعت میں دیتا رہا ہے۔[5] بہرحال اس بدامنی کے دوران جب لکھنؤ میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو قیادت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ واجد علی شاہ لکھنؤ سے دور کلکتہ میں نظر بند تھے۔ لکھنؤ میں ان کے اخلاف کی کمی نہیں تھی لیکن قیادت کی لیاقت اور اہلیت کا مسئلہ پیچیدہ تھا۔ مرزا رضا علی بہادر فرزند واجد علی شاہ کا نام پیش کیا گیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ واجد علی شاہ کے ایک اور فرزند مرزا محمد علی بہادر کو بادشاہ بنا کر قیادت سونپنے پر بھی عام رضامندی نہیں ہو سکی۔ بالآخر امرائے اودھ نے جن میں محمود خاں، شیخ احمد حسین، اور راجہ جے لال سنگھ شامل تھے برجیس قدر کا نام تجویز کیا۔ دیگر بیگمات کی اس نام پر رضامندی لی گئی اور 5 جولائی 1857 کو برجیس قدر کی مسند نشینی کا اعلان ہوا۔ اس وقت برجیس قدر کی عمر صرف دس سال اور چند ماہ تھی۔[6]

مسند نشینی کے بعد عباس مرزا برجیس قدر کی عرضداشت لے کر دہلی پہنچے۔[7] خطاب سے نوازے گئے لیکن دہلی پر انگریزوں کی گولہ باری شروع ہو چکی تھی۔ دہلی سے بڑی مشکلوں کے بعد نکلے اور لکھنؤ پہنچے۔[8]

لکھنؤ میں حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ بیگم حضرت محل کے پاس چوبیس ہزار روپے نقد تھے وہ اخراجات کے لیے دیدیے لیکن سب سے بڑا مسئلہ نظم و نسق اور امن و امان کی بحالی کا تھا۔ اودھ میں جو سپاہی موجود تھے ان میں نظم نام کو نہ تھا۔ احمد اللہ شاہ کی قیادت کو بعض مصلحتوں اور اپنی نجی غرض کے تحت عمائدین اودھ کو منظور نہیں تھی۔ علاوہ اس کے ان کے اندر آپسی رقابتیں ایسی تھیں کہ قیادت کے لیے کوئی ان کی نگاہ میں جچتا ہی نہیں تھا۔ بیگم حضرت محل عورت تھیں اور فوج کی قیادت ایسے حالات میں ان کے لیے بھی آسان نہ تھی۔ محل کی بیگمات بھی بیگم حضرت محل اور برجیس قدر کے عروج سے حسد اور جلن کا شکار تھیں۔[9] اور درپردہ انگریزوں کی مخبری میں ملوث تھیں۔ بیگم حضرت محل سے وابستہ چند مخلصین اس صورت حال سے پریشان تھے، بیگم صاحبہ سے فریادی ہوئے اور آگاہ کیا اس طرح ہم دونوں خراب اور برباد ہوں گے کوئی جائے پناہ نہیں مل سکے گی۔[10]

لکھنؤ میں احمد اللہ شاہ، حضرت محل کے درمیان امرا اور نام نہاد بہی خواہان بیگم حضرت محل نے کوئی دوستی کی راہ پیدا نہ ہونے دی نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین آزادی کی طاقت دو حصوں میں

بٹ گئی تھی۔ سر ہنری لارنس انگریزوں کا سربراہ مجاہدین کی یلغار میں 2 جولائی 1857 کو شدید زخمی ہوا تھا اور جلد ہی مر گیا۔ انگریز بیلی گارد میں محصور تھے۔ محصورین کی رہائی کے لیے جنرل ہیولاک نے جولائی کے آخری دنوں میں کان پور سے لکھنؤ پہنچنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اگست 1857 میں اس نے دوبارہ پیش قدمی کرنی چاہیے لیکن مجاہدین آزادی کی موجودگی سے کامیاب نہ ہو سکا۔ ہیولاک کے بعد جنرل اوٹرم نے ستمبر کے آخری حصے میں لکھنؤ کے محصورین کو رہا کرانے کی کوشش کی لیکن وہ خود بھی محصورین کے ساتھ بیلی گارد میں محصور ہو گیا۔ نومبر 1857 سر کالون کیمبل کی قیادت میں بیلی گارد کے محصورین رہا ہوئے، مگر کیمبل کو لکھنؤ میں رکنا مشکل ہو گیا تھا اور وہ کان پور لوٹ آیا۔ غرض کہ 2 جولائی 1857 سے 6 فروری 1858 تک جب کیمبل نے دوبارہ پیش قدمی کر کے لکھنؤ پر مارچ 1858 میں انگریزوں کا قبضہ کرا دیا لکھنؤ کے ارباب حل وعقد کوئی متفقہ اقدام کر کے انگریزوں کو باہر نہیں نکال سکے۔ اس دوران بیگم حضرت محل کی تمام کوششیں بھی ناکام رہیں کیونکہ کوئی ایسا فرد نہ تھا جو ان کی صائب رائے پر عمل کرتا۔ تاہم بیگم صاحبہ نجی طور پر فوج کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ 25 فروری 1858 عالم باغ کی جنگ میں حضرت محل جو عالم باغ کی جنگ میں موجود تھیں جنرل بخت خاں کی بہادری سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ بخت خاں کی توپیں انگریزوں نے چھین لی تھیں۔ بیگم حضرت محل نے بخت خاں کو یقین دلایا کہ اس کی توپوں کے نقصان کو پورا کر دیا جائے گا۔ [11]

بیگم حضرت محل بہادر سپاہیوں اور سرداروں کی عزت افزائی اور ہمت افزائی کرتی رہتی تھیں۔ 23 ستمبر 1857 کو جنرل اوٹرم اور ہیولاک کی پیش قدمی کے دوران مان سنگھ نے اپنے جوانوں کے ساتھ ان کو ایک جنگ میں روک دیا تھا اور بہادری دکھائی تھی۔ بیگم حضرت محل نے اسے اعزاز و اکرام سے نوازا تھا اور انعامات کے وعدے کیے تھے۔ [12]

دہلی پر انگریزوں کی فتح کے بعد ان کا نشانہ اودھ بنا تھا۔ اودھ میں آہستہ آہستہ حالات مجاہدین آزادی کے قابو سے باہر ہوتے گئے اور وہ انگریزوں کے خلاف آپسی پھوٹ کی وجہ سے ہارتے چلے گئے۔ جنرل اوٹرم کی پوری کوشش یہ تھی کہ بیگم حضرت محل کا احمد اللہ شاہ اور فیروز شاہ کا ساتھ نہ ہونے پائے اس لیے اس نے بیگم کے پاس مصالحت کے پیغام کے ساتھ اپنی شرائط بھیجیں:

(1) جو کچھ بھی ممالک محروسہ سے نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ملتا تھا وہ بیگم کو ملے گا۔

(2) اس نے پھر پیغام بھیجا کہ بیگم حضرت محل جنگ سے باز آ جائیں تب ملک ان کو دے دیا جائے گا۔

(3) آخر میں 25 ہزار روپیہ ماہانہ ادا کرنے کی پیش کش کی گئی۔

یہ تمام شرائط بیگم تک پہنچیں یا نہیں، پتہ نہیں چلتا۔ بیگم حضرت محل بہرحال انگریزوں کے خلاف صف آرا رہیں۔ انگریزی افواج کی پیش قدمی اور لکھنؤ پر گولہ باری کے باوجود وہ لکھنؤ میں ڈٹی رہیں۔ قیصر باغ پر انگریزوں کی بے پناہ گولہ باری سے مجبور ہو کر بیگم صاحبہ کو قیصر محل چھوڑنا پڑا۔ افتاں وخیزاں لعل دروازہ میں غلام رضا کے گھر پہنچیں وہاں سے سرائے حسین آباد چلی آئیں کیوں کہ انگریزوں کا خطرہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ 16 مارچ 1858 کو برجیس قدر کو لے کر موضع بھراؤں پہنچیں۔ غیر متوقع طور پر راجہ مردن سنگھ بے رخی سے پیش آیا۔ وہاں سے بچ کر محمود آباد اور پھر بسواں ہوتی ہوئی خیر آباد آ گئیں۔ یہاں شایان شان استقبال ہوا۔ ہر پرشاد، ناظم خیر آباد، اور عماد الدین ناظم بسوان نے ان کی پذیرائی کی۔ بیگم حضرت محل کا ارادہ تھا کہ وہ بریلی پہنچ کر خان بہادر خاں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گی۔ بیگم حضرت اپنے منصوبہ کو عملی جامہ نہیں پہنچا سکیں اور نیپال میں نیا کوٹ کے مقام پر چلی گئیں یہاں ان کے قیام کی اجازت رانا جنگ بہادر نے پہلے ہی دے دی تھی۔ کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کے بعد بھی ہندوستان میں نئی قائم شدہ انگریزی حکومت نے مہاراجہ جنگ بہادر سے بیگم حضرت محل کے متعلق رابطہ قائم رکھا تھا۔ جیسا کہ نیپال میں انگریز ریزیڈنٹ کے ایک مراسلہ مورخہ 13 جون 1859 بنام سیسل بیڈوں سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کے معلوم ہوتا ہے، انگریز ریزیڈنٹ ریمزے نے اطلاع دی تھی کہ بیگم حضرت محل نوا کوٹ میں مقیم تھیں جس سے جنرل بدری نور سنگھ پریشان تھا اور اس نے لکھا تھا وہ اور ریمزے سے مل کر ان کے لیے اس شرط پر رستگاری حاصل کر لیں کہ بیگم صاحبہ برٹش صوبہ جات اس کے حوالہ کر دیں۔ لیکن بیگم حضرت محل اور ان کے رفقا کسی بھی شرط کے لیے تیار نہیں تھے۔[13] جنگ بہادر تمام تر برٹش وفاداری کے باوجود اس کے لیے نہیں تیار تھا کہ بیگم

حضرت محل کو کوئی گزند پہنچے اور اگر وہ نیپال میں قیام کرنا پسند کرتی ہیں تو ان کو اس کی اجازت دی جائے۔[14] بیگم حضرت محل کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کی کوشش جاری رہی اور گورنر جنرل نے اپنے مکتوب کے ذریعے انھیں بلاشرط معافی کی پیش کش کی۔[15] بیگم حضرت محل کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ انھیں وہ تمام اعزازات حاصل ہوں گے جو ایک شاہی خاندان کو دیے جاتے ہیں لیکن انھیں کوئی سیاسی اقتدار نہیں دیا جائے گا اور ان کو جلد از جلد عقلمندی سے کام لے کر ہتھیار ڈال کر آئندہ کے لیے باعزت زندگی اور فراخ دلانہ سلوک حاصل کر لینا چاہیے۔[16]

انگریزوں کی پیش کش اور وعدوں پر بیگم کو قطعی اعتبار نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار وہ اپنے اعلانیہ[17] میں کھل کر کر چکی تھیں۔

بیگم حضرت محل تا حیات نیپال ہی میں رہیں۔ غالباً ان کی کفالت رانا جنگ بہادر کرتے رہے۔ بیگم صاحبہ کے ساتھ ان کا کتب خانہ اور نادر جواہرات بھی تھے۔ ممکن ہے جواہرات بھی ان کی کفالت کرتے رہے ہوں، کتب خانہ غالباً ان کی جائے قیام نیا کوٹ میں ہی رہا اور بعض کتابیں رانا جنگ بہادر کے اہل خاندان نے گورکھپور میں اپنے مربیوں کو 70-1960 میں پیش بھی کی تھیں۔

II

بیگم حضرت محل نے برجیس قدر کی تخت نشینی کے بعد پہلا اعلانیہ 12 ذی قعدہ میں 1273 ہجری مطابق 5 جولائی 1857 کو جاری کیا گیا تھا۔[18] یہ اعلانیہ فارسی میں تھا لیکن بعد میں تقریباً 11 اعلانیے اردو میں جاری کیے گئے تھے۔ اس میں سے صرف ایک اعلانیہ کا اردو متن ہمیں حاصل ہو سکا ہے، بقیہ دس اعلانیوں کے انگریزی ترجمے نیشنل آرکائیوز دہلی یا انگریزی کتابوں میں مل جاتے ہیں۔

بیگم حضرت محل نے اعلانیہ میں جو برجیس قدر کے نام سے جاری کیا گیا ہے وضاحت کی ہے کہ 5 جولائی 1857 کو وہ ریاست موروثی پر مسند نشین ہو کر علاقہ اور ریاست کے تحفظ میں مصروف ہو گئے ہیں اور رعایا سے کہا گیا ہے کہ وہ اطاعت گزاری سے گریز نہ کریں اور مسافروں

اور دیگر افراد کی اپنے اپنے علاقوں میں خبر گیری کریں اور احکام کی بجا آوری کریں۔ ان کو یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ بھاگتے ہوئے انگریز اور سکھ فوجیوں کو جہاں کہیں بھی وہ روپوش ہوں یا دریائے گنگا گھاگھرا یا گومتی عبور کرنے کی کوشش کریں تو انھیں گرفتار یا ہلاک کر دیں۔

تقریباً بارہ دنوں بعد 17 جولائی 1857 [19] کو برجیس قدر کے اعلانیہ میں چند اہم امور پر توجہ دی گئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عوام اودھ پر انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد کن حالات میں زندگی گزار رہے تھے۔ اعلانیہ میں کہا گیا ہے کہ برجیس قدر کی پوری توجہ زمین پر آبادکاری اور ان تمام اشیا کا حصول ہے جس سے عوام اور پوری آبادی کو سہولت ہو۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے اعلانیہ میں بتلایا گیا ہے کہ یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ ظالم، بدتمیز اور کافر فرنگیوں کو اپنی نئی [20] اور قدیم [21] آبائی سلطنت سے نکال باہر کرنا ہے۔ اس غرض سے راجہ بینی مادھو سنگھ کو اعظم گڑھ اور جون پور کے علاقوں کا ناظم مقرر کیا گیا ہے اس لیے عوام کو اس کے احکام کی تعمیل کر کے ان بدمعاش کافروں کو مکمل طور پر تباہ کر دینا چاہیے اور پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ان کو اس سرزمین سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

اودھ کا ایک اعلانیہ برائے سکنہ زمینداران اودھ مرزا محمد رمضان علی برجیس قدر کے نام سے اردو اور ہندی زبانوں میں جاری کیا گیا تھا جس پر کوئی تاریخ نہیں درج ہے۔ [22] اشتہار میں بعض درج حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ 1857 کے آخری یا 1858 کے ابتدائی ماہ میں جاری کیا گیا تھا۔ اس اشتہار میں ہندو اور مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے چار چیزیں ہر ایک شخص کو بہت پیاری ہیں۔ اول دین و دھرم، دوسرے عزت و آبرو، تیسرے جان اپنی اور اپنوں کی اور چوتھی مال و اسباب اور یہ تمام چیزیں ہندوستانی عملداری میں محفوظ رہتی ہیں اور اس عملداری میں کوئی دین و دھرم کو نہیں ٹوکتا اور ہر شخص اپنے مذہب یا دھرم کے مطابق زندگی گذارتا ہے، لیکن انگریز ان تمام چیزوں کے دشمن ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان کا مذہب خراب کر کے ان کو عیسائی بنا ڈالیں، ان کی عملداری میں ہزاروں لوگ عیسائی بن گئے، انگریز عزت دار لوگوں کی جان و آبرو کے در پے ہیں، ان کا مال اور اسباب گھروں کو کھود کر لوٹ لیتے ہیں۔ بنئے اور مہاجنوں کو جان

سے نہیں مارتے ان کا مال لے کر اور عورتوں کو بے عزت کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں جاتے ہیں لوگوں سے ہتھیار لے کر جسے چاہتے ہیں پھانسی سے یا گولی سے یا توپ سے باندھ کر مار ڈالتے ہیں، زمینداروں کو جمع میں تخفیف یا معافی کی جھوٹی لالچ دیتے ہیں بعض احمق زمیندار ان کے فریب میں آ جاتے ہیں لیکن ہوشیار اس فریب کا شکار نہیں ہوتے۔ آخر میں اس اشتہار میں عوام اور زمینداران سے اپیل ہے وہ انگریزوں کے فریب میں نہ آئیں اور اتفاق رائے سے ان سے جنگ کریں اور گوریلا جنگ کا طریقہ اختیار کر کے انگریزی فوج کو پریشان کریں۔

اس اشتہار کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ فارسی آمیز زبان سے مبرا ہے اور اس میں ایسے عوامی الفاظ جیسے مانس، دھرم، پاپ، بیری، چوہڑے چمار، چتر وغیرہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس اشتہار کا مقصد ایک طرف روایتی ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنا تھا تو دوسری طرف انگریزوں کے خلاف عوام کو متحد کر کے جنگ آزادی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دعوت دینا تھا۔

بیگم حضرت محل چونکہ برجیس قدر کی والدہ اور اپنے کم سن فرزند کی گارجین تھیں اس لیے تمام اعلانیے برجیس قدر کے نام سے جاری کیے گئے تھے۔ لیکن ان اعلانیوں کو بیگم حضرت محل کے حکم اور منظوری سے ہی شائع کیا جا رہا تھا۔ اگرچہ تمام اعلانیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نام جاری کیے جا رہے تھے لیکن 1857 کا ایک اعلانیہ خاص طور پر مسلمانوں کے نام تھا جس میں بظاہر قرآن اور حدیث سے استفادہ کرتے ہوئے عیسائیوں یعنی انگریزوں اور یہودیوں سے دور رہنے اور ان پر بھروسا نہ کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ ان سے دوستی ہلاکت اور ایمان کی بربادی تھی۔ مسلمانوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ وہ بزدلی اور پست ہمتی چھوڑ کر آگے بڑھیں۔ ان سے ہتھیار چھین کر انہیں ہلاک کریں اور اگر وہ پیش قدمی نہیں کریں گے تو انگریز ان کے اہل خاندان کو ہلاک اور بیویوں کی عصمت دری کر کے رسوا کریں گے۔ اس لیے وہ یعنی مسلمانوں کو آپسی رشک و حسد چھوڑ کر متحد ہو جائیں اور انگریزوں کو تباہ کر دیں اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو انگریز فتح یاب ہونے کے بعد ان کو ہلاک اور برباد کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔[22]

برجیس قدر کے اعلانیوں کا یقینی طور پر اودھ کے عوام پر اثر پڑ رہا تھا۔ انگریز بھی ان اعلانیوں کے تیور اور خطاب سے پریشان ہو کر اعلانیے جاری کر رہے تھے۔[23] اور عوام کو غلط

امیدیں اور دلا سے دلا رہے تھے، اور یہ یقین دلا رہے تھے برجیس قدر کے اعلانیوں پر توجہ نہ دیں۔ اپنے 25 فروری 1858 کے اعلانیہ میں برجیس قدر نے عوام کو آگاہ کیا ہے کہ وہ انگریزوں کے بہکاوے میں نہ آئیں اور متحد ہوکر ان کے خلاف تلوار اٹھالیں اور آئندہ کے لیے اپنی حفاظت کا بھی بندوبست کریں اور ان کافروں کا اپنے علاقوں میں نہ داخل ہونے دیں۔ (24)

بیگم حضرت محل انگریزی حکومت کی چالبازیوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔ اودھ پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد وہ نیپال کے سرحدی علاقے میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ برابر مہاراجہ جنگ بہادر سے رابطہ بنائے ہوئے تھیں۔ انگریز بھی بیگم حضرت محل سے نامہ و پیام جاری رکھے ہوئے تھے اور دوسری طرف رانا جنگ بہادر پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ بیگم صاحبہ کو ان کے حوالے کردے۔ برجیس قدر کا مراسلہ مورخہ یکم فروری 1859 انگریزوں کی دوہری سیاست پر روشنی ڈالتا ہے۔ مراسلہ میں برجیس قدر رانا کی بہادری اور کردار کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''آپ اس امر سے بھی واقف ہیں کہ انگریز کس طرح میرے بزرگوں سے کیے گئے وعدوں اور معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے کے مجرم ہیں جب کہ ہمارے بزرگوں نے معاہدوں کو پورا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ میں اس کے متعلق اور اس امر کے متعلق بھی آپ کو اپنی نجی ملاقات کے وقت بتلاؤں گا کہ کس طرح انگریز اپنی رعایا اور فوج کے مذہب اور اعتقاد میں مداخلت کرتے رہے ہیں۔ (25)

بیگم حضرت محل کی زندگی کے آخری ایام نیپال کی ترائی میں بہت کس مپرسی کے عالم میں گذرے۔ انگریزوں کے دباؤ سے مجبور ہوکر جنگ بہادر بیگم صاحبہ کو نیپال چھوڑ کر چلے جانے پر اصرار کرتے رہے۔ بیگم حضرت محل، برجیس قدر کی علالت سے اور پریشان تھیں۔ رانا کے روز افزوں دباؤ سے مجبور ہوکر انھوں نے جواب دیا: ''آپ مجھے کیوں ستا رہے ہیں جب کہ میں نہیں جانتی کہ میرا بیٹا مرجائے گا یا حیات پائے گا۔ میں آپ کی تجویز پر جواب سوچ کر دوں گی۔''

اس کے بعد بیگم صاحبہ نے صاف طور پر نیپال کی تجویز پر کہ وہ خود کو انگریزوں کے حوالہ کردیں انکار کردیا۔ (26) آخری دم تک نیپال میں مقیم رہیں اور وہیں پیوند خاک ہوگئیں۔

حواشی:

1. نجم الغنی خاں، تاریخ اودھ، جلد پنجم، ص 69
2 تاریخ اودھ، جلد پنجم، ص 70
3. تاریخ اودھ، جلد پنجم، ص 115، واجد علی شاہ، محل خانہ شاہی، ص 78
4. ہفت وار طلسم لکھنؤ، 25 جولائی 1856، ص 5
5. تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، طلسم، مورخہ یکم اگست، صفحات 1 تا 4، مورخہ 8 اگست 1856، ص 2-3، مورخہ 15 اگست 1856، صفحات 3-4، طلسم، 22 اگست 1856، صفحات 2-3، 26 اگست 1858، ص 2-3، 5 ستمبر 1856، ص 12-3 ستمبر 1856، صفحات 2-4، وغیرہ
6. قیصر التواریخ، دوم، صفحات 223-27، مولوی نجم الغنی لکھتے ہیں کہ شہر میں بدامنی اور لوٹ مار کی وجہ سے بہت سے روسا کے گھر ویران ہو گئے تھے۔ شہر کا نظم ونسق درست کرنے کے لیے راجہ جے لال سنگھ کی درخواست پر بیگم حضرت محل بادل ناخواستہ برجیس قدر کی مسند نشینی کے لیے رضامند ہو گئیں۔ تاریخ اودھ، پنجم، صفحات 284-85۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ سید اطہر عباس رضوی، فریڈم اسٹرگل ان یو. پی. جلد پنجم، ص ص 82-85
7. عبداللطیف کے مطابق عباس مرزا 31 اگست کو دربار میں حاضر ہوئے تھے اور سفیر الدولہ کا خطاب پایا تھا۔ 1857 کا تاریخی روزنامچہ، دہلی 1858، صفحات 168-69۔ سفارت کا مفصل حال قیصر التواریخ، دوم، صفحات 320، 222 اور 446-49 پر ملاحظہ ہو۔
8. قیصر التواریخ، دوم، ص ص 448-48
9. قیصر التواریخ، جلد دوم، ص 312
10. قیصر التواریخ، جلد دوم، ص 262-67
11. قیصر التواریخ، دوم، صفحات 311-12، رضوی، فریڈم اسٹرگل، صفحہ 385
12. قیصر التواریخ، دوم، صفحہ 382-87 کا بیان مشکوک ہے کیونکہ راجا مان سنگھ دوہرے کردار کا آدمی تھا اور انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ جب اس کی اصلیت بے نقاب ہو گئی تو بیگم حضرت محل نے اس کی تعلقداری ضبط کیے جانے کے احکامات جاری کیے تھے۔ ملاحظہ ہو رضوی، فریڈم اسٹرگل، دوم، صفحات 480-81
13. فریڈم اسٹرگل، دوم، ص 610
14. فریڈم اسٹرگل، دوم، ص 611
15 فریڈم اسٹرگل، دوم، ص 612
16. فریڈم اسٹرگل، دوم، ص 612 اور فٹ نوٹ نمبر 3۔ اس سلسلے میں ممو خاں کا جواب قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ص 324-25 پر قابل ذکر ہے۔ ممو خاں نے ہتھیار رکھنے کے لیے یہی شرط رکھی تھی انگریز، راجا جنگ بہادر سے صلح کے کاغذات پر گواہی کرا دیں۔
17. " فریڈم اسٹرگل ان یو. پی.، جلد اول، صفحات 485-86
18 فارسی متن کے لیے ملاحظہ ہو مراسلہ ہائے تمنا، لکھنؤ، ص 79
19 رضوی، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، ص 121
20. نئی سے مراد روہیلکھنڈ کا علاقہ تھا جس پر 1774 میں انگریزوں کی مدد سے شجاع الدولہ نے حافظ رحمت خاں روہیلہ کو شہید

کر کے قبضہ کر لیا تھا۔

21. قدیم آبائی سلطنت سے مراد اودھ و الہ آباد کے صوبے تھے۔

22. Foreign Deptt. (Secret.) 25 June, 1858 No. 68-69, National Archives, New Delhi

23. Foreign Political Proceedings, December 1859 National Archives, New Delhi, No. 1693, p.p. 615-17

24. جنرل اوٹرم نے 27 مارچ 1858ء کو اردو میں اشتہار جاری کر کے اودھ کے عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ بغاوت سے علیحدہ ہو جائیں اور یاد رہے یہ پروپیگنڈہ غلط ہے کہ لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو Foreign Deptt. (Secret.) No. 56-57 National Archives, New Delhi. Foreign Political Proceedings, December 1859, No. 1693, p 618

25. Freedom Struggle in U.P. Vol. II, pp. 587-88

26. فریڈم اسٹرگل ان یو پی جلد دوم صفحہ 606

اقبال حسین

احمد اللہ شاہ

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے مجاہدین میں احمد اللہ شاہ کا نام سرفہرست ہے۔ آپ کی حیات اور کارناموں کی داستان آپ کے ایک مرید فتح محمد تائب نے تاریخ[1] احمدی میں لکھی ہے۔

احمد اللہ شاہ کا اصل نام سید احمد علی اور خطاب دلاور جنگ تھا۔ آپ نواب محمد علی چینا پٹن کے فرزند تھے اور غالباً انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق عربی، فارسی، اور اسلامی علوم میں ہوئی۔ فن سپہ گری سیکھا۔ عربی فارسی اور اسلامی علوم میں اچھی دستگاہ حاصل کی تھی۔ فن سپہ گری میں بھی طاق ہوئے۔ اس طرح اہل سیف و قلم دونوں تھے۔ آپ کی کوئی تصنیف نہیں ملتی لیکن آپ کے وعظ کی مجلسوں میں علما سے گفتگو شاہد ہے کہ موصوف کو خاص علمی مقام حاصل تھا۔ مدراس کے علاقے میں انگریزوں کے روز افزوں اقتدار نے شاہ صاحب کو انگریزی زبان کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ یہ زبان بھی سیکھ لی۔ 1800 میں کرناٹک پر انگریزوں کے قبضے کے بعد وہاں کے نواب کی خودمختاری ختم ہوگئی۔ بقول تائب آپ نواب حیدرآباد کی دعوت پر حیدرآباد چلے آئے اور فوج میں ملازم ہوگئے۔[2] شاہ صاحب نظام کی فوج کے ساتھ مرہٹوں اور سرکش زمینداروں کے خلاف کئی مہموں میں شریک ہوئے اور اپنی بہادری اور فوجی کارناموں کی وجہ سے نظام کے منظور نظر بنے[3] لیکن امرا ان کی نظام سے قربت سے خوش نہ تھے۔ ان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے شاہ صاحب نے حیدرآباد چھوڑ دیا۔[4] تائب کے مطابق احمد اللہ شاہ برطانیہ بھی گئے اور بہت سے مسلم ممالک کا دورہ کیا۔ اسی

دوران حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے۔ ہندوستان لوٹے تو شخصیت بدل چکی تھی۔ سانبھر (راجستھان) کے صوفی بزرگ سید فرمان علی شاہ[5] کے مرید ہو گئے اور ان کے مشورہ پر گوالیار تشریف لائے اور ایک دوسرے صوفی بزرگ سید محراب علی کے مرید ہو گئے۔ محراب علی شاہ نے احمد اللہ شاہ کو جہاد کی تلقین فرمائی۔ غالباً سید محراب علی شاہ، سید احمد شہید کے تحریک جہاد کے رکن رہ چکے تھے۔ پیر کی ہدایت پر احمد اللہ شاہ نے بھی جہاد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ پیر کے خط کو لے کر آگرہ آئے اور مفتی انعام اللہ وکیل سرکار کے پاس پہنچے جن کا مسکن اہل علم کا مرکز بنا ہوا تھا۔[6]

آگرہ میں احمد اللہ شاہ کی رہائش بھی جلد ہی محفل سماع کا مرکز بن گئی۔ شاہ صاحب محفل سماع میں شریک لوگوں کو وعظ بھی دیا کرتے تھے۔ محفل سماع میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شریک ہوا کرتے تھے۔

محفل سماع کے علاوہ احمد اللہ شاہ ہر شنبہ کو تیر و تفنگ کی مشق بھی کرایا کرتے تھے۔[7] احمد اللہ شاہ کا یہ فعل ان کی صوفیانہ زندگی کے برعکس تھا۔ شاہ صاحب کی سرگرمیوں پر انگریزوں کی بھی نظر تھی اس لیے شاہ صاحب آگرہ سے ہجرت کر کے دوبارہ گوالیار آ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اودھ پر قبضہ کرنے کو تیار بیٹھی تھی اور اس کا جواز مہیا کرنے میں بڑی حد تک کرنل سلیمن کا بھی ہاتھ تھا جس نے بڑی محنت سے اودھ کے تعلقداروں کی فوجی طاقت کی مکمل رپورٹ لارڈ ڈلہوزی کو دی تھی۔[8] سلیمن کی رپورٹ کے بعد ہی اودھ کے آخری حکمراں واجد علی شاہ کو معزول کر دیا گیا اور پورے اودھ پر بغیر جنگ و جدال کے انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ اودھ کی حکومت کا خاتمہ ایک المیہ تھا۔ بالخصوص اودھ اور اس کے گرد و نواح کے مسلمان ہنومان گڑھی کے قبضہ اور مولوی سید امیر علی اور ان کی رفقا کی شہادت سے پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے کہ اودھ کے انتزاع سلطنت نے انھیں اور برہم کر دیا۔ چونکہ احمد اللہ شاہ کی زندگی کا مشن جہاد تھا، آپ مولوی سید امیر علی شہید کے کام کی تکمیل کے لیے لکھنؤ آ گئے۔ ہفتہ وار لکھنؤ کا معروف اخبار طلسم اپنی 21 نومبر 1856 کی اشاعت میں خبر دیتا ہے:

"ان دنوں ایک شخص احمد اللہ شاہ نامی لباس میں فقیروں کے مگر ٹھاٹھ سب امیروں

کے اس شہر میں وارد ہوئے۔ معتمد الدولہ کی سرائے میں اترے۔ اب جائے قیام
گھسیاری منڈی ہے۔ سبزہ ہے ہوا ٹھنڈی ہے۔ دوشنبہ اور پنجشنبہ کو وہاں مجمع کثیر ہوتا
ہے۔ شہر کا بر و نا بیر ہوتا ہے۔ مجلس حال و قال ہوتی ہے لیکن نئی چال ہوتی ہے۔"

طلسم کی اس خبر سے واضح ہے کہ احمد اللہ شاہ نے وہی طریقہ اختیار کیا تھا جو آگرہ میں تھا۔[9] طلسم اپنی 5 دسمبر 1856 کی اشاعت میں ایک اور مجذوب کی خبر دیتا ہے جن کے مسکن پر ہر وقت ایک میلہ لگا رہتا تھا اور مجذوبانہ انداز میں کہا کرتے تھے: " بے استرداد حکومت (اودھ) یہاں سے نہ جاؤں گا بادشاہ کو تخت پر بٹھاؤں گا۔" غرض یہ کہ خواہ احمد اللہ شاہ ہوں یا کوئی اور، ان افراد کے گرد کثیر مجمع کا اکٹھا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انگریزی حکومت کے خلاف جو آگ سلگ رہی تھی وہ مختلف انداز میں سامنے آرہی تھی۔ اس زمانے میں مولوی فضل حق خیر آبادی، لکھنؤ میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی فضل حق اور مولوی عبدالرزاق فرنگی محلی نے مولوی سید امیر علی شہید کی تحریک جہاد مسجد ہنومان گڑھی کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔[10] لکھنؤ میں مولوی فضل حق کی ملاقات احمد اللہ شاہ سے ہوئی تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ صدر الصدوری سے مستعفی ہو کر الور چلے گئے۔[11] اب وہ انگریزی حکومت کے سخت مخالف ہو چکے تھے اور پر جوش جہادی بن گئے تھے۔

لکھنؤ میں احمد اللہ شاہ کی سرگرمیوں کا مقصد دعوت جہاد دینا تھا لیکن جس شہر میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کا عقیدہ تھا کہ جہاد کا فتویٰ صرف امام ہی دے سکتا ہے، وہاں احمد اللہ شاہ کو ابتدا میں بہت کامیابی نہیں ملی۔ بہر حال شاہ صاحب کی کوششوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ ان کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا حکومت نے ان کو جہاد کی تبلیغ کرنے سے منع کیا اور ان کی نگرانی کی جانے لگی۔[12] احمد اللہ شاہ نے وقت نزاکت کی پیش نظر لکھنؤ سے ہجرت کر کے بہرائچ کی راہ لی۔ جب وہ فیض آباد پہنچے تو جہاد کی فضیلت پر تقریر کی۔ آمد کے تیسرے دن گرفتاری کا پروانہ پہنچا۔ آپ کو معہ دیگر رفقا کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ شاہ نے مدافعت کی، معرکہ آرائی کے بعد گرفتار کر لیے گئے اور سرسری مقدمہ کے بعد فیض آباد کی جیل میں قید کر دیے گئے۔

احمد اللہ شاہ کی تحریک کہ اغراض و مقاصد انگریزوں سے مخفی نہیں تھے۔ کیپٹن ٹی آر۔ ہچنسن لکھتا ہے:

"یہ شخص (احمد اللہ شاہ) ہماری عملداری میں بہت سے شہروں اور علاقوں سے گزرتے ہوئے ہندوستان کے ہر حصے میں اپنے مرید بناتے ہوئے فروری 1857 میں لکھنؤ پہنچا۔ بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہر جگہ لوگوں کو جہاد پر کافروں یا بدعقیدوں کے خلاف مذہبی جنگ، جیسا کہ یورپین تصور کرتے ہیں، آمادہ کیا۔" (13)

احمد اللہ شاہ جیل میں تھے کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ میرٹھ، دہلی، بریلی، شاہ جہاں پور اور بدایوں کی طرح لکھنؤ اور فیض آباد میں سپاہ اور عوام انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اودھ کی ضبطی کے بعد پورے اودھ میں انگریزوں کے خلاف جو آتش فشاں سلگ رہا تھا، پھٹ پڑا۔ اودھ میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید عوامی ردعمل کے پس پشت سیاسی اسباب کے علاوہ اقتصادی سبب بھی بہت اہم تھا۔ واجد علی شاہ کی حکومت کے خاتمہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دربار ختم ہو گیا، امرا کی ضرورتوں میں فرق آ گیا، واجد علی شاہ کی فوج برطرف ہو گئی اور بے کاری کا شکار ہو گئی۔ دربار، امرا اور سپاہیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے دستکار، ہنرمندان، اور اہل حرفہ بھی بے کاری اور غربت کا شکار ہو گئے۔ واجد علی شاہ کی برطرفی کا اثر بنکروں پر کس قدر پڑا ہوگا، اس کا اندازہ طلسم، 29 اگست 1856 کی اس خبر سے کیا جا سکتا ہے:

"صاحب مجسٹریٹ بہادر نے سنا کہ مبارک پور (اعظم گڑھ) کے جولاہے نکلے جاتے ہیں۔ صاحب نے یہ سن کر تفتیش سبب کی تھانہ دار نے لکھا کہ جولاہے فاقہ کشی میں گرفتار ہیں اس لیے یہاں کے رہنے سے بیزار ہیں... ہزار جولاہے لڑکے بالوں کو لے کر کعبہ شریف کی طرف راہی ہوئے۔ لکھنؤ میں کپڑے کی خریداری نہ رہی۔ ان کے لیے صورت اوقات گزاری نہ رہی۔ مصارف کے متحمل نہ ہوئے۔ کام نہ چلا آپ چلے گئے۔"

کمال الدین حیدر بھی اودھ میں زبردست بے کاری، کساد بازاری اور اقتصادی بدحالی کا ذکر کرتا ہے:

"حضرت خلد منزل کے عہد دولت میں جنرل لو فرماتے تھے کہ دس لاکھ فقط اس شہر میں

ہیں۔ ان میں غالب ہے کہ اب تین لاکھ سے زیادہ نہ ہوں۔۔ ہزاروں مر گئے، ہزاروں آوارہ وطن ہوئے، ہزاروں جو بہ مجبوری رہ گئے ہیں، محتاج نان شبینہ کے ہیں۔"(14)

جہاں بے کاری، غربت، کساد بازاری کا یہ عالم ہو اور عوام میں یہ احساس پیدا ہو چکا ہو کہ ان کی غربت اور پس ماندگی کے کون لوگ ذمے دار ہیں، ایسے ماحول میں احمد اللہ شاہ کی انگریزوں کے خلاف جہاد کی تحریک کے لیے زمین ہموار تھی۔ فیض آباد میں جب آزادی کی جنگ کا آغاز ہوتو سپاہیوں نے جیل پر وار کر کے احمد اللہ شاہ اور دیگر قیدیوں کو رہا کرالیا۔(15) انھوں نے احمد اللہ شاہ کو اپنا رہنما بنانا چاہا لیکن ہنومان گڑھی کے قضیہ میں شاہ صاحب کا موقف اور ہندو سپاہیوں کی ممکنہ ناراضگی کے پیش نظر انھوں نے احتیاط برتی اور فوری طور پر کوئی اعلان نہیں کیا۔(16)

احمد اللہ شاہ مجاہدین آزادی کی فوج کے ساتھ فیض آباد سے لکھنؤ کی طرف بڑھے۔ بقول نائب راہ میں فوج نے شاہ صاحب کو اپنا قائد بنالیا تھا۔ فوج کے ہمراہ راجہ مان سنگھ بھی تھا جو قیادت کا خواہشمند تھا لیکن اس کے کردار سے بیشتر فوجی آگاہ تھے۔ مان سنگھ کے کردار کے بارے میں Gubbins لکھتا ہے:

"یہ انتخاب خوشگوار نہ تھا کیونکہ وہ غدار ثابت ہوا۔ اس چالباز برہمن نے ہندوستانی افسروں کو بہکایا، پھسلایا اور دھمکایا۔ اپنے بھائی رام دین کو نانا کے پاس ایک مہم پر بھیجا۔ دریں اثنا خفیہ ایجنٹس کے ذریعے اس نے ہم لوگوں سے خط و کتابت جاری رکھی۔"(17)

احمد اللہ شاہ اپنی فوج کے ساتھ لکھنؤ کے قریب چنہٹ کے مقام پر پہنچے۔ یہاں انگریزی فوج نے کیپٹن بارلو کی کمان میں ان کی راہ روکی۔ 30 جون 1857 کو سخت معرکہ ہوا۔ بارلو کو شکست ہوئی۔ احمد اللہ شاہ جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔ اسی حال میں لکھنؤ پہنچے۔(18)

لکھنؤ بدامنی کا شکار تھا۔ شاہی خاندان میں کوئی ایسا فرد موجود نہ تھا جو حالات پر قابو پاتا۔ قیادت کا مسئلہ کئی دنوں کے بحث و مباحثہ کے بعد برجیس قدر کی تخت نشینی پر طے ہوا۔ نئی آزاد

حکومت قائم کی گئی۔ امرا کی ریشہ دوانیوں سے احمد اللہ شاہ اور ان کے رفقا کو نئی حکومت میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ احمد اللہ شاہ کا خیال تھا کہ برجیس قدر 12 سال کی عمر میں قیادت نہیں کر سکیں گے اور حکومت لامحالہ ممو خاں کے ہاتھ ہوگی۔ وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ قیادت کسی باصلاحیت اور جنگی تجربہ کار آدمی کے ہاتھ میں ہو لیکن بدقسمتی سے اودھ کے نام نہاد مخلصان حکومت، اقتدار کی جنگ میں مبتلا ہو کر پوری تحریک کو کمزور کر رہے تھے اس سلسلہ میں ٹی ایچ کیونگہ کا بیان قابل توجہ ہے:

> "ان حالات میں صرف ایک ایسا شخص موجود ہے جو عوام کی مدد کر سکتا ہے۔ ہمیشہ اس کا متمنی رہنے والا یہ شخص (احمد اللہ شاہ) کہ اسے حکومت کا سربراہ تسلیم کر لیا جائے۔ لوٹ مار کرنے والے فوجیوں کو اس نے متنبہ کیا کہ وہ باز رہیں۔ تھانے قائم کیے اور زبردست تادیبی فوج مقرر کی تاکہ امن و امان قائم ہو اور اس کے احکام پر عمل ہو۔ اس نے اعلان کیا کہ ان شہریوں کو قتل کر دیا جائے گا جو لوٹ مار کے مرتکب ہوں گے۔ اس نے رصد خانہ کی کوٹھی میں قیام کیا اور ایک بادشاہ کی طرح رہنے لگا۔" (20)

کیونگہ کا بیان حقیقت پر مبنی ہے۔ شاہ صاحب کی انتظامی امور میں دلچسپی، تھانوں کا قیام، مفسدوں اور رہزنوں کے خلاف سخت اقدامات، اودھ کی نئی حکومت کے نام نہاد امرا کو قابل قبول نہ تھے کیونکہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاہ صاحب ایک متوازی حکومت چلا رہے تھے۔ شاہ صاحب نے خانہ جنگی سے بچنے کے لیے رصدگاہ کی کوٹھی چھوڑ دی، لیکن ان کی فوج کے ایک ٹکڑی کو یہ بات پسند نہیں آئی اور وہ دوبارہ شاہ صاحب کو رصدگاہ کی کوٹھی میں لے آئی۔ (21)

احمد اللہ شاہ کی ہردل عزیزی، شہرت اور ان کی جہادی سرگرمیوں سے نئی حکومت کے سربراہان بے چین تھے۔ شاہ صاحب کے خلاف سازشیں زور پکڑنے لگیں۔ لکھنؤ میں جنگ آزادی کی ابتدا ہوتے ہی انگریزوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ وہ بیلی گارڈ میں پناہ گزین تھے۔ ان کا کمانڈر سر ہنری لارنس مارا جا چکا تھا۔ حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ بیلی گارڈ پر قبضہ کر کے انگریزوں کو باہر نکال دیا جاتا لیکن لکھنؤ میں نئی حکومت کی نااہلی اور ممو خاں کی انا اور تکبر کے سبب انگریز بیلی گارڈ میں جمے رہے۔ برکات احمد اور احمد اللہ نے بیلی گارڈ پر بغیر اودھ کی حکومت کی امداد کے حملہ کیا۔ انگریز محصورین نے چھ دنوں تک جرات اور شجاعت کے ساتھ مدافعت جاری رکھی۔ مجاہدین

کوئی حکومت سے کوئی مدد نہیں ملی کیونکہ امرائے لکھنؤ اور ممو خاں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ فتح کے بعد احمد اللہ شاہ کی طاقت بہت بڑھ جائے گی اور احمد اللہ شاہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیں گے انھوں نے بیگم حضرت محل کو احمد اللہ شاہ کے خلاف بھڑکایا اور ان کی کامیابی کو جداگانہ مسلک کی فتح اور اقتدار کا ہوّا کھڑا کر کے مسلکی تنازعہ اٹھا دیا گیا۔ لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ فوج دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طرف احمد اللہ شاہ ان کے رفقا اور بہت سے ایسے فوجی جو ممو خاں کی فوج سے نکل کر شاہ صاحب کے ساتھ آ ملے تھے اور دوسری طرف ممو خاں کے زیر اثر باقی ماندہ فوج۔[22]

لکھنؤ میں انگریز مخالف مہم میں مجاہدین کی افواج کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا اچھی علامت نہیں تھی۔ احمد اللہ شاہ اپنے موقف پر قائم تھے اور ہر حال میں انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دینا چاہتے تھے اور اس کی تکمیل کے لیے فوج کا متحد ہونا ضروری تھا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ بہر صورت اودھ کے مختلف طبقوں میں یگانگت، اخوت اور مذہبی اتحاد قائم رہے اور سب مل جل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کی مہم میں ان کے ساتھ رہیں۔ اب یہ بات بھی عیاں ہو چکی تھی کہ دہلی میں مجاہدین آزادی کو کمزور کرنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے تھے۔ احمد اللہ شاہ نے صورت حال سے مقابلہ کرنے اور عوام میں اتحاد قائم رکھنے کے لیے اردو میں ایک اعلانیہ 'رسالہ فتح اسلام' جاری کیا تھا۔[23] جو اس مضمون کے آخر میں اس کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر بطور ضمیمہ دوم شامل کیا جا رہا ہے۔

احمد اللہ شاہ کی روز افزوں شہرت و مقبولیت معزول بادشاہ واجد علی شاہ کے امرا کے لیے جنھوں نے برجیس قدر کی مسند نشینی میں سرگرمی دکھلائی تھی، پسند نہیں تھی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ احمد اللہ شاہ کو قائد یا امیر بنایا جائے۔ کوانگ لکھتا ہے:

> "مولوی (احمد اللہ شاہ) کا فوج پر بڑھتا ہوا اثر درباریوں کے لیے مزید خطرہ کا سبب بنا جو مولوی کی برتری کو ختم کرنے کے لیے ناکام کوششوں میں مبتلا تھا۔ اس نے (احمد اللہ شاہ) جرات مند ہونے کی عظیم شہرت حاصل کر لی تھی جس سے گل کے حکام تہی دامن تھے۔ مذہب کی اساس پر کام کرتے ہوئے اس نے فوج کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور وہ ان کا محبوب بن گیا تھا۔"(24)

بہر حال لکھنؤ میں درباری سازشوں اور برجیس قدر کی مسند نشینی کے اثرات واضح ہونا شروع ہو گئے۔ فوج دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ احمد اللہ شاہ اور ان کے رفقا آزادانہ طور پر انگریزی افواج کے خلاف مختلف معرکوں میں سرگرم عمل رہے لیکن باوجود کوششوں کے وہ جنرل اوٹرم کی پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ عالم باغ کی جنگ میں احمد اللہ شاہ نے اوٹرم کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور اوٹرم انگریز محصورین کو 26 ستمبر 1857 کو بیلی گارڈ سے رہا کرا کر کان پور لوٹ گیا۔[25]

اوٹرم کی لکھنؤ سے واپسی کے بعد پھر بدامنی کا دور دورہ شروع ہوا۔ ممو خاں اس کے بڑے ذمے دار تھے۔ امرا، مہاجنان، نواب کے اعزہ اور دوسرے صاحب ثروت لوگ اس لوٹ مار سے محفوظ نہ تھے۔ کمال الدین حیدر، احمد اللہ شاہ سے مسلکی اختلافات کی وجہ سے جا بجا ان پر استہزا اور تمسخر سے نہیں چوکتا، لکھتا ہے: "جب یہ صورت حال ہوگئی، آخر تنگ ہو کر اکثر مہاجنان و رعایائے شہر اس ظلم و ستم سے احمد اللہ شاہ کے پاس فریاد لے گئے کہ ہم پر جو یہ جور و ستم ہو رہا ہے، اگر راہ صاف ہوتی کہیں اور چلے جاتے۔ اگر نواب (برجیس قدر) سے نالش کرتے ہیں، جواب دیتے ہیں کہ ممو خاں کے کام میں مجھے کوئی دخل نہیں۔ اگر ان کے پاس جاتے ہیں کوئی سنوائی نہیں کرتا، بجز طلب زر کے۔ فقیر (احمد اللہ) نے جواب دیا کہ اگر کوئی نوکر ممو خاں، یوسف خاں کا دوڑ لائے، جس مکان پر، وہ فوراً ہمیں خبر دے، یہاں سے تلنگے جا کر گرفتار کر لائیں گے۔ اس پر شاہ جی نے پچاس ہرکارے مخبری کے لیے نوکر رکھے کہ جب کسی رعایا کے مکان پر دوڑ جائے فوراً خبر کرو۔"[26]

کمال الدین حیدر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد اللہ شاہ کی عوام میں کیا قدر و منزلت تھی۔ تاہم احمد اللہ شاہ کی ممو خاں کی روش پر پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خان موصوف نے اپنی تمام تر قوتیں شاہ صاحب کے خلاف استعمال کرنی شروع کر دیں۔ احمد اللہ شاہ کے لکھنؤ سے اخراج اور قتل کی سازشیں کی گئیں۔ ممو خاں اپنے منصوبوں میں ناکام رہا اور اس کی فوج سے بہت سے لوگ الگ ہو کر شاہ صاحب کی فوج میں شامل ہو گئے۔[27]

ایک طرف لکھنؤ نفاق، سازشوں اور فساد کی آماجگاہ بنا ہوا تھا دوسری طرف انگریزی افواج کان پور، فتح گڑھ اور دوسرے علاقوں پر قبضہ کر کے لکھنؤ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ 6 مارچ 1858ء کو جنرل اوٹرم جبٹ کے قریب ایک زبردست توپ خانہ، اور سات ہزار تجربہ کار جنگی دستے کے ساتھ دریائے گومتی عبور کر کے لکھنؤ کی طرف بڑھا۔ دریں اثنا سلطان پور سے اسے مزید فوجی کمک پہنچ گئی۔ لکھنؤ میں افراتفری برپا تھی۔ جنرل اوٹرم کی پیش قدمی روکنے کے لیے احمد اللہ شاہ نے موضع گکڑاول میں مورچہ قائم کیا۔ اس موقعہ پر شاہ صاحب نے مموخاں سے مل جل کر انگریزوں سے مقابلے کی پیش کش کی اور اس کی فوج سے منتخب جوانوں کی دو الگ پلٹنیں تیار کیں اور سب سے آخر دم تک لڑنے کا حلف لیا۔[28] مگر فتنہ پردازوں نے پھر اپنا کام کیا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر احمد اللہ شاہ کی قیادت میں جنگ جیتی گئی تو وہ بہت طاقت ور ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسے نازک وقت پر جب کہ دشمن ہر طرف سے نرغہ میں لے رہا تھا اور ان کے خلاف احمد اللہ شاہ جیسا باصلاحیت اور تجربہ کار فرد ان کو جواب دینے کی پوری کوشش میں مصروف تھا، زعمائے حکومت نے باقاعدہ مشورہ کر کے اودھ کی فوج کو واپس بلا لیا۔ کمال الدین لکھتا ہے:

"یہ بھی اقبال صاحبان عالی شان کا تھا کہ آپس میں ہر روز بلکہ ہر وقت ایسے فساد چلے آتے تھے کہ احیاناً ایک بناتا تھا دوسرا اپنی بدنفسی سے بگاڑ دیتا تھا۔"[29]

اندرونی نفاق نے دفاعی قوت کو کمزور کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں احمد اللہ شاہ، انگریزی فوج کی یلغار کو روک نہیں سکے اور گکڑاول کی جنگ میں شکست کھا کر لکھنؤ لوٹ آئے۔[30]

گکڑاول میں فتح کے بعد انگریزی فوج کے حوصلے بہت بلند ہو چکے تھے اور اس نے مجاہدین آزادی پہ دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ احمد اللہ شاہ نے اپنی بچی کھچی فوج کو دوبارہ آراستہ کر کے انگریزوں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی۔ لکھنؤ معرکہ کارزار بنا۔ احمد اللہ شاہ، فیروز شاہ اور جنرل بخت خاں انگریزوں کے خلاف جنگ ہار گئے۔ بیگم حضرت محل اور ان کے رفقا مشکل سے جان بچا کر نکل سکے۔

احمد اللہ شاہ اور ان کے رفقا 5 مارچ 1858ء سے آٹھ مارچ 1858ء تک جنگ کرتے کرتے تھک چکے تھے وہ موضع باری آ گئے۔ بیگم حضرت محل اور ان کے ساتھ کے لوگ بھی باری

پہنچے۔ بیگم حضرت محل کو اندازہ ہو چکا تھا وہ تنہا انگریزوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی وہ شاہ کی طرف رجوع ہوئیں اور تائب کے مطابق بیگم حضرت محل اور برجیس قدر نے شاہ صاحب کے ہاتھوں پر بیعت کر لی۔[31] کمال الدین حیدر بغیر حضرت محل کا نام لیے لکھتا ہے: "بعض امرا نے بخوف غارت گری شاہ جی کا پیالہ پیا اور بیعت بھی کی۔"[32]

احمد اللہ شاہ پیہم ہزیمتوں کے باوجود مستقل مزاجی سے انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں معروف رہے۔ مگر تمام عزم و استقلال کے باوجود ان کی صحت خراب ہوتی جا رہی تھی وہ سرطان کے مریض ہو گئے تھے۔ اس عالم میں بھی وہ انگریزوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے۔ ان کو اطلاع ملی تھی کہ انگریزی فوج ہوپ گرانٹ کی قیادت میں بڑھ رہی تھی۔ اب احمد اللہ شاہ نے کھلے میدان میں جنگ کی بجائے چھاپہ مار جنگ کو ترجیح دی۔ باری سے چار میل دور شاہ صاحب نے ندی کے کنارے کمین گاہ بنائی تھی تا کہ انگریزوں پر اچانک حملہ کر کے ان کو زیر کر لیا جائے۔ لیکن ان کی فوج میں بعض مخبر بھی تھے جنھوں نے اس منصوبہ کی خبر انگریزوں کو دے دی۔ جس کی وجہ سے شاہ صاحب کا پورا منصوبہ ناکام ہو گیا اور وہ جنگ ہار گئے۔[33]

باری کی ہار کے بعد احمد اللہ شاہ محمدی (ضلع کھیری) کے جنگلات میں اپنی بچی کھچی جمعیت کے ساتھ پناہ گزین ہو گئے۔ فوج کو از سر نو منظم کرنے کے لیے آلات حرب کی ضرورت تھی۔ جدید ہتھیاروں کا حصول ممکن نہ تھا مجبوراً انھوں نے تلواروں اور بھالوں کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ خان بہادر خان سے ان کی فراہمی کی درخواست کی لیکن بریلی بھی منافقین سے خالی نہیں تھا۔ انھوں نے خان بہادر کو ہتھیار نہ بھیجنے کی صلاح دی تا کہ احمد اللہ شاہ کی فوجی طاقت نہ بڑھنے پائے۔ چنانچہ احمد اللہ شاہ کی درخواست اس بہانے سے رد کر دی گئی کہ بریلی میں خود بھالوں کی ضرورت ہے۔[34]

احمد اللہ شاہ کے محمدی میں قیام کے بعد یہ مقام شکست خوردہ مجاہدین آزادی کی پناہ گاہ بنتا جا رہا تھا۔ ہم عصر مجاہدین آزادی احمد اللہ شاہ میں وہ صفات دیکھ رہے تھے جس سے ان کی قیادت میں انگریزوں سے جنگ جاری رکھی جا سکتی تھی۔ مرہٹہ پیشوا نانا صاحب، ان کے معتمد

خاص عظیم اللہ خاں، شہزادہ فیروز شاہ بریلی میں جمع تھے۔ تائب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ قیادت کا مسئلہ ایک بار پھر کھڑا ہو گیا۔ احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ میں برجیس قدر کی قیادت ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے نہیں تسلیم کی تھی۔ محمدی میں بالکل دوسرا معاملہ تھا۔ یہاں احمد اللہ شاہ کے علاوہ نانا راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ دونوں ہی اعلیٰ قیادت سنبھال سکتے تھے۔ لیکن شہزادہ فیروز اور نانا صاحب کے مقابلے میں احمد اللہ شاہ فوج میں زیادہ مقبول تھے۔ دوم احمد اللہ شاہ ایسے علاقے میں تھے جہاں قرب و جوار میں روہیلوں کی بڑی آبادیاں تھیں اور وہ احمد اللہ شاہ کی قیادت کو بہتر سمجھتے تھے حالات کا تقاضہ تھا ایسا شخص قیادت سنبھالتا جو تجربہ کار اور عمر کے لحاظ سے بھی برتر ہوتا۔ بہرحال احمد اللہ شاہ نے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنے اور اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے 20 مارچ 1858 کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ کمال الدین کا بیان ہے کہ اس اعلان سے شہزادہ فیروز شاہ بھی ناراض ہو گئے۔ [35]

احمد اللہ شاہ کے بادشاہت کے اعلان کے پس پشت یہ نفسیاتی شعور بھی کارفرما تھا کہ دہلی کا آخری مغل بادشاہ رنگون (برما) میں انگریزوں کی قید میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بیگم حضرت محل اور برجیس قدر نیپال میں بھٹک رہے تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے بادشاہ نفسیاتی طور پر حکومت کے لیے لازم تھا اور یہ لفظ جادوئی حیثیت رکھتا تھا۔ دوسرا اہم نفسیاتی پہلو یہ بھی تھا کہ اس اعلانیہ سے قرب و جوار کے زمینداروں، جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کو یہ بھی احساس دلاتا تھا کہ واقعتاً انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ بادشاہت کے اعلان کے بعد احمد اللہ شاہ نے اپنے نام کے سکے جاری کیے جس پر یہ شعر کندہ تھا

"سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ۔ حامی دین محمد، احمد اللہ بادشاہ"

اعلان بادشاہت کے بعد احمد اللہ شاہ نے نوابین، راجاؤں، ناظموں اور چکلہ داروں کے نام حکم نامے اور فرامین جاری کیے تھے جو اب نہیں ملتے۔ ایک حکم نامہ جو مہارانی چندر کور والدہ مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے سفر کے متعلق ملتا ہے وہ دلچسپ ہے۔ [36] اس میں احمد اللہ شاہ نے تمام نوابین، راجاؤں، ناظموں، چکلہ داروں اور زمینداروں کو از نیپال تا لاہور ہدایت دی تھی کہ

مہارانی مذکور کو بحفاظت منزل مقصود تک خاطر مدارات کے ساتھ پہنچا دیا جائے۔ بہر حال شاہ صاحب کے اعلان بادشاہت نے انگریزوں کو بہت فکر مند کر دیا تھا۔ اب ان کی گرفتاری پر انگریزی سرکار نے پچاس ہزار روپے کی انعامی رقم کا اعلان کر دیا۔[37]

احمد اللہ شاہ اپنی فوج کو بہترین طور پر منظم اور طاقت ور بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے فوری طور پر روپیوں کی ضرورت تھی۔ اب تک احمد اللہ شاہ کس طرح فوج کا کام چلا رہے تھے اس کا واضح طور پر پتہ نہیں چلتا لیکن گمان غالب ہے کہ ان کی معاونت اودھ کے کچھ تعلقہ دار اور زمیندار کر رہے تھے۔[38] جیسے علی محمد خاں تعلقہ دار، دل جیت سنگھ تعلقہ دار بدھی پور، قادر بخش تعلقہ دار اور سید کاظم علی تعلقہ دار، اودھ کے تعلقہ داروں اور زمینداروں کی مالی مدد کے علاوہ احمد اللہ شاہ کو انگریزوں اور ان کے حلیف ہندوستانی فوجیوں کی نقل و حرکت کی بھی اطلاع دے رہے تھے۔ احمد اللہ شاہ نے تعلقہ داروں اور زمینداروں کو بذریعہ اعلانیہ یہ یقین دلایا تھا کہ جو لوگ اپنے علاقوں میں انگریزوں سے جنگ کریں گے اور ہلاک کریں گے ان سے ان کے علاقوں کی صرف نصف جمع وصول کی جائے گی۔[39] اس اعلانیہ کا کس حد تک اثر ہوا۔ کچھ کہنا مشکل ہے۔ انگریزوں نے بھی تعلقہ داروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایسے ہی اعلامیے جاری کیے تھے۔

احمد اللہ شاہ کو انگریزی فوج کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ان کا ایک ہی جگہ پر قیام خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے باوجود بیماری کے وہ اپنا مستقر تیزی سے بدلتے رہے۔ شاید اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کا دورہ کر کے لوگوں کو انگریزی حکومت کے خلاف اکسایا جائے اور یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا نیا بادشاہ ایک فعال، باعمل اور باخبر شخص ہے۔ شاہ صاحب کی حکمت عملی نے انگریزوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور وہ ان کے متعلق صحیح معلومات نہ پا کر قدم اٹھانے سے معذور تھے۔ وہ شاہ صاحب کے سفر کی سمت بھی معلوم کرنے میں ناکام ہو جاتے تھے۔ مثلاً احمد اللہ شاہ 28 اپریل 1858 کو خیر آباد میں تھے۔ 30 اپریل کو وہ شاہ جہان پور کولن کیمبل کے خلاف روانہ ہو گئے تھے۔ 2 مئی کو کولن بریلی چلا گیا اور شاہ صاحب نے اس پر قبضہ جما لیا لیکن یہ قبضہ عارضی ثابت ہوا۔ 11 مئی کو بریگیڈیر جونس

نے کامیابی کے ساتھ شاہ جہان پور میں محصور جیل سے رابطہ قائم کر لیا۔[40] احمد اللہ شاہ کی فوجی برتری اور صلاحیت کے پیش نظر جونس نے بریلی کے قریب موجود انگریزی فوج سے مدد مانگی۔ اس دوران بھی شاہ صاحب اپنا مستقر برابر تبدیل کرتے رہے۔ 16 مئی کو وہ اجوتا نائر شاہ جہاں پور سے چھ میل مشرق میں مقیم تھے۔ 17 مئی کو وہ لودی پور شاہ جہاں پور کے مضافات میں تھے اور بالی پر قبضہ کر چکے تھے۔[41] 18 مئی 1858 کو احمد اللہ شاہ موضع بنی جو شاہ جہاں سے 5 میل دور مشرق میں مقیم تھے جہاں ان کا تصادم انگریزی فوج سے ہوا۔ شاہ صاحب کو شکست ہوئی۔ وہ موضع سانڈی پہنچے۔[42] ان کی فوج منتشر ہو چکی تھی اب ان کے ساتھ صرف پانچ سو افراد تھے۔ شاہ صاحب کو اب بھی گرد و نواح کے تعلقہ داروں اور زمینداروں سے تعاون کا یقین دلایا جا رہا تھا ان میں پوائن، شاہ جہان پور کا راجہ جگناتھ سنگھ بھی شامل تھا۔ اس کا بھائی بلدیو سنگھ بقول نائب شاہ صاحب کی فوج میں شامل تھا اور اپنے بھائی کے خلاف فرضی قضیہ بیان کر کے مدد کا خواہش مند تھا۔ دراصل اس بہانہ سے شاہ صاحب کو گرفتار یا قتل کرنا تھا کیونکہ اودھ میں صرف احمد اللہ شاہ ہی واحد شخص باقی رہ گئے تھے جو انگریزوں سے جنگ آزما تھے۔[43] اس موقع پر مولوی فضل حق خیر آبادی بھی احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھے۔ اپنی کتاب الثورۃ الہندیہ میں لکھتے ہیں:

> "اس نیک سرشت بہادر عالم (احمد اللہ شاہ) سے ایک دیہاتی کافر زمیندار بلدیو سنگھ) نے بڑا داؤ کھیلا۔ اس نے قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں مقابلہ پر آ جائیں گی تو چار ہزار بہادروں کا گروہ لے کر مدد کو پہنچے گا۔ جب مقابلہ کی نوبت آئی تو اس زمیندار کی قسموں پر اعتبار کر کے اس دیانت دار عالم نے اپنے تھوڑے سے بہادروں کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔"(44)

موضع بنی سے شاہ صاحب موضع سانڈی پہنچے اور وہاں سے راجہ جگناتھ کے قلعہ پوائین کی طرف چند آدمیوں کے ساتھ بڑھے۔ شاہ صاحب کو راجہ پوائن پر پورا اعتماد تھا اور وہ اس سازش سے آگاہ نہ تھے کہ وہ در پردہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ قلعہ کے سامنے پہنچتے ہی شاہ صاحب پر گولیوں کی بوچھار ہوئی اور شاہ صاحب شہید ہو گئے۔ ان کا سر قلم کر کے شاہ جہاں پور انگریزوں کی شناخت کے لیے بھیج دیا گیا۔ انگریزی حکام نے شناخت کے بعد شاہ صاحب کی لاش کو نذر

آتش کر دیا۔ ان کے سر کو کوتوالی کے سامنے ایک کھمبے میں باندھ کر لٹکا دیا گیا تا کہ دوسرے لوگ انگریزوں کے خلاف سر اٹھانے کی ہمت نہ کر سکیں۔ اس طرح انگریزوں نے احمد اللہ شاہ کی حب الوطنی اور اپنے ملک کو آزاد کرنے کے لیے جنگ کرنے کا بدلہ لیا۔

احمد اللہ شاہ کی حب الوطنی اور بہادری کا اعتراف انگریزی فوجی مورخ میلیسن خراج عقیدت پیش کرتا ہے:

> "اگر محبِ وطن اسے کہتے ہیں جو اپنے وطن کی برباد شدہ آزادی کے حصول کے لیے سازشیں کرے اور لڑے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے اپنی تلوار کو قتل کے داغ سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اس نے قتل کے کسی بھی واقعہ سے چشم پوشی گوارا نہیں کی۔ وہ ان بیرونی لوگوں کے خلاف مردانگی، بلند ہمتی اور استقامت سے میدان جنگ میں لڑتا رہا جو اس کے وطن پر مسلط ہو گئے تھے اور اس کی یاد تمام قوموں کے مخلصوں اور بہادروں کی جانب سے عزت و احترام کی مستحق ہے۔" (45)

■

یہاں رسالہ فتح اسلام کے متعلق چند باتیں عرض کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ رسالہ کے عنوان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اسلام کی فتح یا ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے متعلق ہے۔ رسالہ کے زبان اور اصطلاحات بڑی حد تک مذہبی مبلغین کی نمائندگی کرتی ہے اور ایسے الفاظ جیسے بسم اللہ، جہاد، امیر، نماز، شہادت، فرعون کافر وغیرہ کا استعمال کا استعمال کیا گیا ہے، تاہم اگر ہم بغور رسالہ فتح اسلام کا جائزہ لیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس کا خطاب ہندوستان کے عوام سے ہے، انیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ لیجیے تو اس طرح کے الفاظ ہندو اور مسلمان نثر و نظم نگاروں کے یہاں اکثر ملتے ہیں اور یہ ہماری تہذیب کا جزو لاشعوری طور پر بن چکے تھے۔

رسالہ فتح اسلام میں انگریزوں کے جور و ستم اور مظالم کا بیان کرتے ہوئے صراحت کی گئی ہے کہ پہلے انھوں نے فوج میں ملازم ہندو اور مسلمانوں کا مذہب ناپاک کارتوسوں کے زبردستی استعمال سے خراب کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان فوجی ان کے

خلاف ہو گئے ۔ غرض کہ "یہ مردود فرعون بے سامان بن گئے اور فرعون ہی کی طرح ہلاک ہوں گے..... اور اب ان کے عمل دخل پھر ہونے میں ہندو مسلمان رعیت، سپاہ، بادشاہ، وزیر سب کو بڑا خطرہ ہے ۔ اس سبب سے اس وقت میں نصاریٰ مردود سے جہاد کرنا خدا و رسول کے حکم سے فرض عین ہو گیا ہے اور الحمد للہ اس فرض عین کے ادا کرنے کا سامان بھی مدد غیبی سے اب موجود ہو گیا ہے۔ یعنی اس سے سابق توپ وغیرہ سامان جنگ کا جو جہاد کے لیے ضرور ہے ہندوستانیوں کے پاس موجود نہ تھا اور اب اللہ کے فضل سے توپ وغیرہ سامان بھی اسلام کے[46] بادشاہ کے پاس دہلی اور لکھنؤ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ بادشاہ اسلام کو سلامت اور فتح مند رکھے اور اب انگریزوں کی فوج بھی تھوڑی سی رہ گئی ہے اور تتر بتر ہو گئی ہے۔ اب اس وقت میں جو جہاد نہ کرے گا تو پچھتاوے گا۔"

اس رسالے میں عوام کو انگریزوں سے جنگ کرنے کی ترکیبیں بھی بتلائی گئی ہیں یعنی لکھنؤ اور دہلی کی پوری حفاظت کی جائے۔ ان دونوں شہروں کے باہر چار چار پانچ پانچ کوس آگے بڑھ کر مورچے قائم کیے جائیں۔ مشرق کی طرف فوج روانہ ہو اور انگریزوں کو مارتے ہوئے کلکتہ تک پہنچا دیا جائے تا کہ دہلی اور لکھنؤ کا تحفظ ہو جائے۔

رسالہ فتح اسلام میں اندرون ممالک جہاں آزاد حکومت قائم ہو چکی تھی، امن دامان کی بحالی اور رعیت کے تحفظ پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ احمد اللہ شاہ کا اعلان تھا: "منادی کرا دو کہ کوئی سپاہی کسی کو نہ لوٹے اور جہاں فتح ہو وہاں رعیت کو کوئی ہرگز نہ لوٹے۔ ان کو تو دشمن نے لوٹا ہے اور تم ان کی حفاظت کو گئے ہو۔ اور اگر تم نے بھی لوٹا تو پھر وہ کس کی پناہ پکڑیں گے اور اگر کوئی لوٹے تو فی الفور اس کو سزا دو اور مال و اسباب سب پھرا دو۔ لوٹنا تو ٹھگوں کا کام ہے اور ٹھگوں کے جنازے کی نماز درست نہیں۔ ہاں دشمن کا مال لوٹنا درست ہے۔ اس کو غنیمت کہتے ہیں۔ اس کا مسئلہ امیر بتلا دے گا اور لوٹنے سے مظلوم لوگ بددعا کرتے ہیں اور بددعا جلد اثر کرتی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مظلوموں کی بددعا اور اللہ کے بیچ کوئی آڑ نہیں ہوتا۔"

رسالہ فتح اسلام پر جہاد کی فضیلت پر زور دیا گیا اور یہ طریقہ تقریباً تمام دیگر اعلانیوں

میں ملتا ہے۔ مقصد مسلمانوں کو جہاد کے نام پر متحد کر کے انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھنا تھا، لیکن دل چسپ بات یہ ہے کہ جہاد کی اپیل ہندو عوام سے بھی ہے۔ جہاد کی اپیل میں ایک طرف ثابت قدم رہنے کی تلقین کی گئی ہے تو دوسری طرف مجاہدین آزادی کو اخلاقی قدروں کو بھی برتنے کی صلاح دی گئی ہے کہ دوران جنگ بھاگتے ہوئے دشمن کے علاوہ کسی کو ہرگز قتل نہ کیا جائے۔ "بغیر لڑائی کے کسی گناہ کی سزا میں قتل کرنا تو جلاد کا کام ہے اور کسی کے قتل کا حکم دینا بادشاہ کا کام ہے۔"

رسالہ فتح اسلام میں انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے مرکزی قیادت کے علاوہ مقامی قیادت کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اودھ کے مخصوص حالات، ہندو، شیعہ، سنی اتحاد قائم رکھنے اور مسلکی اختلافات کو حتی الوسع دور رکھنے کے پیش نظر امیر یا امام مقرر کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ بہر حال امام یا امیر مقرر کرنے میں ترجیح (قریشی) اشراف کو دی گئی ہے جیسے سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی اور عباسی لیکن اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ اگر قریشی نہ ہو بلکہ اور بھی بعض شرطیں امامت کی اس میں موجود نہ ہوں مگر مسلمان شرع کا تابع ہو اور دنیا کی ریاست اس کو حاصل ہو تو اس کو امیر کرنا درست ہے اور وہ امام اکبر کہلائے گا......الغرض مسلمان امیر خواہ کیسا ہی ہو اس کی تابعداری کتاب سے درست ہے اور عقل و دین کی شرم بھی یہی کہتی ہے کہ بکٹوریہ (ملکہ وکٹوریہ) کافرہ اور دین کی دشمن انگریزوں کی تابعداری سے مسلمان امیر کی تابعداری اور بادشاہ کے تابعدار راجا لوگوں کی تابعداری کروڑوں درجہ افضل ہے۔

رسالہ فتح اسلام کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں چھاپہ مار جنگ کرنے کو ترجیح دی گئی ہے اور عوام و فوج سے اپیل کی گئی ہے کہ امام کی یا امیر کی تابعداری کریں۔ 'ہندو لوگ بھی اپنے دین کی محافظت کے واسطے امیر کے شریک ہو جاویں کیونکہ اس سے سابق اسلام کے بادشاہ نے ہندو لوگوں کی جان اور مال اور بال بچوں کی محافظت کو مسلمانوں کی جان و مال اور بچوں کی محافظت کی طرح بموجب شرع کے اپنے ذمے لازم کر لیا تھا اور سب ہندو دل و جان سے مطیع الاسلام کے خیر خواہ تھے تو اب وہی ہندو ہیں اور وہی مسلمان ہیں اور وہی کتاب ہے اپنے دین پر دے رہیں

گے اور اپنے دین پر ہم رہیں گے۔ ہم ان کی مدد اور محافظت کریں گے وہ ہماری مدد اور محافظت کریں گے۔" اس طرح رسالہ فتح اسلام ہندوستان میں مذہبی ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ ہندوستان کو سب کا ملک، ہندو کو مسلمان کا اور مسلمان کو ہندو کا محافظ بتلاتا ہے۔ یہ اس کا واضح ثبوت ہے کہ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے وقت تک ہندو اور مسلمان کے اندر منافرت کا نہیں بلکہ خیر خواہی، آپسی اعتماد تعاون اور خیر خواہی کا جذبہ فطری طور پر بہت گہرا اور مضبوط تھا۔

رسالہ فتح اسلام میں ہر شہر میں صرف ایک امیر یا امام کے تقرر پر زور دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ اس خیال سے تھا کہ اگر ایک سے زیادہ امیر ہوگا تو طاقت کے دو یا کئی مرکز ہو جائیں گے جیسا کہ لکھنؤ میں ہوا جس کی وجہ سے مجاہدین آزادی کی طاقت منتشر ہو گئی۔

رسالہ فتح اسلام میں عیسائیوں کو کافر بتلایا گیا ہے جب کہ خالص شرعی نقطۂ نگاہ سے یہ انداز تخاطب قابل بحث ہے۔

رسالہ فتح اسلام کے آخری حصہ میں ایک اور اشتہار کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس میں انگریزوں کے ظلم و زبردستی، قتل و غارت گری کا ذکر کرنے کے بعد کوئین وکٹوریہ پر الزام لگایا گیا ہے کہ ان کی ایما پر ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی مہم شروع ہوئی تھی تاکہ ہندوستان میں عیسائیت عام ہو جائے۔ اس اشتہار میں ہندوستانیوں سے کہا گیا ہے کہ "ہندو مسلمان ان کی (انگریزوں) کی کسی قسم کی نوکری نہ کریں اور ان کی نوکری میں مولوی اور پنڈت کے قتل کی شراکت سمجھیں اور سب مل کر انھیں کے قتل پر مستعد ہو جائیں تو خیر ہے اور نہیں تو خیر نہیں ہے اور ایسے قتل عام کے وقت میں مرد، عورت، لونڈی، غلام پر ان کے قتل کے واسطے نکلنا فرض عین ہو گیا ہے، سو اب اس کی تدبیر یہ ہے کہ سارے مولوی اور پنڈت لوگ ان کے بچنے کی قباحت اور مارنے کا فائدہ اور ثواب گاؤں گاؤں شہر شہر میں بیان کرتے پھریں اور بادشاہ وزیر، رجواڑے نواب ان کو میدان میں مارلیں۔ ظاہر ہے کہ اس اشتہار کا مقصد یہ تھا ملک کے ہر گاؤں کے افراد انگریزوں کے مخالف ہوں اور ان کو نکال باہر کریں۔

رسالہ فتح اسلام کی زبان عام فہم اردو ہے۔ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کم ملتے ہیں۔

اس کی ابتدائی عبارت میں رجب علی سرور کے قافیہ بند انداز کی جھلک ملتی ہے۔ عام بول چال کے الفاظ جیسے بول بالا، ٹٹی، گولا گولی، چھتر، تتر بتر، پتلا، سیندور، گیدڑ بھبکی، دین، دھرم، واؤ گھات، چھانٹ، اکاڑی، پچھاڑی، تلی تھولی کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جواب کم مستعمل ہیں یا متروک ہو چکے ہیں جیسے ہلکارے (ہرکارے)، اُچکے (اچانک) وغیرہ۔

رسالہ فتح اسلام سے اس دور کی سماجی اور ذہنی حالت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس زمانہ میں یہ رسالہ تحریر کیا گیا تھا وہ جاگیردارانہ اور زمیندارانہ تھا۔ فکر میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا احساس غالب تھا تاہم اس رسالہ میں پست اقوام جیسے چمار اور پاسیوں کی تضحیک نہیں بلکہ ان کی جرات اور بہادری کو نمونہ بنا کر عوام کو جوش دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب ایسے پست قوم کے افراد نے بڑے بڑے انگریزوں کو ہلاک کر دیا تو اعلیٰ ذات کے لوگ کیوں پیچھے رہیں۔

رسالہ فتح اسلام میں رابطہ اور خفیہ معلومات کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس میں زور دیا گیا ہے کہ جدوجہد آزادی میں کامیابی کے لیے اچھے ہوشیار جاسوسوں اور ہرکاروں کو مقرر کیا جائے جو خیر خواہ اور نمک حلال ہوں اور ہر دن رات کی پہر پہر اور گھڑی گھڑی کی خبر دشمن کے لشکر کی پہنچاتے رہیں۔

رسالہ فتح اسلام 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی اردو زبان میں نہایت اہم اور مستند دستاویز ہے۔

حواشی:

1. تاریخ احمدی، لکھنؤ 1925، بعد ازاں ابرار حسین فاروقی نے اسے 1973 میں مبسوط دیباچے کے ساتھ بریلی سے شائع کیا ہے۔ آئندہ بحوالہ تائب۔
2. تائب، ص 32
3. ایضاً
4. تائب نے تفصیلات درج کی ہیں۔ ملاحظہ ہو، تائب صفحات 21 تا 32 اور 108
5. مغل حکمرانوں کی طرف سے آپ کے بزرگوں کو گزر اوقات کے لیے مدد معاش کی جاگیر حاصل تھی۔ کچھ دنوں تک آپ نے مہاراجہ جے پور کے یہاں ملازمت بھی کی۔ گوالیار کے صوفی بزرگ شاہ محراب سے بیعت حاصل کی۔
6. تواریخ ہندوستان، بحوالہ جنگ آزادی 1857 (ایوب قادری)، صفحات 530-531
7. انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، دہلی، صفحات 22-23
8. یہ رپورٹ کتابی شکل میں Journey through the kindom of oudh کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔
9. انتظام اللہ شہابی کے مطابق آگرہ میں قیام کے دوران جمعرات اور جمعہ کے دن احمد اللہ شاہ کا جلوس نکلا کرتا تھا۔ جلوس میں آگے آگے ڈنکا بجایا کرتا تھا اور یہ خود پالکی میں سوار ہوتے تھے۔ غالباً لکھنؤ والوں نے اسی لیے ان کا نام ڈنکا شاہ برقرار رکھا تھا۔ ملاحظہ ہو کمال الدین حیدر، قیصر التواریخ، جلد دوم، ص 203 اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے باغی علماء، ص 14، غدر 1857 کے مجاہد، لاہور 1957، ص 62
10. ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، ص 65، بعنوان گڑھی کی سپاہ کے تشکیل ابتداء سے آخر تک کے حالات کمال الدین حیدر نے لکھے ہیں۔ دیکھیے قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحات 127 تا 108، مولوی کے متعلق ملاحظہ ہو، ص 125
11. ملاحظہ Fazl, Haq of Khairabad- a rebel scholar of 1857, Proceedings of Indian History Congress, 48th session Goa, 1988, pp.355-65
12. طلسم لکھنؤ نمبر 28، مورخہ 30 جنوری، 27 فروری 1857
13. Narrative of the Mutiny in Oudh, Calcutta, Hutchinson
غالباً ہچنسن کی اطلاع غلط تھی کیونکہ احمد اللہ شاہ فروری میں لکھنؤ میں وارد ہوئے تھے۔ طلسم لکھنؤ اپنی 21 نومبر 1856 کی اشاعت میں شاہ صاحب کی آمد کا ذکر کرتا ہے۔
14. قیصر التواریخ، دوم، صفحات 51 تا 57۔ ایک دوسری جگہ کمال الدین لکھتا ہے کہ 87 ہزار آدمی جن کی تنخواہ تراسی لاکھ روپے ادا کی جاتی تھی۔ قیصر التواریخ، دوم، ص 170
15. دہلی اردو اخبار، مورخہ 8 جون 1857، بحوالہ سید اطہر عباس رضوی، فریڈم اسٹرگل ان اترپردیش، جلد دوم، ص 35
16. قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحات 203-204
17. An Account of the Mutinies in Oudh کمال الدین حیدر بہر حال لکھتا ہے کہ فوج نے ابتدا میں برجیس قدر کو آگے بڑھایا تھا۔ قیصر التواریخ، جلد دوم، ص 204
18. قیصر التواریخ، جلد دوم، صفحہ 213، تائب، صفحات 58-62
19. تائب، ص 64 پر لکھتا ہے کہ کوئی کیبل شاہ مقرر کیا۔ کیا ایک قتل ... کو افسر کیا۔

45. A History of Indian Mutiny, Vol. III, p.267 جنرل ہامس جو 1858 میں انگریزی فوج کی قیادت کر رہا تھا مولوی احمد اللہ کی شجاعت، عزم مصمم اور بہترین سپاہی ہونے کے لیے تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے: "یہ فخر اسی کو حاصل ہے کہ اس نے دو مرتبہ سر کالون کیمبل کو میدان جنگ میں ناکام رکھا۔ وہ بہ نسبت اور باغیوں کے خطاب شاہ کا زیادہ مستحق تھا۔ مولوی یقیناً اپنے ملک کا محب صادق تھا۔ اس نے کبھی تلوار کو قتل اور سازشی قتل سے خون آلود نہیں کیا۔ دنیا کی ساری قومیں اس کو تعظیم اور ادب کے ساتھ جو شجاعت اور صداقت کے لیے لازمی ہے اور جن کا مولوی مستحق تھا، اس کو یاد کریں گی۔" ماخوذ، مسیح الدین، تاریخ شاہجہاں پور، ص-130 ۔ اگر احمد اللہ شاہ کے متعلق جائج رپورٹ میں گواہ کا اندازہ درست ہے کہ اپنی موت کے وقت احمد اللہ شاہ عمر فقط 40 سال کے تھے دیکھیے رضوی فری ڈم اسٹرگل ۔۔۔ جلد دوم، ص 148

46. اطلاعیہ میں بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ اسلام کہنا دلچسپ ہے۔ کسی بھی مغل بادشاہ نے خود کو بادشاہ اسلام نہیں کہا ہے۔ یہاں رسالہ فتح اسلام کے لکھنے والے نے عام مسلمانوں کو جہاد پر راغب کرنے کے لیے لکھا ہے۔

اقبال حسین

مولانا فضل حق خیرآبادی

1857 کی پہلی جنگ آزادی کے مجاہدین میں مولانا فضل حق کا ایک نمایاں مقام ہے۔ مولانا فضل حق کا آبائی وطن خیرآباد (سیتاپور، یوپی) تھا لیکن ان کے والد فضل امام دہلی میں ملازم تھے اور صدرالصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔[1] فضل حق دہلی میں 1797 میں پیدا ہوئے۔[2] ابتدائی تعلیم والد سے ملی اور بعد میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے شاگرد ہوئے۔ حدیث کی تعلیم حاصل کی اور دوسرے مروجہ علوم دینی عقلیہ ونقلیہ مختلف علما سے حاصل کیے۔[3] اور خود درس و تدریس میں معروف ہو گئے۔

فضل حق کا گھرانا زمانہ قدیم سے علمی رہا تھا۔ مغل بادشاہوں اور نوابین اودھ نے فضل حق کے مورثین اعلیٰ کو ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں مددمعاش کے لیے زمینیں عطا کی تھیں جس کی وجہ سے پورا خاندان خوش حال اور فارغ البال تھا۔[4] مولانا کی زندگی بھی ابتدا سے ہی آرام اور فارغ البالی کی تھی تاہم وہ اپنی علمی سرگرمیوں میں پورا حصہ لیتے تھے۔ 1816 میں انھوں نے کمپنی کی ملازمت بطور سررشتہ دار دیوانی شروع کی۔ جلد ہی ان کو یہ احساس ہوا کہ ملازمت میں رسوائی اور ذلت ہے۔ چنانچہ اپنے والد کو 1818 میں لکھا:

> "میں خدا کے فضل وکرم سے خوش حال اور مطمئن ہوں مگر ملازمت میں ذلت وخواری بہت ہے۔ حاکم کے سامنے مستقل حاضر رہنا پڑتا ہے اور اس کے وہ احکام املا کرنا ہوتے ہیں جو قابل قبول نہیں ہوتے۔ قسم خدا کی اگر مجھے رسوائی کی شرم نہ ہوتی تو کبھی کا

کہیں اور منتقل ہو جاتا اور متوکلانہ زندگی بسر کرتا۔" (5)

مولانا کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت حساس مزاج رکھتے تھے اور غالباً انگریزی حکومت کے بڑھتے ہوئے استبداد کو ناپسند کرتے تھے۔ بالآخر 1831 میں انھوں نے کمپنی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا، اور نواب فیض محمد خاں، نواب جھجھر کی ملازمت اختیار کرلی۔ مرزا غالب نے جن سے مولانا فضل حق کے گہرے مراسم تھے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا ہے:

"بے تمیزی و قدر ناشناسی حکام فرنگ آں رنجت کہ فاضل بے نظیر و المعیٰ یگانہ مولوی حافظ فضل حق از سررشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار رہانید۔" (6)

(ترجمہ: حکام فرنگ کی بے تمیزی اور قدر ناشناسی نے یہ رنگ دکھایا کہ فاضل بے نظیر والمعیٰ یگانہ مولوی حافظ محمد فضل حق نے عدالت دیوانی کی سررشتہ داری سے استعفا دے کر ننگ و عار سے نجات پائی۔"

جیسے جیسے زمانہ گذرتا رہا، فضل حق کی طبیعت میں انگریزی حکومت کے خلاف انتشار اور بغاوت کے آثار تیز تر ہوتے گئے۔ انگریز حکام کے ظالمانہ احکامات و اقدامات سے عوام پر بڑھتے ہوئے اقتصادی بوجھ اور ان کی تکالیف مولانا پر روز اول سے آشکار تھیں۔ 1831 میں سید احمد شہید کی شہادت نے غالباً ان پر اور برا اثر ڈالا تھا۔ بدقسمتی یہ تھی کہ اس دور میں کوئی ایسی قیادت موجود نہیں تھی جو عوام کے حقوق کی پامالی کے خلاف آواز اٹھاتی۔ فضل حق کے سامنے قیادت کے نام پر لے دے کر بادشاہ وقت اکبر شاہ ثانی ہی تھے مگر وہ بھی بے دست و پا تھے اور انگریزوں کے پنجہ میں گرفتار تھے۔ تاہم مولانا کا جی نہ مانا دل کا غبار نکالنے کے لیے ہی سہی انھوں نے اکبر شاہ ثانی کی توجہ اس دور کے حالات کی طرف مبذول کی:

"یہاں کے باشندے ہندو ہوں یا مسلمان، ملازمت، تجارت، زراعت، حرفت، زمینداری اور دریوزہ گری پر معاش رکھتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد سے معاش کے یہ تمام وسائل مسدود و مفقود ہو گئے ہیں۔ ملازمت کے دروازے شہریوں پر بند ہیں، تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے، کپڑا، سوت، ظروف اور

گھوڑے وغیرہ تک وہ فرنگ سے لے کر خود فروخت کر کے نفع کماتے ہیں۔ معافی
داروں کی معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں۔ کسانوں کو محاصل کی کثرت نے بے حال کر دیا
ہے۔"[6]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فضل حق زیادہ دنوں تک جھجھر میں نہیں رہ سکے۔ وہ الور، رام پور
سہارن پور اور ٹونک بظاہر ملازمت کی تلاش میں گئے۔ رام پور میں آٹھ سال ملازمت کرنے کے
بعد فضل حق لکھنؤ آ گئے اور وہاں صدر الصدور ہو گئے۔[7] غالباً 1851 میں کسی بات پر مولانا فضل
حق اور ان کے ساتھی مولوی ہادی بخش کا، سید مظہر نبی اور نور احمد سے نزاع ہوا اور بہ علت خانہ جنگی
گرفتار ہو کر داخل زنداں کر دیے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید مظہر نبی اور نور احمد لکھنؤ میں بہت
با اثر افراد میں سے تھے جس کا انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ پانچ سال تک جیل میں بند رہے اور
غالباً اس کی پیشی بھی نہیں ہوئی۔ 1856 لکھنؤ میں نئے جوڈیشل کمشنر نے مقدمہ کی مسلوں کا
معائنہ کر کے مولوی فضل حق کی رہائی کا حکم جاری کیا۔[8]

اودھ میں کمپنی کی حکومت نے اپنا اقتدار جمانے کے بعد محکمہ قضا کو توڑ دیا تھا۔ اس کی
وجہ سے مولانا فضل حق اور دیگر حضرات کو سخت ناراضگی ہوئی کیونکہ بہت سے شریف مسلمان
خاندانوں کے افراد محکمہ قضا سے وابستہ تھے اب ان کی روزی کے لالے پڑ گئے۔ دریں اثنا مولانا
فضل حق کی ملاقات مولوی احمد اللہ سے بھی ہو گئی تھی جو خاموشی سے اپنی جہادی سرگرمیوں میں لگے
ہوئے تھے۔[9] فضل حق بھی اب جہاد کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ مولانا نے جہاد کے لیے الور،
میوات اور دہلی میں رضا کار جمع کیے۔ مئی میں جب پہلی جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی تو اس وقت وہ
الور میں تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد پر تقریروں کا سلسلہ جاری کیا تھا جس کی وجہ
سے بہت سے لوگ ان کے ساتھ رضا کارانہ طور پر شریک ہو گئے تھے۔[10] مولانا فضل حق اپنے
رضا کار جہادیوں کے ساتھ 16 اگست 1857 کو دہلی میں تھے۔ انھوں نے بادشاہ کو ایک اشرفی
کی نذر پیش کی اور ان سے صورت حال کے متعلق گفتگو کی۔[11] جیون لال نے 18 اگست
1857 کے روزنامچہ کے اندراج میں مولانا فضل حق کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتا
ہے کہ مولوی فضل حق نے بادشاہ سے بیان کیا کہ انگریزوں نے اخبار میں شائع کیا ہے کہ دہلی کی فتح

کے بعد شہر میں قتل عام ہوگا اور شہر غارت و تباہ کر دیا جائے گا اور شاہی خاندان کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے گا۔ چونکہ سپاہیوں نے لڑائی کے اصول چھوڑ دیے ہیں اس لیے کوئی صورت انگریزوں پر فتح پانے کی نہیں ہے۔[12] مولانا کے مزاج اور ان کی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ انھوں نے ایسی بات کہی ہوگی۔ بہر حال بہادر شاہ نے فضل حق کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ انگریزوں سے مقابل ہوں۔[13] جیون لال مزید لکھتا ہے کہ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ فوج بھوکی مر رہی تھی اور جب تک ان کا خرچ نہیں دیا جائے گا وہ کسی سردار کا حکم نہیں مانیں گے۔ بہادر شاہ نے مولانا فضل حق کو فوج کی مدد کے لیے لگان کی وصولی کی اجازت تھی۔ مولانا کے فرزند عبدالحق اور فیض احمد گڑگاؤں سے لگان کی تحصیل کے لیے مقرر کیے گئے۔ مولانا فضل حق دہلی میں عوام کو جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دیتے رہے۔[15]

دہلی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی مہم میں صرف مولانا فضل حق ہی نہیں پیش پیش تھے بلکہ وہاں پنڈتوں نے بھی انگریزوں کے خلاف مہم جاری کر رکھی تھی۔ مولوی ذکاء اللہ جو 1857 کے واقعات کے چشم دید گواہ تھے اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کئی مواقع پر پنڈتوں نے اپنے پاتروں کو دیکھ کر سپاہیوں کو سعد اوقات بتلائے تھے تاکہ وہ انگریزوں سے جنگ کر کے انھیں شکست دے دیں۔ چاندنی چوک اور دوسرے بازاروں میں پنڈتوں کے گروہ اپنی اپنی پوتھیوں کے ساتھ لوگوں کو انگریز ملیچھوں کے خلاف جنگ کی ہدایت دے رہے تھے۔[16] اگست 1857 میں مجاہدین آزادی کی حالت دہلی میں نازک ہوگئی تھی اس کا ایک سبب جاسوسوں کی سرگرمی اور آپسی اختلافات تھے۔ سپاہیوں میں پست ہمتی بڑھتی جارہی تھی۔ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے مولانا فضل حق نے جنرل بخت محمد خاں سے مشورہ کے بعد ایک فتویٰ جاری کیا تھا جس میں تمام بڑے علما کے دستخط تھے۔ اس کے نتیجہ میں تقریباً نوے ہزار افراد رضا کارانہ طور پر جہاد میں حصہ لینے تیار ہوگئے۔[17] فضل حق دہلی میں زیادہ دنوں تک مقیم نہیں رہ سکے کیونکہ مرزا مغل اور جنرل بخت خاں میں اختلافات بڑھتے جارہے تھے۔[18] انگریزوں نے دہلی پر 19 ستمبر 1857 کو قبضہ کرلیا۔ فضل حق پانچ دنوں تک روپوش رہے اور 25 ستمبر 1857 کو معہ

اہل خاندان کے ہجرت کر کے اودھ کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بھیکم پور، ضلع علی گڑھ میں اٹھارہ دنوں تک نواب عبدالستار خاں کے مہمان رہے۔[19] بھیکم پور سے وہ خیرآباد پہنچے جہاں وہ اہل خاندان کو چھوڑ کر شہزادہ فیروز شاہ کی فوج میں شامل ہو گئے تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھ سکیں۔ شہزادہ فیروز شاہ کے چلے جانے کے بعد مولانا فضل حق، احمد اللہ شاہ سے جا ملے۔ وہ احمد اللہ شاہ کے ساتھ پوائیں بھی گئے تھے جہاں شاہ صاحب کا دھوکہ سے قتل کر دیا گیا۔[20] احمد اللہ شاہ کے حادثہ کے بعد فضل حق پھر روپوش ہو گئے کیونکہ انگریزی حکومت تمام مجاہدین آزادی کی تیزی سے گرفتاری کر کے سزائیں دے رہی تھے۔ ملکہ برطانیہ کے یکم نومبر 1858 کے اعلانیہ کے بعد مولانا فضل حق روپوشی چھوڑ کر 26 دسمبر 1858 کو کرنل کلارک سے اس امید پر ملاقاتی ہوئے کہ ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں ہوگی، لیکن انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ڈپٹی کمشنر کے حوالہ کر دیا گیا۔ 30 جنوری 1859 کو انھیں لکھنؤ لایا گیا اور 28 فروری 1859 فرد جرم عائد کی گئی کہ:

1. وہ 1857 اور 1858 کے دوران باغیوں کا سرغنہ رہا اور دہلی واودھ دوسرے مقامات پر اس نے لوگوں کو بغاوت اور قتل کی ترغیب دی۔
2. اس نے بونڈی کے مقام پر مئی 1858 میں باغی سرغنہ ممو خاں کی مجلس مشاورت میں نمایاں حصہ لیا۔[21] چار دنوں کی سرسری سماعت کے بعد مولانا فضل حق کو حبس دوام اور انڈمان (کالا پانی) کی تاحیات سزا سنادی گئی۔ مولانا کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو بھی سرکار ضبط کر لیا گیا۔ مولانا نے انصاف کے لیے وائسرائے کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا، مگر ان کی اپیل مسترد کر دی گئی۔ 8 اکتوبر 1859 کو کالا پانی یعنی جزیرہ انڈمان بھیج دیے گئے۔

ہندوستان میں مولانا فضل حق آرام و سکون کی زندگی کے عادی تھے۔ کالے پانی میں بطور قیدی ان کی زندگی بے حد تکالیف میں گذری۔ قید و بند کی سختیاں اور ذلت کے احساس نے مولانا کو ذہنی طور پر بہت اذیت پہنچائی۔ ان کے دلی جذبات ان کی دو کتابوں الثورۃ الہندیہ اور قصائد فتنۃ الہند کے اوراق میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے متعلق الثورۃ

الہندیہ نہایت اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں انڈمان میں مقید اسیروں کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔ الثورۃ الہندیہ آسان اور رواں عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ عربی زبان کا انتخاب غالباً مولانا نے اس لیے کیا تھا کہ جیل کے نگراں اسے آسانی سے نہ سمجھ سکیں۔ الثورۃ الہندیہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر کوئلے سے لکھی گئی تھی۔ مولانا نے اس بات کی احتیاط کی تھی بیان میں کوئی نام نہ آئے تاہم انھوں نے استعاروں میں ان کا ذکر اس طرح کیا تھا کہ افراد کو پہچان لیا جا سکے۔ الثورۃ الہندیہ کا مسودہ ہندوستان میں مولوی عنایت احمد کاکوروی، جو خود بھی 1857 میں سرگرم عمل ہونے کی وجہ سے انڈمان میں قید تھے، رہائی کے بعد ہندوستان لائے تھے۔[22]

فضل حق نے الثورۃ الہندیہ کی ابتدا حمد باری تعالی سے کی ہے اور دعا گو تھے کہ جلد ہی رحمت باری تعالی سے انھیں قید سے رہائی مل جائے گی۔[23] اس کے بعد فضل حق اپنی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کتاب ایک دل شکستہ، مجبور، مصیبت زدہ شخص کی قلم سے ہے جس کے پاس مزید سختی اور مصائب جھیلنے کی طاقت باقی نہیں رہی ہے۔[24] وہ دوبارہ اللہ پاک سے دعا کرتے ہیں کہ انھیں اس ذلت آمیز زندگی سے رہائی ولا دیں جو ان کے لیے ناقابل برداشت ہے کیونکہ ہندوستان میں وہ آرام اور خوش حالی کی زندگی گذار رہے تھے۔[25] انگریزوں کے ظلم و استبداد اور اپنی مجبوری کا ذکر خود ان کے الفاظ میں سنیے: "ان ظالموں نے اسے اچھے لباس سے معرا کر کے غم و حزن کی وادیوں میں اور ایسے تنگ و تاریک قید خانوں میں ڈال دیا ہے جو سیاہ فتنوں کے مرکز ہیں۔ وہ محبوس و حزیں، بخت دل، اچھے افراد پر نظر کرتے ہوئے اپنی رہائی سے مایوس ہے مگر اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہے۔ وہ ایک سیدھا سادا، نرم خو اور مریض و کمزور ہوتے ہوئے شریر اور بدفطرت کی قید میں ہے اور ظالم و جابر، بدخلق و بدکردار کے مظالم سے حیران و پریشان ہے۔ وہ آفت رسیدہ، ایسے مصائب میں مبتلا ہے جن کی سختیوں تک قیاس کرنے والے کا قیاس نہیں پہنچ سکتا اور ایسا مضطر و محتاج ہے جو سخت عذاب اور احتباس میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ سفید رو، سیاہ دل، متلون مزاج، ترش رو، کنجی آنکھ، گندم گوں بال والوں کی قید میں آ چکا ہے جس کا اپنا عمدہ

لباس اتار کر موٹا اور سخت لبادہ پہنا دیا گیا ہے جو اس وقت مجبور و عاجز ہے اور اپنے رب سے لو لگائے ہوئے اپنے تمام اعزہ و اقربا سے دور اور بہت دور ہے۔ مدعی اور منازع کے بغیر اُس پر فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے۔ اس کا قصور صرف ارکان اور اسلام پر مضبوطی سے قائم رہنا اور علما اعلام میں شمار ہونا ہے۔ اس سے ان ظالموں کا مقصد نشان درس و تدریس کو مٹانا اور علم کے جھنڈے کو نیچے گرانا ہے۔ وہ صفحۂ قرطاس سے بھی نام و نشان مٹانا چاہتے ہیں۔[26]

فضل حق انگریزوں کے جبر و استبداد اور مظالم کے علاوہ مسلمانوں اور دیگر ہندوستانیوں کے تبدیل مذہب کی کوششوں کو 1857 کی بغاوت کا سبب بتلاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کا کوئی دوست نہیں ہے اس لیے وہ سر اٹھانے کی ہمت نہیں کریں گے اور مطیع و فرمانبردار رہیں گے۔ یہ سب اس نظریے سے وہ کر رہے تھے کہ تمام ہندوستانی ان کی طرح ملحد ہو جائیں اور ایک امت ہو جائیں۔ انگریزوں کی یہ کوشش سیاسی مفادات کے لیے تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ حاکم اور محکوم اگر مختلف مذاہب کے رہے تو ملک پر حکومت کرنا دشوار ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہوگا۔ اس لیے انھوں نے مختلف بہانوں سے ہندوستانیوں کے مذاہب کو برباد کرنے کی کوشش کی۔ جیسے انھوں نے بچوں اور ناخواندہ لوگوں کی تعلیم گاؤں اور شہروں میں اپنے اسکول قائم کر کے اپنی زبان میں دینا شروع کیا اور اپنے مذہب کی بھی تبلیغ کرنی شروع کی۔ انھوں نے قدیم علوم اور علمی مراکز کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی تا کہ قدیم علوم و سائنس کی تعلیمات ختم ہو جائیں۔ اس سلسلے میں فضل حق ہی واحد شخص نہیں تھے جو انگریزوں کی اس تحریک کا پردہ چاک کرنے میں پیش پیش تھے۔ 1857 میں جاری کردہ تقریباً تمام اعلانوں میں جیسے بہادر شاہ ظفر، نانا صاحب، خان بہادر خاں، برجیس قدر، شاہ زادہ فیروز شاہ، رانی لکشمی بائی وغیرہ نے اسی طرح کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔[27] سرسید احمد خاں نے بغاوت کے اسباب میں ایک سبب عیسائیوں کی سرگرمی بتلایا ہے جس نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف کر دیا تھا۔[28]

مولانا فضل حق انڈمان میں قیدیوں کے حال زار کا بیان کرتے ہیں کہ ان کو ان کے

اپنے لباس سے محروم کردیا جاتا تھا اور ان کو موٹے کھردرے لباس پہننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا اس سے انھیں بڑا صدمہ پہنچا تھا۔[29] وہ جب جزیرہ انڈمان لائے گئے تو انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا رہا۔ انھیں بھی ان کے لباس اور جوتوں سے محروم کر دیا گیا اور موٹا کھردرا لبادہ پہنا دیا گیا اور سونے کے لیے سخت اور بے حد تکلیف دہ بستر دیا گیا۔[30] انگریزی حکام نے ان کے پاس کوئی پیالہ اور لوٹا بھی نہیں رہنے دیا اور جنگل سے انھیں ماش کی دال کھانے اور گرم پانی پینے پر مجبور کیا۔[31] مولانا فضل حق مزید لکھتے ہیں: "پھر ترش رو دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گذار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنھیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی زہر سے زیادہ ضرر رساں، اس کا آسماں غموں کی بارش کرنے والا، اس کا بادل رنج وغم برسانے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ میری آنکھوں کی طرح ان کی چھتیں ٹپکتی رہتی تھیں۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔ مرض سستا اور دوا گراں، بیماریاں بے شمار، خارش و قوبا عام تھی۔ بیمار کے علاج تندرست کی بقا، صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔ معالج مرض میں اضافہ کرنے والا اور معالج ہلاک ہونے والا، طبیب رنج و تکلیف بڑھانے والا تھا۔ رنجیدہ کی نہ غمخواری ہی کی جاتی نہ اس پر رنج و افسوس کا اظہار ہوتا۔ دنیا کی کوئی مصیبت یہاں کی المناک مصیبتوں پر قیاس نہیں کی جاسکتی۔ یہاں کی معمولی بیماری بھی خطرناک ہے۔ بخار موت کا پیغام، مرض سرسام اور برسام ہلاکت کی علت تام ہے۔ نصرانی ماہر طب مریضوں کی آنتوں کو تنور کی طرح جلاتا ہے اور مریض کی حفاظت نہ کرتے ہوئے آگ کا قبہ اس کے اوپر بناتا ہے۔ مرض نہ پہچانتے ہوئے دوا پلا کر موت کے منہ کے قریب پہنچا دیتا ہے۔[32]" مولانا فضل حق نے زندوں اور مریضوں کے حال کا جو نقشہ پیش کیا ہے ممکن ہے کہ اس میں زبان کی مبالغہ آرائی ہو، تاہم جزیرہ انڈمان میں عام طور پر قیدیوں کا حال برا تھا۔ مولانا فضل حق زندوں کے بعد ان قیدیوں کا حال لکھتے ہیں جو وطن سے دور نہ صرف قید فرنگ بلکہ قید حیات سے بھی نجات پا جاتے تھے: "جب کوئی

ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس یا دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا، غسل و کفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تو دہ میں دبا دیتا ہے۔ نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے اور نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ کیسی عبرت ناک اور الم انگیز کہانی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرہ میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی۔ (33)

جزیرہ انڈمان میں آب و ہوا، قید کی مشقت، سختیوں، انگریز جیلروں کے جابرانہ اور بدسلوکانہ رویوں کی وجہ سے مولانا فضل حق کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ مختلف امراض کا شکار ہو گئے۔ وہ بھی خارش و قوبا میں مبتلا تھے۔ ان کی صبح و شام بڑی تکلیف سے گزرتی۔ بقول خود ان کے ''صبح و شام اس طرح بسر ہوتی ہے کہ تمام بدن زخموں سے چھلنی بن چکا ہے۔'' روح کو تحلیل کردینے والے درد و تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔''(34) مولانا کے آخری ایام ظاہر ہے کہ بہت تکلیف میں گذر رہے تھے نگران کی حالت زار پر کوئی توجہ کرنے والا نہ تھا۔ اسی حالت میں انھیں گندگی کا ٹوکرا بھی لے جانا ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے نیا جیلر جو علوم مشرقی میں دلچسپی رکھتا تھا اور فن ہیت کا ماہر تھا، مولانا کے علمی کمال سے آگاہ ہوا اور اپنی پیشی میں رکھ لیا۔ (40) ہندوستان میں ان کے فرزند مولوی شمس الحق ان کی رہائی کی کوشش کر رہے تھے۔ رہائی کا پروانہ لے کر انڈمان پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے والد کا انتقال اگست 1861 میں ہو چکا تھا۔ (41) اس طرح 1857 کا یہ عظیم مجاہد اور عالم دین اپنے وطن سے دور انڈمان کے دور دراز علاقہ میں آسودہ خاک ہوا۔ مولانا کی علمیت اور فضیلت کے پیش نظر غالباً ان کے جیل کے رفقا اور انڈمان میں دوسرے لوگوں نے مولانا کے مدفن کو یاد رکھا تھا اور بعد ازاں اسے قبر کی شکل دے دی گئی۔ کہا جاتا ہے اب آپ کا مزار مرجع خلائق ہے اور جمعرات کے دن وہاں خاصہ مجمع جمع ہو کر مولانا سے روحانی اکتساب حاصل کرتا ہے۔

حواشی:

1. انتظام اللہ شہابی، غدر کے چند علماء، دہلی، ص-33، (آئندہ بحوالہ شہابی)
2. شہابی، ص-33۔
3 ایضاً، مولانا مصطفیٰ علی کرپاسوی، تاریخ انساب، ص-1، شاہد شیروانی، باغی ہندوستان (ترجمہ الثورۃ الہندیہ) بجنور 1947، ص-11، (آئندہ بحوالہ شیروانی)
4. شیروانی، ص-11
5. حکیم محمود احمد برکاتی، فضل حق خیرآبادی اور سن ستاون، کراچی 1975، صفحات 21-22، (آئندہ بحوالہ برکاتی)
6. برکاتی، ص-22-23
6 برکاتی، ص-24، (حاشیہ فارسی متن دیکھیے برکاتی ضمیمہ صفحات 91 تا 94)
7. شہابی، ص38
8. عجیب ہے کہ اس واقعہ کا ذکر فضل حق کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے بائیوگرافر۔ طلسم نمبر-21، مورخہ 12 دسمبر 1856 کی خبر بہت واضح ہے۔
9. غلام رسول مہر، 1857ء کے مجاہد، لاہور 1957، صفحہ-131 (آئندہ بحوالہ مہر)
10. چارلس مٹکاف، ٹو نیٹو نیریٹوز آف میوٹنی ان دہلی، لندن 1897، ص-202، جاسوسوں کے خطوط، نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، ص-97
11. جیون لال، روزنامچہ، ترجمہ مٹکاف، ص-196، عبداللطیف، 1857ء کا تاریخی روزنامچہ، مرتبہ خلیق احمد نظامی، دہلی 1958ء، ص-162
12. جیون لال، ص-198
13. جیون لال، ص-198
14. جیون لال، 198
15. جیون لال، ص-196، جاسوسوں کے خطوط، ص-89
16. ذکاء اللہ، تاریخ عروج سلطنت انگلیشیہ، ص 676
17. تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، ص-676
18. ملاحظہ ہو، پروسیڈنگ آف انڈین ہسٹری کانگریس 1985، دی فائٹ فور فریڈم (ایڈیٹ) روی دیال، نئی دہلی 1995، صفحات 20-21
19 باغی ہندوستان، ص-158 حاشیہ
20. فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، ص 149
21. برکاتی، ص-64
22. باغی ہندوستان، ص ص 173-74
23. باغی ہندوستان (تیسرا ایڈیشن لاہور 1978) ص، 251، اس کے بعد باغی ہندوستان کے حوالے لاہور ایڈیشن سے دیے گئے ہیں۔
24. باغی ہندوستان، ص 252

25. ایضاً، ص 252
26. باغی ہندوستان، صفحات 257-255
27. رضوی اور بھارگو، فریڈم اسٹرگل ان یو۔ پی، جلد اول، لکھنؤ، صفحات 438, 439, 442, 444, 448-449
28. الطاف حسین حالی، حیات جاوید، لاہور 1967، صفحات 892, 897
29. تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، اقبال حسین، فضل حق خیرآبادی اے اسکالر ریبل آف 1857، پروسیڈنگز، انڈین ہسٹری کانگریس، گوا 1987، صفحات 355-365
30. باغی ہندوستان، ص 253
31. باغی ہندوستان، ص 291
32. باغی ہندوستان، صفحات 291-292
33. ایضاً، صفحات 392-393
34. ایضاً، صفحات 293-294
40. شہابی، ص-44
41. شہابی، ص-44، مہر، ص 136-137

اقبال حسین

خان بہادر خاں

1857 کی پہلی جنگ آزادی میں خان بہادر خاں نے انگریزی حکومت کے خلاف روہیلکھنڈ میں قیادت سنبھالی تھی۔ آپ کی قیادت میں بریلی اور نواح کے علاقوں میں آزاد حکومت قائم کی گئی تھی جسے بہادر شاہ ظفر نے بھی تسلیم کیا تھا۔

خان بہادر خاں، حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ (وفات 1774) کے اخلاف میں تھے۔ آپ کمپنی کے دور حکومت میں صدر امین کے عہدہ پر بھی فائز رہ چکے تھے۔ اس کے علاوہ حافظ رحمت خاں کے براہ راست وارث ہونے کے ناطے سے وظیفہ بھی پا رہے تھے اور کمپنی کے ملازم ہونے کی وجہ سے پنشن بھی۔ اس طرح ان کو دوہری پنشن مل رہی تھی۔[1]

خان بہادر خان کی ابتدائی زندگی کے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت رواج کے تحت عربی، فارسی اور اسلامی علوم میں ہوئی۔ آپ کمپنی کی ملازمت میں آئے اور صدر امین کے عہدہ تک پہنچے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بریلی میں اقامت اختیار کی۔ بریلی کے عوام میں ہر دل عزیز تھے اور بالعموم لوگ آپ کو حافظ رحمت خاں کا پوتا ہونے کی وجہ سے بہت عزت و احترام سے دیکھتے تھے۔ 1857 میں جب جنگ آزادی کی ابتدا ہوئی، آپ 82 سال کے تھے۔[2]

1857 کی جنگ آزادی کے دوران بریلی، خان بہادر خاں کی قیادت میں مجاہدین آزادی کا مرکز بن گیا تھا۔ اس دوران بہت سے اہم اور نامی قائدین آزادی بریلی آئے اور خان

بہادر خاں سے جنگ جاری رکھنے کے لیے صلاح و مشورے کیے۔[3] خان بہادر خاں اور ان کے اجداد کے غیر جانبدارانہ اور منصفانہ رویہ کی وجہ سے بریلی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نمونہ بنا رہا گو کہ کمپنی کے اعلیٰ حکام نے برابر اس کی کوشش کی اور راجپوتوں کو رشوت کا لالچ بھی دیا۔[4] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب جنگ آزادی کے تمام مراکز پر انگریزوں نے دوبارہ قبضہ کرلیا تب آخر میں (مئی 1858) بریلی پر وہ قبضہ کر سکے لیکن اس کے لیے بھی ان کو سخت مقابلہ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

بریلی اور اس کے گرد و نواح میں روہیلہ افغانوں کی بڑی اور پھیلی آبادیاں تھیں۔[5] ان روہیلہ افغانوں نے اٹھارھویں صدی میں کٹیہر کے حکمراں راجپوتوں سے اقتدار حاصل کیا تھا۔ یہ عام طور پر مشہور تھا کہ اپنے دور حکومت میں انھوں نے صاف ستھرا انتظامیہ اور غیر جانبدارانہ رویہ عوام سے رکھا تھا۔[6] کٹیہر یا راجپوتوں کی جگہ، جن کے بیشتر علاقوں پر روہیلہ افغان قابض ہوئے تھے، افغانوں نے دوسرے راجپوت گھرانوں جیسے گور اور جھنگاراؤں کو گوجروں کے ساتھ زیادہ مراعات دیں۔[7] روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ 1774 میں وارن ہسٹنگز اور شجاع الدولہ، اودھ کے نواب کی سازباز سے ہوا۔ روہیلکھنڈ جیسا کہ بریلی کے علاقوں کو کہا جانے لگا تھا پہلے اودھ کے قبضے میں آیا اور بعد ازاں 1801 میں کمپنی نے اپنا اقتدار جمایا۔ روہیلہ افغانوں میں ان حکمرانوں کے خلاف ایک فطری نفرت کا جذبہ موجود تھا کیونکہ وہ ان کو غاصب سمجھتے تھے۔ ان کے جذبات اور برانگیختہ ہوئے جب کمپنی کی حکومت نے نئے مالی نظام کو رائج کیا۔ 1802 میں بریلی اور مرادآباد کے اضلاع میں 46 لاکھ کی لگان تھی۔ ان میں سے 42 لاکھ روپے کی لگان پندرہ لگان کے ٹھیکہ داران کے ہاتھ میں تھی جن میں دو پرگنہ زمینداران بھی شامل تھے۔[8] یہ طریقہ کار بدل دیا گیا اور نئے نظام کے تحت بھاری ٹیکس نافذ کر دیے گئے اس کا مظہر محلواری طریقہ نظام مال گذاری ہے۔[9]

نئے مالگذاری نظام کے تحت قدیم زمیندار گھرانوں پر کس طرح تباہ کیا گیا اس کے متعلق ای آئی. براڈکن نے اپنے ایک مختصر مطالعہ میں جائزہ لیا ہے۔[9] امتیاز حسین نے بھی اپنے مطالعے میں یہ بتلایا ہے کہ کمپنی کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد قدیم زمینداران، اجارہ داران

بہت بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ [10] کمپنی کی حکومت میں زمین ایک خرید وفروخت کی شے ہوگئی جو سرمایہ دارانہ تصور جائداد کے مطابق تھا۔ [11] بہر حال، امر واقعہ یہ تھا کہ ٹیکس کے بوجھ کی وجہ سے اس تبدیلی نے زمین کی کوئی مارکیٹ نہیں پیدا کی۔ زمینوں کا تبادلہ خاص طور سے جبری زمین کی فروختگی بعلت بقایا اور عدم ادائیگی لگان اور نچلے درجے کے محکمہ مال کے اہلکاروں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ [12] اس طرح کے تبادلوں نے زمین کی ملکیت کا رنگ ہی بدل دیا۔ براڈ کن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ساتویں بندوبست (42-1836) کے دوران تقریباً ایک تہائی حصہ زمین پر مالکانہ حقوق کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ [13] سود پر روپیہ چلانے والے روائتی زمینداران بالخصوص راجپوتوں کی زمینوں پر قابض ہوتے گئے۔ یہ صورتحال روہیلوں کے دور حکومت میں نہیں تھی کیونکہ زمینداران اور اجارہ داران ورعیت کے مفاد کی پوری طرح حفاظت کی جاتی تھی۔ [14] زمینوں کے تبادلوں کی بنیادی وجہ ضرورت سے زیادہ لگان اور ٹیکسز تھے۔ اجارہ داران اور زمینداران کے علاوہ رعیت بھی نئی حکومت کی زرعی پالیسیوں سے بیزار ہو چکی تھی۔ اس بیزاری کا مظاہرہ 1816 میں چوکیداری ٹیکس کے خلاف عوام نے کیا۔ حکومت نے اس بغاوت کو سختی اور دھوکہ سے کچل دیا تھا تاہم جس طرح بریلی میں گردونواح سے عوام حکومت کے خلاف جمع ہو گئے تھے وہ ان کے غم وغصہ کو ظاہر کرتا ہے۔ [15] عوام کے دلوں میں حکومت کے خلاف بے اطمینانی اور غم وغصہ کی آگ آہستہ آہستہ پھیلتی رہی۔ زمینداران اور اجارہ داران زمینوں کی زبردستی خرید وفروخت کی وجہ سے پریشان اور عدم تحفظ کا شکار تھے۔ ایڈورڈز، ضلع کلکٹر بدایوں (8-1857) صورت حال کی تفصیل یوں دیتا ہے۔

”گذشتہ بارہ اور پندرہ برسوں میں اس طرح کی فروختگی اور ہمارے مالی نظام کی کارکردگی، جس کی وجہ سے ملک کے عوام تباہ ہو گئے اور جس نے گاؤں کا نقشہ بدل دیا۔ میں اس ضلع اور پڑوس کے اضلاع میں ہونے والی اتھل پتھل کو واحد وجہ سمجھتا ہوں۔ دھوکہ دھڑی کر کے بہت سے زمیندار خاندانوں کو ہم سے جزوی یا کلی طور پر الگ کر دیا گیا اور ان کی زمینوں کو زیادہ تر تاجروں یا سرکاری ملازمین نے حاصل کر لیا جن کا نہ کوئی کردار ہے اور نہ ہی عوام پر اثر۔ یہ لوگ

بیشتر غیر موجود ہوتے کیونکہ ان کو اپنی نئی خرید کردہ جائیدادوں پر رہنا غیر محفوظ معلوم ہوتا تھا اور ان کو اندازہ تھا کہ عوام ان کو زبردستی کا شریک اور بے جا خلل انداز ہونے والا سمجھتے تھے۔ قدیم مالکان زمین جو بے دخل کیے جا چکے ہیں تاہم اپنی وراثتی پکڑ، ہمدردی اور محبت بڑی حد تک ان کو رعیت سے حاصل ہے جو ان کی کھوئی ہوئی جائداد کو دوبارہ حاصل کرنے میں ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔"[16]

ایک قدیم خاندان کی بربادی کی مثال ہمیں راجہ شیش گڑھ جو ایک کٹھیر یا راجپوت سے ملتی ہے۔ راجہ نے اپنی جائیداد پر اپنا قبضہ سسوان، ضلع بریلی میں روہیلوں اور اودھ حکمرانوں کے دور میں بنائے رکھا تھا۔ کمپنی کے دور حکومت میں بقایا کی علت میں اسے اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بہت سے مواضعات کو مقدمان کو اجارہ پر دے دیا گیا جو 1850 میں اس کے مالکان تسلیم کر لیے گئے۔[17] یہی حالت روہیلکھنڈ کے دوسرے علاقوں کی بھی تھی۔[18] 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے دوران مجاہدین آزادی کی پہلی فکر یہ تھی کہ مواضعات کے سروے (جائزہ) کاغذات کو برباد کر دیا جائے جن میں مواضعات کے مالکانہ حقوق اور مدت وغیرہ درج تھیں۔[19]

بریلی کی بغاوت اسی لیے صرف ایک مذہبی جنگ نہیں تھی جیسا کہ خان بہادر خاں کے اعلانیہ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کے پس پشت ان لوگوں کی تلخیاں اور فکر تھی جو اپنے مالکانہ حقوق اور جائیدادوں سے محروم ہو گئے تھے اور ان لوگوں کی تشویش بھی تھی جو اپنی زمینوں اور جائیدادوں کو کھو جانے کے ڈر میں مبتلا تھے۔

II

بریلی میں بغاوت کی ابتدا سے تقریباً دو ماہ قبل ہی بغاوت ہونے کی افواہیں پھیل رہی تھیں۔[20] انگریزوں نے افواہوں کے پیش نظر احتیاطاً اپنے اہل وعیال کو نینی تال منتقل کر دیا تھا۔[21] بریلی میں ہندو اور مسلمان کمپنی کی پالیسی سے بدظن تھے اور خوف زدہ تھے کہ ان کو عیسائی بنا دیا جائے گا۔ کمپنی کے اہلکاران نے حالات کی سنگینی بھانپتے ہوئے 22 مئی 1857 کو بریلی کالج کے ایک مسلمان معلم کی خدمات حاصل کر کے یہ پروپیگنڈہ کرانا شروع کیا کہ کمپنی کی

حکومت کے خلاف کوئی بھی بغاوت غیر شرعی ہوگی۔[22] اس کے علاوہ کمپنی کے اہلکاران نے کوئی خاص احتیاطی تدبیر نہیں کی باوجود یکہ 1816 کی چوکیداری ٹیکس کے خلاف بغاوت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ بریلی میں اٹھارھویں پیدل فوج اور آٹھویں گھوڑسوار فوج متعین تھی۔ آٹھویں گھوڑسوار فوج میں اکثریت پٹھان فوجیوں کی تھی۔[23] بریلی میں کوئی یورپین فوج نہیں تھی۔[24] علاوہ ازیں بریلی میں توپ خانہ کی ایک شاخ موجود تھی جس کی سربراہی صوبہ دار بخت خاں[25] جو مولوی سرفراز علی[26] کے مرید تھے، کررہے تھے۔ مولوی سرفراز علی نے 1857 کی جنگ آزادی میں نمایاں کردار انجام دیا تھا اور بہت سے علا کو دہلی میں جمع کر کے انگریزوں کے خلاف جہاد کا نعرہ دیا تھا۔

بریلی میں بغاوت کی ابتدا ہوتے ہی مجاہدین آزادی نے خان بہادر خاں سے قیادت سنبھالنے کی درخواست کی لیکن ابتدا میں وہ اس کے لیے تیار نہ تھے غالباً اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزی کمپنی کے کمشنر الیگزینڈر شیکسپیئر نے بغاوت شروع ہونے سے دو روز قبل خان بہادر خاں سے بریلی ضلع کا انتظامیہ سنبھالنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن انھوں نے انکار کر دیا تھا۔[27] شیکسپیئر کی خان بہادر خاں پر نظر انتخاب ان کے خاندانی پس منظر اور کمپنی کے لیے وفادارانہ خدمات کی وجہ تھی۔ خان بہادر خاں کو مجاہدین آزادی نے قیادت کے لیے کس طرح آمادہ کیا تھا وہ خان بہادر کے مراسلہ بنام گورنر جنرل مورخہ 14 فروری 1860 سے معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے بتلایا کہ بریلی میں امن وامان کی بگڑتی صورت حال کے پیش نظر ان کے پاس شہریوں کا ایک وفد سید میاں جان، سید فیض اللہ، میرن خاں اور دیگر افراد کی قیادت میں جن میں تاجر بھی شامل تھے، ان سے ملا اور امن وامان کی بحالی کی درخواست کی۔ آخر میں سید میرن جان نے ان کو راضی کر لیا کہ وہ اپنے گھر سے باہر نکلیں۔[28] بالآخر 31 مئی 1857 کو یعنی میرٹھ میں بغاوت شروع ہونے کے 21 دن بعد، بریلی میں انگریزی حکومت کے خلاف عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ درگا داس بندوپادھیائے، جو کمپنی حکومت کی گھوڑسوار فوج متعینہ بریلی میں کلرک تھا، دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ فوجیوں نے بخت خاں کو اپنا کمانڈر مقرر کیا اور محمد شفیع جو گھوڑ

سوار فوج میں تھا وہ بھی مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گیا۔ مجاہدین آزادی نے دس لاکھ روپے کا خزانہ جو غالباً انھوں نے کلکٹریٹ کے خزانہ کو لوٹ کر جمع کیا تھا، بہادر خاں کے حوالہ کیا۔[29]

درگا داس کی تحریر سے اس کی بخت خاں کے خلاف عصبیت صاف طور پر نظر آتی ہے۔ اسے بخت خاں کی صاف گوئی اور اکھڑپن ناپسند تھا۔[30] بخت خاں نے بریلی میں مجاہدین آزادی کے ساتھ ہونے کے بعد اسے جو نئی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شہر بریلی اور اطراف کے عمائدین، اور اہلکاران جن میں درگا داس بھی شامل تھا، کی میٹنگ بلائی اور مہذبانہ طور پر ان کی تکلیف پر معافی مانگی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ درگا داس دعویٰ کرتا ہے کہ بخت خاں نے اسے نئی قائم کردہ حکومت میں بہادر شاہ کی حکومت کے قیام کے بعد وزیر کا عہدہ پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔[31]

درگا داس کا بریلی کے متعلق احوال عدم یکسانیت کا مظہر ہے۔ ایک جگہ وہ انگریزوں کے قتل کے لیے خان بہادر خاں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے جس کی وجہ سے بریلی میں بدامنی اور بدنظمی پیدا ہوئی لیکن وہ خود نواب بن بیٹھا۔[32] لیکن ایک دوسری جگہ وہ مبارک علی خاں اور مدار علی خاں کی کوششوں سے خان بہادر خاں کو 31 تاریخ کو بریلی کی قیادت کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔[33] برخلاف اس کے دوسرے ذرائع بتلاتے ہیں کہ یکم جون 1857 کو بخت خاں کی قیادت میں خان بہادر خاں کو قیادت کے لیے آمادہ کیا گیا تھا۔ بخت خاں کے ساتھ سوبھا رام، مدار علی خاں، سید میاں جان، سید فیض اللہ اور دوسرے حضرات بھی خان بہادر خاں سے ملے تھے۔ خان بہادر خاں نے اپنی پیری کا اور مالی وسائل کی کمی کا عذر پیش کرتے ہوئے قیادت سے انکار کیا تھا لیکن سوبھا رام، مبارک شاہ اور احمد شاہ نے خزانہ کے لیے مالی وسائل مہیا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر بھی خان بہادر خاں تیار نہ تھے۔ بالآخر بخت خاں نے صاف طور پر کہا کہ اگر وہ قیادت قبول نہیں کریں گے تو مجاہدین آزادی چودھری بسنت رام[34] کو اپنا قائد بنا لیں گے۔

خان بہادر خاں نے قیادت قبول کرنے کے بعد شہر کا دورہ کیا تاکہ امن وامان بحال ہو جائے۔[35] انھوں نے شرپسندوں اور بدامنی پھیلانے والوں کے خلاف سخت اقدامات کیے

جس کے لیے بعد میں اسٹلکنسن ان پر سخت گیری اور بے رحمانہ کارروائی کا الزام لگاتا ہے، انھوں نے ایک دربار بھی منعقد کیا جس میں ضلع کے مقتدر ہندو اور مسلمان موجود تھے۔[36]

دیگر باغی قائدین کی طرح خان بہادر خاں نے بھی تمام راجاؤں اور دوسرے افراد کے نام ایک اعلانیہ جاری کیا تھا جس میں تمام لوگوں سے اپنے مذہب کے تحفظ کی اپیل کی گئی تھی۔ اس اعلانیہ میں اس امر پر خاص زور دیا گیا تھا کہ ہندوستانی مذاہب ہندوازم اور اسلام، کمپنی بہادر کی عیسائی نواز پالیسی کی وجہ سے خطرہ میں تھے۔[38] بریلی کا یہ اعلانیہ واضح طور پر راجپوتوں کی ہمدردی اور مدد کے لیے جاری کیا گیا تھا کیونکہ اس کے ذریعہ کمپنی بہادر کی حکومت پر تنقید کی گئی تھی کہ وہ ستی کی رسم جو عام طور سے راجپوتوں میں رائج تھی، مخالفت کر رہی تھی اور بیواؤں کی شادی کو ہوا دے رہی تھی۔ اعلانیہ میں انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں کے خلاف بھی تحریک تھی کہ وے انگریزوں کے لیے لوگوں کو عیسائی بنانے میں مددگار تھے۔ اس الزام کی وجہ سے ان کو بریلی سے باہر نکال دیا گیا تھا۔[39] بریلی میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لیے خان بہادر خاں نے اپنے اس اعلانیہ کے ذریعہ گاؤکشی پر پابندی عائد کردی تھی۔ اعلانیہ کے آخری حصہ میں انگریزوں کے مکارانہ اور پُر فریب وعدوں کے خلاف عوام کو آگاہ کیا گیا ہے: "تم ہمارے شریک ہو کر ان کو مارو تو عقل مند لوگ اس پُر فریب کو ہرگز نہ مانیں گے کیونکہ قول و قرار انگریزوں کا محض فریب اور مطلب کا ہے۔ مطلب اپنا کر عہد شکنی کریں گے کیونکہ ہمیشہ سے ان کی عادت فریب کی ہے اور ہندوستانیوں سے ہمیشہ فریب کرتے آئے ہیں۔"[40]

خان بہادر خاں کے سامنے ایک دوسرا اہم مسئلہ انتظامیہ کو اس طرح منظم کرنا تھا جو بریلی میں سب کے لیے قابل قبول ہو۔ اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ہوئی اور خان بہادر خاں کو اس سلسلے میں مکمل اختیارات دیے گئے۔[41] بدقسمتی سے بریلی میں ایسے افراد بھی تھے جو نئی قائم شدہ حکومت کے خلاف ساز باز میں مصروف تھے۔ درگاداس ان کے نام بتلاتا ہے جن میں بیج ناتھ مشر، ایک دولتمند شخص، رائے چیت رام، الطاف علی خاں، لکھی نارائن اور حکیم شہادت علی خاں شامل تھے۔ انگریزوں نے بریلی پر دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے بعد بیج ناتھ مشر کو اس کی خدمات کے عوض انعام

وا کرام سے نوازا اور وہ بریلی کے بڑے زمینداروں میں سے ایک زمیندار بن گیا تھا۔[42] خاں بہادر خاں نے اپنی حکومت کے نئے انتظامیہ میں شوبھا رام کو اپنا دیوان مقرر کیا۔[43] مدار علی اور نیاز علی کو فوج کا کمانڈر مقرر کر کے ان کی ماہانہ تنخواہ ایک ہزار روپیہ مقرر کی گئی۔[44] برج لال کو شوبھا رام کا نائب مقرر کیا گیا۔[45] دیوان کے دفتر میں ہندو عملے کی تعداد غالب تھی یعنی 16 افراد میں 13 ہندو تھے اسی طرح دارالانشا، جس کی سربراہی فیض علی کر رہے تھے 15 کارکنوں میں دس مسلمان تھے اور 5 ہندو۔ پنڈت لوک ناتھ، ایک مقامی زمیندار کو جج مقرر کیا گیا تا کہ وہ ہندوؤں کے مقدمات کو شاستروں کی روشنی میں طے کریں اور شہر سے اسی کے تحت ٹیکس کی وصولی کریں۔[46] خوشی رام کو بریلی کا ناظم مقرر کیا گیا تھا لیکن وہ فرائض منصبی کی ادائگی میں غفلت کے سبب دو ماہ بعد برخاست کر دیا گیا۔ شوبھا رام کے فرزند ہری لال کو ایک ہزار روپے ماہانہ کی بڑی تنخواہ پر پوسٹ ماسٹر مقرر کیا گیا۔ سیف اللہ خاں کو پانچ سو روپے ماہانہ کی تنخواہ پر داروغہ جیل بنایا گیا۔ خان بہادر خاں نے مالی حالت کو سدھارنے اور خالی خزانہ کو بھرنے کے لیے اقدام کیے۔ ایک کمیٹی مقرر کی گئی تا کہ مقررہ جاری لگان ایک بناوس کی تحصیل کر سکے۔ اس کے علاوہ کانشی رام کو ہدایت دی کہ وہ ایک لاکھ اور ستر ہزار روپے مہاجنوں سے قرض لیں۔ اس طرح سے کل 82 ہزار روپیوں کی وصولی ہوئی۔[47] دل چسپ بات یہ ہے کہ خاں بہادر خاں کا انتظامیہ مغل اور انگریزی حکومتوں کا ملغوبہ تھا۔ انھوں نے کمپنی کے قائم کردہ مجسٹریٹوں کے عہدہ کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ ایک عدالت جس پر مفتی کا تقرر ہوا اور ایک اپیل عدالت بھی قائم کی گئی۔ محکمہ سراغ رسانی کے حکام اور بخشی کے علاوہ دوسرے بھی ضروری شعبہ جات قائم کیے گئے تھے۔[48]

بریلی کے انتظامیہ کے بعد خان بہادر خاں نے قریبی ضلع بدایوں کے نظم ونسق کی طرف توجہ دی۔ عبدالرحمٰن خاں کو وہاں کا ناظم اور شیخ فصاحت اللہ کو ان کا نائب مقرر کیا۔[49] نئے ناظم نے پرانے ملازمین کو ان کی جگہوں پر برقرار رکھا تا کہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی بدستور کرتے رہیں۔ نئے ناظم نے امن دامان قائم رکھنے کی طرف بھی توجہ کی۔ ان نئی تقرریوں کے خلاف شیخ پور کے راجپوتوں نے ناراضگی ظاہر کی۔[50] ناظم نے نئے انتظامیہ کو اور مستحکم کرنے کے لیے دو

سبکدوش تحصیلداروں کو بطور ڈپٹی کلکٹر مقرر کیا۔ آہستہ آہستہ نئے انتظامیہ نے سہسوان، گنور اور دوسرے علاقوں تک اپنے عملہ کو مقرر کیا۔[51] نومبر 1857 تک پورا ضلع بدایوں خان بہادر خاں کی باغی حکومت کے تحت آ چکا تھا۔[52] خان بہادر خاں کی حکومت کو مزید استحکام بہادر شاہ ظفر کے فرمان سے ملا جس میں بادشاہ نے ان کی نئی حکومت کو بریلی بدایوں اور شاہ جہاں پور میں تسلیم کیا۔[53]
خان بہادر خاں نے اپنی حکومت کے اہلکاران کو جیسے سابق ڈپٹی کلکٹر، غلام قادر خاں کو ناظم، نظام علی خاں ایک ریٹائرڈ کوتوال اور حامد حسن خاں سابق ڈپٹی کلکٹر کو شاہ جہاں پور کے نائب ناظم کے عہدہ پر پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پر مقرر کیا۔ عبدالرؤف خاں کو کمانڈر، چار سو روپے ماہانہ اور سیتا سنگھ کو دو سو روپے ماہانہ پر دیوان کے عہدہ پر مقرر کیا۔ اس طرح خان بہادر خاں نے نئی آزاد حکومت قرب و جوار کے اضلاع میں قائم کر دی۔[54]

خان بہادر خاں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور ہر دل عزیزی نے نواب رام پور کو چوکنا کر دیا جو 1857 کی جنگ آزادی میں دوہرا کردار انجام دے رہے تھے۔[55] ایک طرف وہ کمپنی بہادر کے اہلکاران کو خوش رکھ رہے تھے تو دوسری طرف خان بہادر خاں سے اپنے مراسلوں میں یگانگت کی باتیں کر رہے تھے کمپنی بہادر کے افسران بھی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر نواب رام پور کی وفاداری کی تعریف و توصیف کرتے رہے جب کہ روہیلکھنڈ میں آزاد حکومت کا قیام ہو چکا تھا۔[56] دریں اثنا شہزادہ فیروز شاہ نے مراد آباد پر قبضہ کر لیا جو نواب رام پور، کمپنی بہادر کی جگہ پر دیکھ رہے تھے۔ تھوڑے دنوں کے بعد نانا صاحب بریلی میں آئے اور رام پور پر حملہ کا منصوبہ بنایا۔[58] ان خبروں نے نواب رام پور کو چونکا دیا تھا کیونکہ وہ خود بھی خان بہادر خاں کے خلاف فوجی کارروائی کرنے والا تھا۔ خان بہادر خاں، نواب رام پور، کے ارادوں سے باخبر تھے، لیکن وہ آپس میں جنگ نہیں پسند کرتے تھے۔ انھوں نے ایک مصلحت آمیز خط نواب رام پور کو لکھا کہ وہ کسی قسم کے جارحانہ قدم کا ارادہ نہیں رکھتے۔[57] بہر حال حالات اور واقعات کے پیش نظر، نواب رام پور نے اب کھل کر کمپنی کا ساتھ دینے میں اپنی بہتری سمجھی۔

خان بہادر خاں نے اپنی فوج کی تنظیم کی طرف توجہ دی جو بڑھ کر 4,616، گھڑ سوار،

24,300 پیدل اور 40 اتواپ پر مشتمل تھی۔[58] فوج کو باقاعدگی کے ساتھ گھڑ سوار پیدل میں تقسیم کر کے ان کے منصب اور تنخواہیں حسب ذیل مقرر کی گئیں۔

گھڑ سوار فوج

	اوسط تنخواہ	کیفیت
1. رسالدار	مختلف تنخواہیں	پچاس روپے ماہانہ سے زائد
2. نائب رسالدار	پچاس روپے ماہانہ	
3. وکیل	تیس روپے ماہانہ	
4. نشان بردار	پچیس روپے ماہانہ	
5. سوار	بیس روپے ماہانہ	

پیدل

1. سپاہی	چھ روپے ماہانہ
2. کمیدان	سو روپے ماہانہ
3. الوس دار	پچاس روپے ماہانہ
تمن دار	پینتیس روپے ماہانہ
بخشی	تیس روپے ماہانہ
وکیل	آٹھ روپے ماہانہ

پیدل فوج کو تقریباً اسی طرح منظم کیا گیا جس طرح سو سال پہلے علی محمد خاں روہیلہ نے کیا تھا۔[59] اسے مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔[60]

(i) دستہ 10 سپاہیوں پر مشتمل
(ii) تمن 100 سپاہیوں پر مشتمل
(iii) الوس 500 سپاہیوں پر مشتمل
(iv) پلٹن 1000 سپاہیوں پر مشتمل

ہر ایک دستہ پر ایک جمعدار مقرر تھا جسے دس روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہر تمن پر ایک

تمندار مقرر تھا۔ جس کی تنخواہ 35 روپے ماہانہ تھی اور اس کے نائب کو پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ الوس پر ایک الوسدار مقرر ہوا تھا جس کی ماہانہ تنخواہ پچاس روپے مقرر کی تھی۔ [61] تنخواہیں وقت پر ادا کی جاتی تھیں۔

دیوان شوبھارام کو فوج کو منظم کرنے کا پورا اختیار دیا گیا تھا۔ اس نے فوج کی پریڈ اور ڈسپلن میں ذاتی دلچسپی لی۔ اس نے توپ خانہ کو مضبوط کیا اور پچیس توپوں کے بنوانے کے لیے ایک لاکھ پچیس ہزار کی رقم مختص کی۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ پیدل اور گھڑسوار فوج میں جہاں تک ممکن ہو اچھے جوان رکھے جائیں اور ان کی تنخواہیں وقت پر ادا کی جائیں۔ دیوان شوبھارام نے پرانے سواروں کو ان کے کمزور گھوڑوں کی وجہ سے برخاست نہیں کیا اور ان کو اچھے گھوڑوں کے خریدنے کے لیے ہمت دلائی۔ خان بہادر خاں ایک بہترین فوج کھڑی کرنے میں بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ اس خیال سے انھیں جو پنشن کمپنی حکومت سے مل رہی تھی اگر لیتے رہیں گے تو خزانہ پر بوجھ ہوگا، پنشن لینی بند کردی۔ [62]

فوج کے دوسرے اہم عہدے تیج سنگھ راجہ مین پوری، ولی داد خاں مالاگڑھ، فرخ آباد کے نواب کو دیے گئے، جن کی کمان وہ آزادانہ طور پر کر رہے تھے۔ [63]

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شوبھارام کے عروج اور اس کے خان بہادر خاں کے مقرب و معتمد ہونے کی وجہ سے بریلی میں کچھ لوگوں بالخصوص محلّہ نومحلّہ کے بعض سیّدوں کو کبیدگی ہوئی۔ بندوپادھیا اور اٹکنسن دونوں الزام لگاتے ہیں کہ بریلی میں باغی آزاد حکومت کے قیام کے بعد سے ہی نومحلّہ کے سیدوں کو اعتراض تھا کہ کونسل میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ بالخصوص وہ شوبھا رام کے سخت مخالف تھے اور اسے حکومت سے بیدخل کرنے کے لیے یہ الزام لگا رہے تھے کہ وہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ [64] بندوپادھیائے کے بیان کے مطابق نومحلّہ کے سیدوں کے دباؤ کی وجہ سے خان بہادر نے اجازت دے دی کہ شوبھارام کے گھر کی تلاشی لی جائے جہاں اس پر انگریزوں کو چھپا کر رکھنے کا الزام تھا۔ شوبھارام کو اس قدم سے بہت صدمہ پہنچا اور اس نے انتظامیہ کا کام چھوڑ کر گوشۂ تنہائی اختیار کرلیا۔ لیکن خان بہادر خاں جن کو شوبھارام پر اعتماد تھا اسے سمجھا بجھا کر دوبارہ لائے اور اس نے حسب سابق انتظامیہ سنبھال لیا۔ [65] بعد کے واقعات

بہرحال اس قسم کے معاملات کی نفی کرتے ہیں کیونکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی متحد رہے۔ خان بہادر خاں کے انتظامیہ کو بہرحال سخت دھکا اس وقت لگا تھا جب شوبھارام کے نائب مول چند کی رشوت خوری پکڑی گئی اور اسے برخاست کرنا پڑا۔[66]

مارچ 1858 کے آخر تک خان بہادر خاں کا پورا کنٹرول بریلی اور گرد و نواح میں رہا۔ انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی سیاست نے خان بہادر کی حکومت کے سامنے گاؤکشی کے مسئلے پر نئی مصیبت کھڑی کر دی جب کہ ان کی حکومت کی طرف سے گاؤکشی پر پابندی عائد تھی۔ اس بار چند سرپھرے مسلمان گاؤکشی کے لیے مصر ہوئے۔ ہندو سپاہیوں نے اعتراض کیا۔ صورت حال کو مزید خراب ہونے سے بچانے کے لیے شہر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی میٹنگ بلائی گئی۔ یہ بڑے غم و افسوس مگر کشیدگی کے ماحول میں شروع ہوئی۔ غمزدہ خان بہادر خاں نے میٹنگ کو روک کر کہا: "یا اللہ! ایسا کیوں؟ ہندو اور مسلمان بھائیوں کے درمیان اس طرح کے خون خرابہ کے فساد کیوں؟ ہندو میرے داہنا بازو ہیں ان کی مدد کی وجہ سے آج میں اس مسند پر بیٹھا ہوں۔ سالک رام ایک پکے ہندو ہیں۔ میں نے ان کو اپنے انتظامیہ کے لیے وزیر اعلیٰ مقرر کیا ہے۔ ہیرالال، گوکل نند، برج کشور، یہ تمام اعلیٰ مرتبت برہمن لوگوں کو اونچے مناصب پر مقرر کیا گیا ہے۔ آج میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ اگر کسی مسلمان نے کسی ہندو پر کوئی ظلم کیا، یا گاؤکشی کا مرتکب ہوا تو اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔ ہندو اور مسلمان ایک ہیں۔ آج سے یہ دونوں فرقوں کا نعرہ ہونا چاہیے۔[67] ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے مسلمانوں نے محمدی علم اور ہندوؤں نے مہابیری جھنڈا بریلی میں بلند کیا اور دونوں فرقوں سے انگریزوں کے خلاف اپنے اپنے علم کے نیچے متحد ہو کر نبرد آزما ہونے کے لیے کہا۔[68] خان بہادر خاں خود شہر میں گئے اور عوام کا اعتماد بحال کیا۔ عوام نے جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے نعرہ لگایا، "ہندو اور مسلمان ایک" اور "رام و رحیم ایک"۔ انھوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کا عہد کیا۔[69]

بریلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں خان بہادر خاں کی آزاد و باغی حکومت زیادہ دنوں تک اس لیے قائم رہ سکی کیونکہ انگریزی کمپنی کے فوجی حکام منصوبہ بند طریقوں پر دوسرے

مقامات پر قائم شدہ حکومتوں کے استیصال میں لگے ہوئے تھے۔ اس دوران بریلی باغی قائدین کی پناہ گاہ بن گیا تھا جہاں دور دراز سے لوگ آ کر جمع ہو گئے تھے۔ فیروز شاہ کا 18 فروری 1858 کا جاری کردہ اعلانیہ بریلی سے جاری ہوا تھا جو اہمیت کا حامل ہے۔ جیسا کہ دیگر اعلانیوں میں زور دیا گیا تھا اسی طرح اس اعلانیہ میں بھی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی سے جنگ کو مذہبی جنگ قرار دیا گیا تھا جس کے لیے ہندو اور مسلمانوں سے متحدہ طور پر عیسائی حکمرانوں کے اخراج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس اعلانیہ کے اجرا کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ستمبر 1857 میں دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد مجاہدین آزادی کے حوصلے پست ہونے لگے تھے اس اعلانیہ میں دہلی میں مجاہدین آزادی کی شکست کا سبب عیسائیوں پر کیے گئے مظالم اور بچوں اور عورتوں کے ساتھ کیے گئے ناروا سلوک کو قرار دیا گیا تھا جو سرداروں کے احکام کے خلاف تھا۔ اس اعلانیہ میں نظم و ضبط اور اتحاد کو دشمنوں کے خلاف کامیابی کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا۔[70] اس اعلانیہ میں واضح طور پر بیگم حضرت محل اور خان بہادر خاں کی فوج سے فوجی مدد حاصل کرنے کی ممانعت کی گئی ہے تاکہ ان کی طاقت برقرار رہے۔ دوسرے اس کے ذریعے باغی قائدین کے درمیان اتحاد بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح اعلانیہ میں عام اپیل یہ کی گئی تھی:

> "تمام گریڈ کے لوگوں کو برابر کا سمجھنا چاہیے کیونکہ مذہبی معاملات میں تمام بھائی مل کر برابری کے ساتھ اپنے اپنے مذہب کا تحفظ کریں گے۔" (71) غالباً مساوات یا برابری تمام گریڈ کے لوگوں کے درمیان پر زور اس لیے دیا جانا ضروری سمجھا گیا تھا کیونکہ مجاہدین آزادی کی فوج میں نچلے طبقہ کے لوگ بھی شامل ہو چکے تھے۔ مساوات پر زور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ باغی قائدین جدید سماجی تصورات کو قبول کر رہے تھے۔

خان بہادر خاں کو یقین تھا کہ جب تک لکھنؤ انگریزوں کے چنگل سے آزاد رہے گا بریلی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔[72] ان کے اعتماد کی غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی بریلی اور اس کے گرد و پیش مجاہدین آزادی کی بڑی تعداد اپنے اپنے قائدین کے ساتھ جمع تھی۔

بریلی میں مجاہدین آزادی کی کثرت نے بہرحال قائدین کے لیے مسائل پیدا کر دیے تھے۔ گو کہ شوبھا رام نے تمام تر پیش بندیاں کر رکھی تھیں لیکن باغی فوج برائیوں سے نہیں بچ سکی۔

کاہلی بداخلاقی، شراب نوشی ان کے اندر بڑھ گئی تھی۔ [73] بریلی سے جاری ہونے والا فتح الاخبار اپنے 11 مارچ 1858ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ بہت سے آوارہ اور بدچلن لونڈے جن کو فوج کے افسران نے نوکر رکھ لیا تھا، کنٹرول سے باہر ہو رہے تھے۔ اخبار مزید لکھتا ہے کہ بعض کمانداروں کے یہاں ان کے خیموں میں رقص و سرود کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ اس طرح کی حرکتیں غالباً اس عام یقین کے تحت جاری تھیں کہ انگریزی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو چکا ہے۔ تاہم اس طرح کی حرکتوں سے اخلاقی عالم پر برا اثر پڑ رہا تھا۔ [74]

خان بہادر خاں نے انگریزی حکومت کے خاتمہ کی نشانی کے طور پر بریلی میں مغل ٹکسال کو دوبارہ جاری کیا، جو آزادی کا یقینی مظہر تھا۔ اس سے پہلے ایک ٹکسال رام پرساد کے گھر پر کام کر رہی تھی جسے خان بہادر خاں نے جاری رہنے دیا تھا۔ [75] درگا داس بندوپادھیا ٹکسال کے احیا کو تصوراتی لوٹ اور سونے و چاندی کے زیورات کا بریلی خزانہ میں جمع ہونے سے جوڑتا ہے۔ [76] وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس سے پہلے بھی زیورات اور جواہرات بڑی مقدار میں بریلی کے خزانے میں موجود تھے۔ [77] درگا داس اس طرح سے خان بہادر خاں کی ٹکسال کی سونے اور چاندی کے سکے ڈھالنے کی اہلیت کی وضاحت کرتا ہے۔ بریلی ٹکسال میں جو سکے ڈھالے گئے سکے پورے وزن کے اور خالص چاندی کے تھے۔ سکے کا چہرہ والا حصہ شاہ عالم کے سکے کی نقل تھا جو انگریز کمپنی فرخ آباد میں ڈھال چکی تھی۔ سکے کے دوسری طرف "73 سنہ جلوس مبارک اور بریلی 1274 یعنی 1858 کندہ تھا۔ یہ صاف طور پر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر 73 سنہ جلوس شاہ عالم کیوں کندہ کیا گیا تھا کیونکہ 1806 میں شاہ عالم کی وفات 47 سال کی حکومت کے بعد ہوئی تھی۔ [78]

مارچ 1858 کے پہلے ہفتے میں بریلی میں بہت سے باغی لیڈران جمع ہو گئے تھے۔ فتح الاخبار اپنی 11 مارچ 1858 کی اشاعت میں لکھتا ہے:

> "ان دنوں شہر میں لوگوں کا ایک عجب اجتماع ہے، اور ہر شخص کافروں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کو تیار ہے۔ ہزاروں ہزار لوگ ٹڈیوں کی طرح مختلف شہروں اور گاؤں سے جمع ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف سرداران اور شہزادگان ملک کے مختلف حصوں سے جیسے بنگش نواب فرخ آباد، ولی داد خاں، حیدر علی خاں، ججھر کے نواب وغیرہ

یہاں ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔ اب نانا راؤ اس شہر میں آ رہے ہیں تاکہ ہمارے نواب
(خان بہادر خاں) سے فوجی معاملات پر گفتگو کر سکیں۔(79)

باغی مجاہدین آزادی کی سرگرمیوں پر انگریز فوجی حکام نظر رکھے ہوئے تھے۔ انگریزی فوجی کمان نے آگرہ، دہلی، نینی تال اور انبالہ سے رابطہ قائم رکھا تھا اور نامہ بروں کے ذریعہ سے ان علاقوں کی بابت پوری معلومات حاصل کر رہے تھے جن پر ان کا پورا قبضہ نہیں تھا۔ برخلاف اس کے باغی مجاہدین کے پاس کوئی موثر مواصلات کا نظام موجود نہیں تھا تاہم وہ اپنے مخالفین کے خطروں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انھوں نے مختلف گھاٹوں کی حفاظت کے لیے بڑے پیمانہ پر انتظامات کیے۔(80) انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ کمپنی کے اہلکاران کو نینی تال اور دوسرے مقامات سے نکال باہر کیا جائے اس لیے انھوں نے ہلدوانی، بھموری اور بوندیہ کے علاقوں میں قبضہ کر لیا تھا۔(81) بہرحال ان کی پیش قدمی کو کرنل میکارڈ نے بھیری کے قریب روک دیا۔(82) مجاہدین آزادی کی ہارتے خان بہادر خاں کو اپنی جنگی حکمت عملی بدلنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے فوج کو حکم دیا جس کے متعلق رسل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

> Don't attempt to meet the regular columns of the infidels, because they are superior to you in discipline and, bandobast (bandobast) and have big guns, but watch their movemnets, guard all the ghauts on the rivers, intercept their communication, stop their supplies, cut up their daks and posts, and keep constantly hanging about their camps, give them no rest. (83)

کس حد تک خان بہادر خاں کے احکام کی تعمیل کی گئی، صحیح طور پر معلوم نہیں، بہرحال انگریزوں کے جاسوس اور مخبر اپنے کام میں مستعدی سے لگے ہوئے تھے۔ ان کی اطلاع پر انگریزی ایجنٹوں نے 24 مارچ 1858 کو توپ خانہ کے بارود خانہ میں آگ لگا دی۔ 63 افراد جاں بحق ہو گئے۔(84) بریلی اور اطراف کے اضلاع میں بھی مجاہدین آزادی کی حالت دن بہ دن کمزور ہوتی جاری تھی اور انگریزی فوجیں پیش قدمی کر رہی تھیں۔ نانا صاحب کان پور پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد روہیل کھنڈ آ گئے تھے اور 27 مارچ 1858 کو بریلی کے قریب پہلا

گھاٹ پران کی خان بہادر خاں سے ملاقات ہوئی تھی۔ [85] دریں اثنا انگریزی فوجیں اپنا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھیں۔ مجاہدین آزادی کو بدایوں اور شاہ جہاں پور میں ایک منظم اور طاقت ور انگریزی فوج کی وجہ سے بار بار شکست ہوئی جس کی وجہ سے وہ پست ہمت ہو گئے تھے اور ان کے اندر اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ [86] تاہم بریلی کے لوگوں نے اتحاد اور پامردی دکھلائی۔ انگریزی کمپنی کے حکام کی اس کوشش کو ناکام بنادیا جس میں انھوں نے راجپوتوں کو خان بہادر خاں کے خلاف محاذ آرا کرنا چاہا تھا۔ [87] اس پالیسی کو لارنس اور برڈس نے اگست 1857 کی ابتدا سے فروغ دینے کی کوشش کی تھی۔ [88] ہر چند کہ انگریزوں کی راجپوتوں کو اکسا کر خان بہادر خاں کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش ناکام ہوگئی تھی تاہم وصولیابی کے مسئلے پر، انگریزوں کے ورغلانے پر دتیا گنج (بدایوں) اور دوسرے علاقوں کے امیروں نے خان بہادر کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ [89] انگریزوں کی حکمت عملی کہ بریلی میں شیعہ سنی، تفرقہ بڑھے، خاں بہادر خاں کی کوششوں سے ناکام ہوئی اور دونوں فرقے اس موقع پر متحد رہے۔ [90]

انگریزی افواج نے یکے بعد دیگرے بریلی کے گرد و پیش کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مجاہدین آزادی نے خود کو چہار طرف سے گھرا پایا۔ مرادآباد اور بجنور پر انگریزوں کا 25 اپریل 1858 کو قبضہ ہوا تھا۔ [91] شاہ جہاں پور اور بدایوں پر بھی انگریزوں کا مکمل قبضہ یکم اور دوم مئی 1858 کو ہو گیا [92] 6 مئی 1806 کو کمپنی کی فوجوں نے بریگیڈیر جنرل جونس کی قیادت میں بریلی کا محاصرہ کرلیا۔ [93] خان بہادر خاں نے اپنی فوجوں کو دو صفوں میں تقسیم کیا۔ پہلی صف توپ خانہ کے تحفظ میں تھی اور دوسری صف میں غازیوں کی جماعت تھی جو بریلی کے مضافات کا تحفظ کر رہی تھی۔ انگریزوں کی فوج نے پہلی صف کو تیزی سے توڑ ڈالا۔ [94] ان کو بہر حال دوسری صف میں موجود غازیوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ غازیوں نے جو بے سر و سامان تھے اور ان کے پاس آلات حرب بھی قدیم تھے، اپنی بہادری اور استقلال سے ایک بڑی چابک دست، منظم اور تربیت یافتہ فوج کا پامردی سے مقابلہ کیا۔

انھوں نے بڑے جوش اور بہادری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا جسے دیکھ کر سر کولن کیمبل جو فوج کی کمان کر رہا تھا حیران رہ گیا۔ پہلے ہی حملہ میں غازیوں نے وال پول اور کیمرن کو مجروح

کر دیا حالانکہ دشمن کی طرف گولیوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ سرکولن بھی مشکل سے اپنی جان بچا سکے۔ رسل جو اس وقت موجود تھا غازیوں کی جنگ کا حال لکھتا ہے:

"غازیان عمدہ لوگ تھے، بھوری داڑھیوں والے معمر لوگ جن کے سروں پر سبز عمامے اور کمربند کے ساتھ، اور ان میں ہر ایک کے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھی تھی جس پر قرآن پاک کی کچھ آیتیں کندہ تھیں۔ وہ ڈھالوں کے نیچے سر جھکائے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لپکتی ہوئی تلواریں تھیں جو ان کے سروں پر گردش کر رہی تھیں۔ وہ دین دین کا نعرہ لگا رہے تھے اور مجذوبوں کی طرح رقص کر رہے تھے۔"(94)

اس طرح کی بہادری بہر حال بیکار تھی۔ مجاہدین جنگ ہار گئے۔ انگریزوں نے 7 مئی 1858 کو بریلی پر قبضہ کر لیا۔(95)

بریلی پر انگریزوں کے قبضہ ہو جانے کے بعد خان بہادر خاں نے فرار کی راہ اختیار کی۔ ان سخت حالات میں بھی بریلی کے نواح میں آباد کرمیوں نے فرار شدہ لوگوں کو پناہ دی۔(96)

بریلی سے نکلنے کے بعد خان بہادر خاں شاہ جہاں پور کی طرف بڑھے تاکہ احمد اللہ شاہ کے ساتھ مل جائیں مگر بدقسمتی سے اس مصیبت کی گھڑی میں خان بہادر خاں کے معتمد شوبھا رام کو انگریزوں نے گرفتار کر لیا۔(97) خان بہادر خاں ایک مقام سے دوسرے مقام پر حرکت کرتے رہے۔ انھوں نے 12 جون 1858 کو شاہ جہاں پور کے مضافات سے متعینہ فوجی چوکیوں پر حملہ کر کے ان میں موجود فوجیوں کو بھگا دیا۔ خان بہادر خاں بہر حال احمد اللہ شاہ سے نہیں مل سکے کیونکہ 15 جون 1858 کو راجہ پوائن نے ان کا قتل کر دیا۔(98) احمد اللہ شاہ کے قتل نے خان بہادر خاں کو اکیلا کر دیا۔ انگریزی فوجیں ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ خان بہادر خاں نے نیپال کی سرحدوں کے قریب جنگل میں پناہ لی۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتے رہے اور بالآخر رانا جنگ بہادر نے انھیں بٹول کے قریب دسمبر 1859 میں گرفتار کر لیا۔ کچھ دنوں تک خان بہادر خاں رانا کی قید میں رہے۔ بعد میں انگریز انھیں بریلی لائے اور قلعہ میں بند کر دیا۔(99) ان پر لوگوں کو بغاوت کرنے اور خود بغاوت کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ان کا مقدمہ ایک خاص کمیشن کے حوالہ کیا گیا جس نے ان کو موت کی سزا دی۔(100) انھیں بریلی جیل میں 24 مارچ 1860 کو پھانسی دے دی گئی اور وہیں دفن کر دیا گیا۔(101)

حواشی:

1. The Mutiny of Bengal Army an Historical Narrative Populary known as Red Pamphlet (1857) cited in Rizvi, Freedom strugle in U.P Vol. V, p.178.
   انتظام اللہ شہابی، غدر کے چند علما، دہلی، ص-136، آکسفورڈ، انتظام اللہ شہابی۔
2. شہابی، ص-136
3. صبح الاخبار، 11 مئی 1858
4. Foreign Department, Index No. 150-151, Vol. No.1, p.297
5. روہیلہ افغانوں کی اہم آبادیاں بریلی، آنولہ، چھاچھ، کہاریکا، سنگی، میرگنج، بیلی بھیت، شیرپور کلاں وغیرہ میں تھیں۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مستجاب خاں، گلستان رحمت، علی گڑھ مخطوطہ، صفحات 7الف-ب، 13الف اور 16الف
6. گلستان رحمت 221ب تا 224ب، اسٹریچی، ہسٹنگز اینڈ دی روہیلہ وار، ص-30
7. Fisher, Vol IX, pt I pp.119-20, Atkinson, Statistical, Discreptive and Historical Accouns...., Vol.II, pt.II, pp. 199-200.
8. Imtiyaz Husain, Land Revenue Policy in North India, and the Ceded Provinces, 1810-1833 New Delhi 1976, pp. 35-36 (آکسفورڈ، مکرر امتیاز)
9. دیکھیے آسیہ صدیقی، اگریرین چینج ان ناردرن انڈیا، باب دوم۔
10. British India and the abuse of Power. Rohilkhand under early Company rule, IES HER, X (4), p.p. 129-156.
11. امتیاز حسین، صفحات 35-36
12. امتیاز حسین، ص-255
13. امتیاز حسین، ص-255
14. براؤن، ص-155
15. W. Francklin, History of the Reign of Shan Aulam London, 1798, p.60, Heber, Narrative of Journey.... Vol. I, New Delhi 1995, p. 128.
16. Marquis of Hastings, The Private Journal, Allahabad, 1907, p p 149-50.
17. An Eye Witness Accounts of the Great Indian Mutiny Personal Adventures During the Indian rebillion, reprint Allahabad, 1974, p.p. 12-14.
18. اٹکنسن، جلد پنجم، ص-618
19. مولوی سمیع الدین، تاریخ شاہجہاں پور، 1931، ص 609
20. Richard Temple, Men and Events of my time in India, 1882 (reprint 1985) New Delhi, p.138.
21. اٹکنسن، جلد پنجم، صفحات 679-80

22. ایضاً، ص 679-80
23. ہکنسن، جلد پنجم، صفحات 679-80
24. Henry Mead, The Sepoy Revolt, reprint Delhi, 1986, p 141
25. ہکنسن، جلد پنجم، ص 680
26. ملاحظہ ہو، بخت خاں بطور لیڈر، سپاہی جنرل آف 1857، پروسیڈنگ آف انڈین ہسٹری کانگریس، 1985
27. تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ شاہجہاں پور، ص 331
28. Foreign Political Consultations, National Archives, New Delhi
29. ایضاً۔
30. درگا داس، دور وی بنگالی، کلکتہ 1985، ص 84 (آئندہ بحوالہ درگا داس)
31. درگا داس، ص 84
32. درگا داس، ص 85
33. درگا داس، صفحات 102-103
34. درگا داس، صفحات 102-103
35. اب تک ان کے متعلق تفصیلات نہیں ملیں۔
36. درگا داس، ص 102-23
37. ہکنسن، جلد پنجم، ص 685
36. اطلاعیہ کا پورا متن از پارٹ XXIV، مقالہ نمبر 1/15، بریلی کمشنر آفس، میوٹنی ریکارڈز، یو پی۔
39. درگا داس بندو پادھیائے نے اس پر اپنی کتاب دور وی بنگالی میں روشنی ڈالی ہے۔
40. اس طرح کے جذبات بہادر شاہ ظفر اور برجیس قدر اور دوسروں کے اعلانوں میں پائے جاتے ہیں۔
41. درگا داس، ص 111-12
42. ہکنسن، جلد پنجم، صفحات 687-88
43. ہکنسن، جلد پنجم، صفحات 687-88۔ درگا داس بھی شوبھا رام کے کردار کی تعریف کرتا ہے۔ درگا داس، ص 152
44. درگا داس، صفحات 152-53
45. فریڈم اسٹرگل ان یو پی، جلد اول، صفحات 465-66
46. فریڈم اسٹرگل، جلد اول 431
47. درگا داس، صفحات 152-54
48. تفصیلات کے لئے ضروری طور پر فریڈم اسٹرگل، جلد اول، صفحات 433-34 ملاحظہ فرمائیں۔
49. مولوی رضی الدین، کنزالتاریخ، 1907، صفحات 331-32
50. کنزالتاریخ، ص ص 331-32
51. کنزالتاریخ، صفحات 334-35
52. کنزالتاریخ، ص 439
53. C.T. Metcalfe, Two Narratives of the Mutiny, Delhi 1974, p. 143 عبداللطیف کے مطابق بادشاہ نے خان بہادر خاں کو بریلی جاگیر میں عطا کی تھی۔ ملاحظہ ہو، 1857 کا تاریخی روزنامچہ، دہلی 1958، ص 147

64. Fisher, Vol. IX, pt.I, pp. 151, 153.
65. Foreign Consultations Political Proceedings, 27 May 1859, NAI, p.p. 170-71
56. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات، 434-35
57. رجسٹر نمبر 82، سیکشن 4، ملکۂ عالیہ، دارالانشاء، رضا لائبریری، رام پور۔
58. اٹکنسن، جلد پنجم، ص 687
59. آنند رام مخلص، سفرنامہ، رام پور، ص 78
60. Mutiny Narratives, N.W.P., Agra, Appendix B to Bareilly Narrative, p.p 17-19
61. ایضاً۔
62. فتح الاخبار، 11 مارچ 1858، فارن پولیٹکل پروسیڈنگس، 27 مئی، 1858، کنس نمبر 81، صفحات 170-71 نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی
63. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 374
64. درگاداس، ص ص 161-62، اٹکنسن، جلد پنجم، صفحات 687-88
65. درگاداس، صفحات 161-66، اٹکنسن، جلد پنجم، صفحات 687-88
66. Foreign Consultative Political Proceedings. No. 39, 18 March 1860, N.A. New Delhi.
67. درگاداس، صفحات 342-45، اور ملاحظہ ہو فارن ڈپارٹمنٹ، ان ڈیلی پی تیر ٹمنز 1858
68. درگاداس، صفحات 342-45
69. ایضاً
70. فیروز شاہ کا اعلامیہ جس کا انگریزی ترجمہ فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم میں ص 376-80 پر موجود ہے۔
71. ایضاً، صفحات 379-80
72. Foreign Department Political, 30 December 1859 cited in Rudrangshu Mukherjee, Awadh in Revolt, 1857-58, New Delhi, 1984, p.80
73. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 385
74. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 287-89
75. درگاداس، ص 336
76. ایضاً
77. درگاداس، صفحات 287-88
78. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 288
79. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 384
80. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 371, 375, 397, 441
81. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 358, 363-64, 267
82. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 358, 363-64, 67 371, 375, 396, 397, 441

83. Russel, W H , My Indian Mutiny Diary, p. 162

84. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 389

85. دی بنگال ہرکارہ، 17 اپریل 1858

86. ایضاً

87. Foreign Deptt. Index 1850-59 AB, Vol.I, SN 14, NAI, New Delhi p. 207

88. ایضاً

89. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 435

90. Foreign Political Proceedings, 27 May, 1859, Cons., No. 61, pp 57-60, NAI, New Delhi.

91. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات، 410, 418-19

92. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 410, 418-19, 443, 424

93. Charles Ball, The History of Indian Mutiny Diary Vol. II, London 1858, pp. 328-31

94. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص-437

94. Russel, My Indian Mutiny Diary, pp. 138-47

95. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 464-67

96. ایضاً، صفحہ-486

97. ایضاً، صفحات 495-96, 485-86 شیو پرشاد رام کے خلاف مقدمہ چلا اور وہ جلاوطن کر دیے گئے۔ بحوالہ سین 1857 ص 371

98. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 547-575

99. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، ص 595

100. ایضاً

101. ایضاً، صفحات 616-17

اقبال حسین

مولوی سید قطب شاہ اوران پر مقدمہ قتل و بغاوت 1857

1857 کی پہلی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے مختلف طبقات کے لوگ تھے۔ ان میں عام آدمی جسے سرسید احمد خاں نے گنوار لکھا ہے،[1] جولاہے، لوہار، بڑھئی اور دستکار سب ہی شامل تھے مگر اس جنگ کو جاری رکھنے اور عوام کے جذبات کو بیدار رکھنے میں علما نے اہم رول ادا کیا تھا۔ متوسط طبقہ کے یہ لوگ پہلی بار ایک ایسی جنگ میں شریک ہوئے تھے جس میں ان کا حریف یورپ اور ایشیا کے طاقت ور ترین دھڑے کا نمائندہ تھا اور دوسری طرف ہندوستان کے یہ لوگ جن کے پاس نہ دولت تھی اور نہ طاقت لیکن ایک طاقت ور دشمن کو ملک سے نکال کر آزادی حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ اس طبقے میں ہمیں بے شمار ایسے کردار نظر آتے ہیں جن کی جرات، شجاعت اور استقلال سے آزادی کی پہلی جنگ تمام بے سروسامانی اور مرکزی قیادت کے فقدان کے باوجود تقریباً دو سال تک لڑی گئی۔ ان مجاہدین آزادی نے دوران جنگ اور بعد جنگ صعوبتیں اٹھائیں، قید و بند میں کسمپرسی کے عالم میں انگریزی حکومت کے حکام کے تازیانوں کو سہا اور دار پر چڑھے۔ 1857 کی بغاوت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ جب مجاہدین آزادی انگریزوں کی طاقت ور فوج اور ایک منظم نظام سراغ رسانی کا سامنا نہ کر سکے اور شکست کھا گئے تو بہت سے روپوش ہو گئے۔ دریں اثنا ملکہ برطانیہ کے یکم نومبر 1858 کے اعلانیہ سے جس میں واضح طور پر یقین دلایا گیا تھا کہ جو لوگ گمراہ کر دیے گئے تھے اگر لوٹ آئیں گے تو انھیں معاف کر دیا جائے گا

اور یہ بھی باور کرایا گیا تھا ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا جائے گا جنھوں نے انگریزی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔[2] مگر یہ تمام اعلانیے کھوکھلے ثابت ہوئے اور مجاہدین آزادی پر حکومت وقت کے خلاف بغاوت کرنے یا حکمراں انگریزوں کے قتل یا قتل میں ممدومعاون ہونے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ عام طور پر یا تو انھیں دار چڑھا دیا گیا یا حبس دوام عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی۔ خدا جانے کتنے مجاہدین آزادی انگریزی حکومت کے نام نہاد عدلیہ کا شکار ہوئے اور وطن سے دور کس مپرسی کے عالم میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے وہیں پیوند خاک ہو گئے۔ گو کہ 1857 کے مجاہدین کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں ادھر ادھر مل جاتے ہیں لیکن اس کی کوئی مکمل تفصیل نہیں ملتی کہ 1857 کی جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں کتنے لوگوں کو ملک بدر کیا گیا۔ ہمیں اس کا بھی علم نہیں کہ وہ کون لوگ تھے اور ان کے مقدمات، گواہی اور سزاؤں کی کیا نوعیت تھی۔ اس دور کے بعض مقدمات کی فائلوں کے مطالعے سے بعض سزا یافتہ افراد کے متعلق دل چسپ باتیں ضرور معلوم ہوئی ہیں۔ ان فائلوں میں ایک فرد سید قطب شاہ کا بھی نام ملتا ہے جن پر فرد جرم عائد کی گئی، مقدمہ چلا اور ملکہ وکٹوریہ کے اعلان کو نظر انداز کرتے ہوئے موت کی سزا سنادی گئی جسے بعد ازاں بعض تکنیکی حیلوں سے سزا کو حبس دوام میں بدل دیا گیا۔ دونوں صورتوں میں انجام ایک ہی تھا۔ تاہم اس دور میں اگر حکومت از خود مقدمات پر نظر ثانی کر کے فیصلوں کو تبدیل کر دے تو عجیب سا لگتا ہے۔ سید قطب شاہ پر مقدمہ، سزا اور سزا میں بظاہر کمی، ایک ایسا ہی دل چسپ مقدمہ تھا۔

مولوی سید قطب شاہ بن بخش اللہ شاہ کے خاندانی حالات، ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ قرائن اور شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کا تعلق علمی گھرانے سے تھا۔ 31 مئی 1857 کو بریلی میں جب جنگ آزادی کا علم بلند ہوا تو سید قطب بریلی کالج میں فارسی کے معلم تھے۔[3] 1857 کی جنگ آزادی میں بریلی کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ سو سال پہلے یہ روہیلہ افغانوں کا دارالسلطنت تھا۔ حافظ رحمت خاں اس کے مقبول

حکمراں تھے جن کو شجاع الدولہ نواب اودھ اور وارن ہیسٹنگز نے ایک ناپاک سازش کے تحت 1774 میں جنگ کر کے شہید کر دیا تھا۔ روہیل کھنڈ کے عوام اس حادثے سے سخت ناخوش تھے۔ ایک صدی گزر جانے کے باوجود حافظ رحمت خاں کی مقبولیت کا اعتراف۔ سیاح فارسٹر، لیفٹنٹ گورنر سر جان اسٹریچی اور مورخ سرالیٹ کے بیانات سے ہوتا ہے کہ حافظ رحمت خاں اور دیگر سرداروں نے اپنے دور اقتدار میں عوام کو امن و تحفظ دیا جو اس دور کے حکمرانوں میں ناپید تھا۔ (4)

حافظ رحمت خاں کے پوتے خان بہادر خاں 1857 میں بریلی میں موجود تھے۔ وہاں کے لوگوں نے باوجود آپ کی پیرانہ سالی کے آپ کو اپنا قائد بنالیا تھا۔ چنانچہ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران خان بہادر خاں کے گرد مختلف طبقات کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ سید قطب شاہ بھی ان میں سے ایک تھے۔

سید قطب شاہ اور خان بہادر خاں کے مراسم پہلے سے قائم تھے۔ بریلی میں قیادت سنبھالنے کے بعد سید قطب شاہ کو، خان بہادر خاں نے بیلی بھیت کی نہروں کا سپرنٹنڈنٹ بنادیا تھا اور ان کے ذمے بہادری پریس کی پوری نگرانی سونپ دی تھی۔ بہادری پریس جو غالباً خاں بہادر کے نام پر قائم کیا گیا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں مجاہدین آزادی کے نظریات کا ترجمان تھا۔ اس پریس نے 1857 اور 1858 کے درمیان مجاہدین آزادی کے بہت سے اعلانیے شائع کیے تھے جس میں عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف متحد ہو کر اپنے دین دھرم اور ملک کی حفاظت کریں۔ (5)

خان بہادر خاں اور ان کے رفقا نے تقریباً ایک سال تک آزاد حکومت قائم رکھی۔ مولوی قطب شاہ ان کی حکومت کے ایک اہم اور فعال رکن تھے۔ ظاہر ہے جب انگریزوں نے دہلی اور اودھ پر دوبارہ اپنا اقتدار قائم کر کے بریلی پر بھی قبضہ کرلیا تو خان بہادر کے بریلی چھوڑ جانے کے بعد سید قطب شاہ کا بریلی میں مقیم رہنا موت کو دعوت دینا تھا۔ برطانوی حکومت کے جاسوس اور اہلکاران و پولیس سرگرمی سے مجاہدین آزادی کو گرفتار کر کے مقدمہ چلا رہے تھے، اور بیشتر لوگوں کو یا موت کی سزا دے دی یا سزائے عبور دریائے شور سنادی گئی۔ مولوی قطب حالات

کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے ایک عزیز کے پاس میرٹھ چلے آئے جو وہاں فوجی چھاؤنی میں انگریزوں کی ملازمت میں تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے عزیز سردار بہادر کی سفارش پر فوج میں ملازمت حاصل کرلی اور میرٹھ میں رہنے لگے لیکن برطانوی حکومت کے مخبروں اور خفیہ پولیس نے ان کو بغاوت میں سرگرم ہونے کے الزام میں گرفتار کرادیا۔ مولوی قطب شاہ کے خلاف چار الزامات عائد کیے گئے۔ اول: انھوں نے باغیوں کی رہنمائی کی اور لوگوں کو بغاوت پر اکسایا۔ دوم: وہ 31 مئی 1857 کو انگریزوں کے قتل میں مدد ومعاون تھے۔ سوم: انھوں نے سرکاری املاک کی لوٹ میں شرکت کی اور چہارم، عام معافی کے اعلانیہ کے باوجود ہتھیار نہ ڈال کر بارہویں گھڑسوار فوج میں غلط نام سے ملازمت حاصل کی تاکہ وہ فریب دیتے رہیں۔ ان الزامات کی روشنی میں مولوی قطب شاہ کے خلاف فرد جرم قائم کی گئی اور گواہان کے نام دیے گئے۔ اس دور میں گواہان کی شہادت کس حد تک غیر جانبدار اور منصفانہ رہی ہوگی اس پر بحث کرنا عبث ہے۔ لیکن شہادت گواہان کے مطالعے سے بہت سی باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔ سید صاحب پر فرد جرم اور گواہان کی شہادت کچھ اس طرح تھی:

اول: انھوں نے (سید قطب شاہ) خود یورپین باشندوں کے قتل کے احکامات صادر کیے۔
نام گواہان: رام دین، گنیش، مترا اور راہول

دوم: مولوی سید قطب نے باغی بخت خاں (صوبہ دار توپ خانہ انگریزی بریلی) سے ملاقات کی۔
گواہ: سید جاوید علی

سوم: سید قطب شاہ نے (سبز) علم بلند کیا۔
گواہان: سندر، حسین علی، مترا اور شفیع

چہارم: مولوی قطب شاہ نے اعلانیوں کو شائع اور مشتہر کیا
گواہان: سندر لعل، درگا مل، منول اور چوراہل۔[6]

سید قطب شاہ کے خلاف مقدمہ کی نوعیت اور شہادتوں کے معتبر ہونے کا اندازہ بخوبی

کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سید صاحب کو بھی رسمی سماعت کے بعد 25 مارچ 1859 کو سزائے موت سنا دی گئی۔ سید صاحب کے مقدمہ اور سزا کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جج صاحب کی غیر جانبداری کی پول ان کے فیصلے نے ہی کھول دی۔ وہ اپنی تجویز میں لکھتے ہیں:

"قیدی قطب شاہ ایک وہابی ہے اور ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ان کا مسلک کس قدر ناصلح مندانہ ہے یہ شخص بریلی کالج میں ایک مدرس تھا جو یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ یہ حلفیہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ شخص 31 مئی 1857 کو شہر گیا اور یورپین باشندوں کے قتل کے لیے تقریریں کیں۔ اس نے (سبز) علم بلند کیا جو عیسائی آبادی کے اخراج کے لیے اعلانیہ تھا۔ کچھ دنوں بعد اس شخص نے گورنمنٹ اسکول کی جائیداد کو نیلام پر چڑھا دیا۔ اسے خان بہادر کی حکومت سے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ یہ چیلی بھیت میں واقع نہروں کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اسے خود تسلیم ہے اور گواہان کی شہادت سے بھی ثابت ہے۔ اس نے باغیوں کے اعلامیے شائع کیے جیسا کہ دو اشتہاروں سے ثابت ہوتا ہے جس پر قطب شاہ تحریر ہے اور جس کو قیدی تسلیم کرتا ہے۔

ایک دوسرے اعلانیہ کے بعض حصے جس کے ترجمے کی تلخیص موجود ہے، قیدی جھٹلاتا ہے لیکن بظاہر یہ اسی ٹائپ میں ہے جیسے کہ پہلے دو۔

"قیدی میرٹھ گیا جہاں ایک رسالدار سردار بہادر کی ضمانت اور تحریک پر، جو اب اس سے کسی قسم کی شناسائی سے منکر ہے اور کہتا ہے کہ قیدی نے اسے غلط بیان دے کر دھوکا دیا ہے۔ ملازمت حاصل کی۔"

یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ انگریز جج کا قلم، سید قطب پر عائد کردہ الزام سے ہٹ کر، اس کی اپنی رائے ظاہر کر دیتا ہے: "قیدی قطب شاہ ایک وہابی ہے اور ہم سب یہ جانتے ہیں کہ ان کا مسلک کس قدر ناصلح مندانہ ہے۔" اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ برطانوی حکمران ٹولہ کے دل و دماغ پر سید احمد شہید کی تحریک کا کس قدر خوف غالب تھا۔ اپنے فیصلے میں سید قطب شاہ کو وہابی کہنے کا مقصد ایک طرف اپنے فیصلے کو جائز ٹھہرانا تھا اور دوسری طرف ایسے افراد کو متنبہ کرنا تھا جو اب بھی سید احمد شہید کی تحریک سے وابستہ تھے اور اپنی سیف و قلم سے برطانوی حکومت سے

نبرد آزما تھے۔ بہر حال جہاں منصف کا ذہن پہلے ہی سے ایک رائے قائم کر چکا ہو اس سے انصاف کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ سید صاحب نے بعض الزامات سے انکار کیا۔ یہ انکار جان بچانے کے لیے نہ تھا بلکہ حقیقت پر مبنی تھا جیسے یہ کہ انھوں نے 31 مئی کو یورپین باشندوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ سید قطب شاہ نے اعلانیوں کی اشاعت کو تسلیم کیا، جو حقیقت بھی تھی۔ اس ضمن میں جج موصوف نے اپنے فیصلے میں ایک اور الزام کا اضافہ کر دیا۔ جس کا نہ تو فرد جرم میں کوئی ذکر تھا اور نہ ہی گواہان نے کچھ کہا تھا۔ جج صاحب لکھتے ہیں:

> "یہ درست ہو سکتا ہے کہ ملزم نے جنگ میں حصہ نہ لیا ہو، تاہم یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ فیروز شاہ (شاہ زادہ) کی فوج کے ہمراہ اس کے نائب کی حیثیت سے مراد آباد گیا تھا۔"

جج موصوف جو دراصل ایڈیشنل کمشنر تھے اور جج کے فرائض انجام دے رہے تھے اپنے فیصلے کے آخر میں لکھا کہ یہ ایک نہایت سنگین حقیقت ہے کہ یہ شخص (قطب شاہ) جو اچھا مشرقی علم رکھتا ہے، اس نے خان بہادر کے نام سے اشتعال انگیز اشتہارات شائع کیے اور سردار بہادر جو اس کا سالا ہے، کی ضمانت پر کہ یہ شمالی ہند کا ایک پیرزادہ اور نیک آدمی ہے، میرٹھ میں بارھویں فوج میں ملازمت کی، چنانچہ فیصلہ یہ صادر ہوا کہ سید قطب پر پہلا، دوسرا اور تیسرا الزام پوری طرح ثابت ہے، اس لیے اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔[7]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ الزام جرم ثابت ہو یا نہ ہو، 1857 کی جنگ آزادی کے ماخوذین میں شاید ہی کوئی سزا سے بچا ہو۔ صرف دہلی میں 27 ہزار مسلمانوں کو بغاوت کے الزام میں سولی پر چڑھا دیا گیا۔[8] ان میں ان ہزاروں افراد کا کوئی شمار نہیں ہے جو جنگ آزادی کے دوران شہید ہوئے۔ ایسے دور میں جب کہ ذرا سے شبہ پر موت کے گھاٹ، بغیر کسی مقدمہ کے اتار دیا جاتا تھا[9] سید قطب شاہ کے لیے پھانسی کی سزا کی تجویز کوئی اہم بات نہیں تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نومبر 1858 میں ملکہ وکٹوریہ کے جاری کردہ اعلانیہ کا کچھ اثر برطانوی حکام پر پڑا تھا۔ چنانچہ جب ایڈیشنل کمشنر بریلی کے فیصلہ کی نقل سکریٹری تک پہنچی تو اس نے سید قطب شاہ پر عاید کردہ دوسرے فرد جرم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور یہ اعتراض کیا کہ سید

قطب کے مقدمے میں جو شہادتیں گزری ہیں ان کی روشنی میں ان کا یورپین افراد کا قاتل ہونا یا ان کے قتل میں ملوث ہونا ثابت نہیں ہوتا۔[10] تاہم سکریٹری نے سید قطب شاہ کو سرکار کے خلاف سبز پرچم بلند کرنے اور اشتہارات کے ذریعے اشتعال پیدا کرنے کے الزام میں ان کی تمام جائداد کی ضبطی اور حبس دوام کی سزا سنادی۔[11] یہاں یہ قابل توجہ امر ہے کہ سید صاحب کے خلاف شہادت میں جو افراد پیش پیش تھے کہ انھوں نے یورپین افراد کے قتل میں حصہ لیا تھا، سکریٹری مذکور نے ان کی شہادت رد کردی تھی بلکہ ایک شاہد راہول کی شہادت کو جھوٹا بتلایا تھا کیونکہ اس نے سید قطب شاہ پر یورپین افراد کے قتل کے بعد ان کی لاشوں کو شہر کی سڑکوں پر گھسیٹ کر لے جاتے دیکھا تھا۔ بہر حال تعجب کی بات یہ ہے کہ ان ہی گواہوں کی دیگر شہادتوں کو تسلیم کرکے ان کو سزائے حبس دوام دے دی گی۔ سید صاحب کالے پانی بھیج دیے گئے۔ وہاں ان پر کیا گزری اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ غالباً وہ بھی دیگر اسیران کی طرح وہاں قید و بند کی صعوبتیں سہتے سہتے وہیں پیوند خاک ہو گئے۔

حواشی:

1. سرکشی ضلع بجنور، مرتبہ شرافت حسین مرزا، دہلی 1964، صفحہ 103
2. The History of Indian Mutiny, Vol II, pp. 518-19, Charles Ball
3. سید اطہر عباس رضوی، فریڈم اسٹرگل ان یوپی، جلد پنجم، صفحات 585-583
4. Forster, A Journey from Bengal, Vol.I, P 149
Strachey, Hastings and the Rohilla War, p.VII, Elliot, The British Colonies, p.330
5. فریڈم اسٹرگل، جلد پنجم، صفحات 258-283
6. Foreign Political Proceedings, 27 May 1859, Cons. No. 81, National Archives, New Delhi, P.175
7. فریڈم اسٹرگل ـــــ جلد پنجم صفحات 585-583، فارن پولیٹکل پروسیڈنگس، 27 مئی 1859، کنسلٹیشن نمبر 81، صفحات 164-161
8. ذکاء اللہ، تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ
9. انگریزوں کے مظالم اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ معقولیت پسند انگریز اعتراف کرتے تھے کہ اگر ان کے کرتوت شائع کردیے جائیں تو پوری برطانوی قوم کے لئے سخت شرمناک بات ہوگی۔ ملاحظہ ہو آر سی دت، انگلینڈ اینڈ انڈیا، صفحات 86-85
10. Letter from Assistant Secretary to Government of U.P. to H. Vanisttart Special Commissioner, Bareilly, (No. 1293 dt. 15 April 1859 and No. 1725 (Judicial) dated 12 May 1859, Foreign Political Proceedings, 27 May 1859, Cons. No. 81, pp. 175-176, National Archives, New Delhi.
11. ایضاً

اقبال حسین

محمود خاں روہیلہ

محمود خاں نواب نجیب الدولہ کے پرپوتے تھے۔ آپ معین الدین خاں عرف بھمبھو خاں پسر ضابطہ خاں روہیلہ کے بیٹے تھے۔ اپنے بھائی غلام قادر خاں روہیلہ کی موت کے بعد پنجاب چلے گئے تھے۔[1] 1803 میں دہلی پر لارڈ لیک کے قبضہ کے بعد آپ کو واپس بلا کر انگریزی سرکار نے پانچ ہزار روپیہ ماہانہ کی پنشن مقرر کر کے نجیب آباد میں سکونت کی اجازت دی تھی۔[2] معین الدین خاں کی آبادکاری 1812 میں کی گئی تھی۔ یہ دور ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے سخت تھا کیونکہ پنڈاریوں نے گوریلہ جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ مرہٹوں کی افواج غیر منظم ہونے کے باوجود دہلی کے آس پاس منڈلا رہی تھیں۔ سندھیہ مہاراجہ گوالیار بظاہر انگریزوں کا حلیف تھا لیکن مہاراجہ نیپال سے ساز باز کر رہا تھا۔ ایسی صورت حال میں روہیلکھنڈ کے علاقہ میں ایک روہیلہ افغان سردار کی ضرورت تھی تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کا تحفظ کر سکے۔ سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر معین الدین خاں کی پذیرائی کی گئی۔ جیسے ہی معین الدین خاں کا انتقال ہوا اور سیاسی خطرات دور ہو گئے، انگریزی حکومت نے معین الدین خاں کے بیٹے محمود خاں کی پنشن تخفیف کر کے ایک ہزار کر دی۔ نجیب آباد کا علاقہ بھی سرکاری طور پر ان کے حوالہ نہیں کیا گیا۔ تاہم محمود خاں اپنی فیاضی، سخاوت اور داد و دہش کی وجہ سے مقبول تھے۔

محمود خاں نجیب آباد اور گرد و نواح کے علاقہ میں نجیب الدولہ کے خاندان کا ہونے کی وجہ سے عوام میں مقبول تھے اور آزمائش کے وقت عوام ان کی طرف قیادت اور حفاظت کی

امید لگائے ہوئے تھے۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی کے وقت محمود خاں کو عوام کی حمایت اسی وجہ سے حاصل ہوئی تھی اور ان کے ہی بل بوتے پر وہ جنگ آزادی میں تمام تر دشواریوں کے بعد بڑی حد تک کامیاب رہے تھے لیکن دہلی پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد ان کی فوجی اور سیاسی حکمت عملی نے محمود خاں اور ان کے رفقا کی کامیابیوں کو ناکامی میں بدل دیا۔

بجنور میں 1857 کے انقلاب کے آغاز تا آخر کا احوال سید احمد بعد ازاں سر سید مرحوم نے اپنی کتاب سرکشی ضلع بجنور میں تحریر کیا ہے۔ سر سید نے اس انقلابی دور کو خود دیکھا تھا کیونکہ وہ وہاں صدر امین کے عہدہ پر فائز تھے۔ انھوں نے واقعات کے بیان میں غیر جانبداری اور مصلحت آمیزی سے کام لیا ہے، گو کہ وہ کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''الٰہی تو مجھ کو توفیق دے کہ یہ تاریخ میری پوری ہو اور صحیح بات اس میں لکھنے کی ہدایت کر کیوں کہ طرف داری کی تاریخ لکھنی ایسی بے ایمانی کی بات ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہتا ہے۔ اس کا دبال قیامت تک مصنف کی گردن پر ہوتا ہے۔ اس تاریخ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، بہت سا اس میں میری آنکھوں نے دیکھا اور بہت سا اپنے ہاتھ کا کیا ہوا اور اس کے سوا جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت تحقیقات سے اور بہت صحیح اور نہایت سچ لکھا ہے۔''[3] بجنور میں 1857 ء کا احوال ''روزنامچہ غدر'' جس کے مصنف شجاع اللہ خاں ہیں اور جو عبدالسلام ذخیرہ اردو مخطوطات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں محفوظ ہے، ملتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شجاع اللہ خاں نے ''سرکشی ضلع بجنور'' سامنے رکھ کر اپنا روزنامچہ مرتب کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جس سے ان کو اختلاف تھا۔

بجنور میں 1857 کی جنگ آزادی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ضلع کے قریبی ماضی کا مختصر ذکر کیا جائے۔ بجنور اٹھارھویں صدی میں روہیلوں کے زیر اقتدار تھا لیکن 1774 میں شجاع الدولہ اودھ کے نواب نے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی سے ساز باز کر کے روہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا تھا۔ روہیلہ حکمراں حافظ رحمت خاں شہید کر دیے گئے تھے لیکن جلد ہی 1801 میں پورا علاقہ براہ راست انگریزوں کے زیر نگیں آگیا۔ گو کہ روہیلوں سے اقتدار فریب اور جنگ کے ذریعے سے حاصل کر کے ان کو محکوم بنا دیا گیا تھا لیکن نہ تو وہ اودھ کی اور نہ ہی انگریزی حکومت کی

سربراہی کو دل سے قبول کر سکے تھے۔ انھوں نے نئے حکمرانوں کے خلاف بار بار ہتھیار اٹھائے۔ 1816 میں انگریزوں نے جب چوکیداری ٹیکس نافذ کیا تھا تو انھوں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔[4] آہستہ آہستہ روہیلوں کے عمائدین کو انگریزی حکومت نے اعزاز و مناصب کی مصلحت کے تحت ہموار کرنا شروع کیا۔ 1857 میں روہیلوں کے چند اہم اور مقتدر حضرات انگریزی حکومت میں اعزازی یا تنخواہ دار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔[5] لیکن روہیلوں میں بہ حیثیت مجموعی انگریزی حکومت کے خلاف نفرت اور غم و غصہ بدرجہ اتم موجود تھا اور یہ 1857 کی جنگ کے آغاز ہوتے ہی واضح طور پر سامنے آ گیا۔ ان حالات میں یہ فطری بات تھی کہ محمود خاں جو نجیب الدولہ کی اخلاف میں تھے، اس جنگ آزادی کی سربراہی کرتے۔[6]

1857 میں ضلع بجنور میں کل پانچ تحصیلیں تھیں۔ راج پوت ضلع میں تیرہ فیصد کے قریب مالکانہ حق رکھتے تھے اور تقریباً تیس فیصدی زمینوں پر قابض تھے اور پورے ضلع کی مالگذاری کا تقریباً تیس فیصدی ادا کرتے تھے۔ برخلاف اس کے چالیس فیصد روہیلہ زمیندار تھے اور صرف چھ فیصد زمینوں پر قابض تھے اور ضلع کی کل مال گذاری کا صرف پانچ فیصدی ادا کر رہے تھے۔ شیخ حضرات ضلع میں تقریباً چودہ فیصد مالکانہ حق رکھتے تھے اور کل مال گذاری کا بارہ فیصدی ادا کرتے تھے۔ بہر حال ضلع میں نسبتاً کم زمینوں پر مالکانہ حقوق رکھنے کے باوجود روہیلہ پٹھانوں کا ضلع پر کافی اثر تھا۔[7] کیونکہ نجیب الدولہ کے خاندان کے کئی افراد جیسے امداد حسین، سعد اللہ خاں، کریم اللہ خاں مع احمد اللہ خاں کے ضلع کے صدر مقام اور تحصیلوں میں اہم مقامات پر سرکاری ملازمتوں میں تھے۔[8]

میرٹھ میں جنگ آزادی کے آغاز کی خبر 12 مئی کو بجنور پہنچی تھی۔ 16 مئی سے بجنور بھی انگریز اور انگریز نواز افراد کے غصہ کا شکار ہونا شروع ہوا۔ سربراہ ڈاک مسٹر کیرے کو لوٹا گیا۔ حالات کو بے قابو ہوتا دیکھ کر الیگزینڈر شیکسپیئر نے مقامی زمینداروں سے مدد چاہی اور سپاہیوں کو ان کی رخصتیں منسوخ کر کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔[9] ضلع انتظامیہ کو اور مضبوط کرنے کے لیے اس نے نئے سپاہیوں کی بھرتی کی اور رات کو گشت کرنے کے لیے یورپین اور ہندوستانی افسران پر

مشتمل ٹولیاں بنائیں۔[10] لیکن 19 مئی سے مرادآباد سے بہت سے لوگوں کی آمد کی وجہ سے کمپنی کے افسران کی ہمت چھوٹ گئی اور ان کو خوف لاحق ہوا کہ نئے واردین خزانہ لوٹ لیں گے۔[11] 20 مئی کو بجنور میں سیپرس اور ماما ئنرز کی باقی سپاہ رڑکی سے آگئی جس کی وجہ سے حالات بہت کشیدہ ہوگئے۔ باغی سپاہیوں میں سے کچھ محمود خاں سے بھی ملے اور ان کو جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف سربراہی کے لیے آمادہ کرلیا۔[12] اس وقت تک ضلع بجنور کا امن وامان برہم ہوچکا تھا۔ نگینہ کے جیل کا دروازہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کردیا گیا تھا اور خزانہ پر بھی قبضہ کرلیا گیا تھا۔[13] الیگزینڈر شیکسپیئر کی کوششوں سے شہر بجنور پرامن رہا لیکن ضلع کی حالت تیزی کے ساتھ بگڑتی جارہی تھی۔ منڈاور میں گوجروں نے موقعہ کا فائدہ اٹھا کر خوش حال راوتوں کو لوٹ لیا۔[14] 7 جون 1857 تک پورا روہیل کھنڈ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوچکا تھا اور اب ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ بجنور کو اپنے قبضہ میں رکھ سکیں۔ الیگزینڈر شیکسپیئر نے پہلے کوشش کی کہ ضلع کو طاقت ور اور وفادار زمینداروں جیسے چودھری رندھیر سنگھ اور چودھری پرتاپ سنگھ (دونوں راج پوت چوہان) کے حوالہ کردے لیکن انھوں نے انکار کردیا۔[15] اس انکار کے پس پشت محمود خاں کی غیر معمولی ہردل عزیزی تھی، سرسید کے مطابق ضلع کے عوام کسی اور کی حکومت سوائے محمود خاں کے قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔[16] طویل گفت وشنید کے بعد ضلع کا انتظامیہ انگریزوں کی واپسی تک 7 جون 1857 کو محمود خاں کے حوالہ کردیا گیا۔ بہرحال طاقت کی تبدیلی صرف رسمی تھی۔[17] 8 جون کی صبح کو محمود خاں نے اپنے نام کی منادی کرادی: ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم نواب محمود خاں کا''۔[18] نواب محمود خاں کا یہ اعلان تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور واضح کرتا ہے کہ انگریزی کمپنی کی حکومت کو دل سے لوگ قبول نہیں کرتے تھے اور مغل بادشاہ ہی کو ملک کا فرمانروا جانتے تھے۔ اس طرح کا اعلانیہ اور تصور صرف بجنور تک محدود نہ تھا۔ ہندوستان میں جہاں جہاں جنگ آزادی کے لیے رزم آرائی ہوئی اسی طرح کے اعلامیے جاری کیے گئے تھے۔[19] بہرحال محمود خاں کے اس اعلانیہ میں اس نے اس حق ملکیت کا اعادہ کیا تھا جو برسوں پہلے اس کے دادا نجیب الدولہ کے پاس تھی۔

محمود خاں نے بجنور کا انتظامیہ سنبھالنے کے بعد اپنی تمام توجہ اس کی از سر نو تشکیل و تنظیم کی طرف مبذول کی۔ اس نے اپنے اعتماد کے لوگوں کو ذمے دار عہدوں پر فائز کیا۔ عظمت اللہ خاں، منصف ٹھاکر دوار کو اپنا نائب مقرر کیا اور احمد اللہ خاں تحصیلدار نجیب آباد کو ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز کیا۔ اپنی قوت کو اور مستحکم کرنے کے لیے محمود خاں نے اپنے خاندان کے دیگر معتمد افراد جیسے احمد یار خاں اور حبیب اللہ خاں کو طلب کر کے اول الذکر فوج کا کماندار اور دوسرے کو بخشی کا عہدہ دیا۔[20] محمود خاں نے انتظامیہ کی تنظیم میں بہت محتاط رویہ اختیار کیا تھا۔ انگریزی کمپنی کے عہدہ داروں جیسے سید احمد (سرسید) اور میر تراب علی، جو نئی حکومت کے قیام کے بعد خوفزدہ تھے بلائے گئے اور ان کو ان کے سابق عہدوں پر برقرار رکھا۔[21] برخلاف اس کے سید تراب علی، پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر اور سرسید نے اپنی ایک کمیٹی بنائی اور یہ تجویز کی کہ "ہم میں سے کوئی شخص کوئی کام نہ کرے جب تک باہم کمیٹی سے اس کی صلاح نہ ہولے۔"[22] چنانچہ کمیٹی نے یہ رائے قائم کی کہ میر سید تراب علی تحصیل دار بجنور، نواب کے ضروری احکام کی تعمیل کریں اور باقی احکام کو التوا میں ڈالتے رہیں۔ مال گذاری بھی صرف اس حد تک وصول کریں جس سے تنخواہ عملہ تحصیل و تھانہ تقسیم ہو جائے۔ بخشی رام تحصیلدار بھی اس کمیٹی کے ساتھ تھا اس کے ذریعہ مال گذار کو فہمائش کی گئی کہ روپے خزانہ میں نہ لائیں۔[23] اس طرح کے طرز عمل سے نئی حکومت کو نقصان پہنچا اور محمود خاں ناراض ہو کر سخت احکام بھیجنے لگے۔ دوسری طرف سید احمد خاں بطور صدر امین ماضی کی طرح کام کرتے رہے اور جو روبکاریاں اور رپورٹیں قابل ارسال جج صاحب کے لیے ہوتیں، انھیں بھیج دیا جاتا جو نواب محمود خاں کو ناپسندیدہ تھا۔[24] محمود خاں ان تفصیلات سے ناواقف تھے اور ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ انتظامیہ کی اصلاح ہو۔ انھوں نے ناپ تول میں انگریزی اوزان کو ترک کر کے مغلوں کے عہد میں جاری اوزان کو دوبارہ رائج کیا۔ ہر سیر اور وزن کرنے کے باٹ پر اس کا وزن کھدوایا اور اسے بازار میں رائج کیا۔[25]

گو کہ محمود خاں نے بجنور کی حکومت سنبھال لی تھی لیکن وہ مخالفتوں کے شکار رہے۔ ایک جانب ضلع کے اہم اہلکاران اس کے انتظامیہ کا جز ہونے کے باوجود ان کی حکومت کا بھرپور اور دل

سے ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ دوسری طرف محمود خاں بیرونی خطرات سے بھی دوچار تھے۔ انھیں اطلاع ملی کہ مرادآباد سے باغی سپاہیوں کا ایک جتھا، بجنور کا خزانہ لوٹنے کی نیت سے آرہا ہے۔ انھوں نے اپنے خاص معتمد رام سروپ جو خود بھی کمپنی کی حکومت میں جمعدار رہ چکا تھا اور اب ان کا رفیق تھا، کو ہدایت دی کہ وہ جا کر مرادآباد جانے والی فوج کو روکے۔[26] محمود خاں کو اب یہ بھی احساس ہو چکا تھا کہ کمپنی کے پرانے اہلکاروں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھنا مناسب نہیں۔ انھوں نے نگینہ سے مولوی قادری تحصیلدار کو بلا کر ان کی جگہ اپنے معتمد اور عزیز عباداللہ خاں کو مقرر کیا۔[27]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمود خاں نے سید احمد خاں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ان کو نسلاً بعد نسلاً جاگیر دینے کی پیش کش کی تھی۔[28] سید احمد خاں اس پیشکش سے بہت گھبرائے لیکن انھوں نے بڑی جرات اور ہمت کے ساتھ جواب دیا: ''نواب صاحب میں اس بات پر حلف کرسکتا ہوں کہ ہر حال میں تمھارا خیر خواہ رہوں گا اور کسی وقت تمھاری بدخواہی نہ کروں گا الاّ اگر تمھارا ارادہ ملک گیری اور انگریزوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کا ہے تو میں تمھارا شریک نہیں ہوں۔'' سید احمد خاں جو انگریزوں کے نہایت وفادار تھے، محمود خاں کو آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''خدا کی قسم نواب صاحب میں تمھاری خیر خواہی سے کہتا ہوں کہ تم اس ارادہ کو دل سے نکال دو۔ حکام انگریزی کی عملداری کبھی نہیں جائے گی۔ اگر فرض کرو کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے گئے تو بھی حکام انگریزی کے سوا کوئی عملداری ہندوستان میں نہ کرسکے گا۔ اور میں نے کہا کہ تم اطاعت سرکار اپنے ہاتھ سے مت دو۔ اگر بالفرض انگریز جاتے رہے جیسا کہ تمھارا خیال ہے تو تم نواب بنے بنائے ہو تمھاری نوابی کوئی نہیں چھینتا اور اگر میرا خیال سچ ہے تو تم خیر خواہ شمار ہوگے اور سرکار کی طرف سے تمھاری ترقی اور بہت قدر ہوئے گی۔[29] بہر حال سید احمد کی رائے کا نواب محمود خاں پر کوئی اثر نہیں ہوا اور اب نواب نے ان تمام اہل کاران خیر خواہان کمپنی حکومت کے خلاف اپنا رویہ سخت کردیا جس کی وجہ سے سید احمد اور دوسرے اہلکاران دن رات اس فکر میں رہنے لگے کہ کسی صورت سے محمود خاں کے چنگل سے نکل جائیں، مگر یہ ممکن نہیں تھا۔[30]

محمود خاں کو انتظامیہ چلانے کے لیے روپیوں کی سخت ضرورت تھی۔ الیگزینڈر شیکسپیئر نے بجنور کے خزانہ کو کنویں میں ڈلوا دیا تھا تاکہ نواب اور دوسروں کے ہاتھ نہ لگے۔[31] نواب محمود نے کنویں سے خزانہ نکلوانا شروع کیا لیکن کنویں سے جو رقم برآمد ہوتی تھی وہ اتنی کم ہوتی تھی کہ نئی آزاد حکومت کے انتظامیہ کی ضروریات کی کفالت کر سکے۔[32] محمود خاں نے اب دوسرے ذرائع کی طرف توجہ کی۔ بہت سے یورپین اور انگریزی اہلکاران نے اپنی قیمتی اشیا بجنور کے مقتدر بینکرس جیسے جمعیت سنگھ، جودھ سنگھ، بانکے رائے بہاری لال اور دوسروں کے پاس حفاظت کے خیال سے رکھ دیے تھے۔ محمود خاں نے ان اشیا کو حاصل کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے جودھ سنگھ اور نین سنگھ نواب محمود خاں کے شدید مخالف ہو گئے۔[33] انھوں نے ہزاروں کی تعداد میں آدمیوں کو جمع کر کے جنگ کی تیاری کی۔ چودھری جودھ سنگھ چودھری نین سنگھ کو لے کر محمود خاں سے مصالحت کی گفتگو کے لیے گئے۔ 23 جون 1857 کو چودھریوں نے بہت سی گفتگو کے بعد گنگا جل اٹھایا کہ وہ نواب کے تابعدار رہیں گے۔ نواب محمود خاں کی جانب سے احمد اللہ خاں نے کلام اللہ پر قسم کھائی کہ چودھریوں کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی جائے گی۔ بہرحال یہ انتظام زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔ مالی دشواریوں میں گھرے نواب محمود خاں کو پیسوں کی شدید ضرورت تھی چنانچہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ لگان کی تحصیل پر زور دیا۔ اس کام میں نواب کے نو منتخب کردہ عمال نے بہت احتیاط سے کام نہیں لیا۔[34] دوسری طرف ہلدور، تاج پور، بڑہ پور اور شیر کوٹ کے راجپوت زمینداروں نے ادائگی میں لیت و لعل سے کام لینا شروع کیا۔ دریں اثنا نواب محمود کے ایک مقرر کردہ عامل ماڑے خاں[35] کو شیر کوٹ کے زمیندار امراؤ سنگھ سے بقایا لگان بارہ ہزار روپیوں کی وصولی کے لیے روانہ کیا گیا اور اس کی مدد کے لیے کمک بھی روانہ کی گئی۔[36]

محمود خاں کی قانونی طور سے پوزیشن 28 جولائی 1857 کو بہادر شاہ ظفر کے فرمان مل جانے کی وجہ سے کافی مضبوط ہو گئی۔ فرمان کے تحت محمود خاں کو ضلع بجنور کا حاکم تسلیم کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ وہاں سے لگان اور دوسرے ٹیکس وصول کریں۔[37] فرمان کی آمد کے بعد احمد اللہ خاں نے شیر کوٹ کے چودھری امراؤ سنگھ کے خلاف فوجی کارروائی کر کے 29 جولائی 1857 کو

ان کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ اس جارحانہ کارروائی میں دونوں فریق کا جانی نقصان ہوا۔ امراؤ سنگھ جان بچا کر فرار ہوگیا اور تاج پور میں اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں پناہ لی۔ [38] امراؤ سنگھ کے خلاف فوجی کارروائی نے ضلع کی تمام راجپوت برادری کو چوکنا کردیا۔ اپنے خلاف اسی قسم کی کارروائی کے خطرہ کے پیش نظر بجنور، دھام پور، تاج پور، ہلدور، شیر کوٹ وغیرہ کے راجپوت متحد ہوگئے اور انھوں نے نواب کی حکومت کے بجائے نرائن سنگھ اور جودھ سنگھ کی حکومت کا اعلان کردیا۔ [39] انھوں نے تقریباً 25 ہزار آدمیوں کو اپنے گرد جمع کرلیا۔ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کا چودھریوں کے پاس جمع ہونے میں افواہوں نے بہت زیادہ فتنہ پھیلایا ان کو یہ بتلایا گیا کہ مسلمانوں نے احمد اللہ خاں کی قیادت میں محمدی جھنڈا بلند کیا ہے تا کہ مسلمانوں کو چودھریوں کے خلاف استعمال کرے۔ [40] چودھریوں کی سخت اور مضبوط مخالفت نے احمد اللہ خاں کو بوکھلا دیا۔ انھوں نے چودھریوں سے مفاہمت کی ناکام کوشش کی۔ [41] احمد اللہ خاں کے پاس صرف دو ہزار کی جمعیت تھی اور بہت کم اسلحہ اور گولہ بارود تھا۔ اس کے لیے چودھریوں سے مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ چودھریوں نے 5 اگست 1857 کو جنگ کے بعد شیر کوٹ پر قبضہ کرلیا۔ فتح کی خوشی میں چودھریوں کے آدمی بے قابو ہوگئے اور انھوں نے مکانات اور عبادت گاہوں کو لوٹ لیا اور کئی لوگوں اور بچوں جن میں عورتیں بھی شامل تھیں ہلاک کردیا۔ [42] شیر کوٹ پر قبضہ کے بعد چودھریوں نے اپنی حکومت کا اعلان کیا: ”خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ بجنور اور ہلدور والوں کا،“ [43] اس اعلان کے ذریعہ چودھریان بھی نام کے لیے مجاہدین آزادی کے ساتھ رہے کیونکہ انھوں نے بادشاہ کی حاکمیت تسلیم کی تھی اور انگریزی حکومت کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

16 اگست 1857 کو مہاراج سنگھ ہلدور سے، نین سنگھ اور جودھ سنگھ چار ہزار کی جمعیت اور توپ خانہ کے ساتھ بجنور پہنچ گئے۔ [44] محمود خاں بے خبر رہے اطلاع ملتے ہی انھوں نے چودھریوں کی پیش قدمی روکنے کی کوشش کی ہر چند کہ اس کے پاس تین چار سو افراد کی جمعیت تھی۔ [45] بجنور کے جوار میں ”بجارہ“ میں فریقین کا مقابلہ ہوا، لیکن چودھریوں کی توپ کے سامنے محمود خاں کو

میدان چھوڑنا پڑا اور نجیب آباد چلے گئے۔[46] شیرکوٹ کی طرح بجنور لوٹ اور قتل غارت گری کا نشانہ چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ کی مستعدی اور اثر سے، نہ بن سکا۔[47]

محمود خاں اور چودھریوں کی لڑائی کا فائدہ برٹش اہلکاروں کو پہنچا جو سوری میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ فریقین کے درمیان اور زیادہ دشمنی اور تنازعہ بڑھنے پر وہ خوش تھے۔ چودھریوں کا محمود خاں کے خلاف فوجی اقدام اچانک اور صرف لگان کی وصولی کی وجہ سے نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی حکام چودھریوں کو محمود خاں کے خلاف اکسا رہے تھے۔ الیگزینڈر شیکسپیئر کے مراسلہ 7 اگست 1857 جو چودھریوں کے نام تھا اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس نے ضلع کا انتظامیہ حکم ثانی تک ان کے حوالہ کر دیا۔[48] 7 اگست کے مراسلہ میں چودھریوں کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ محمود خاں کے انتظامیہ کو نہ مانیں۔ بعد میں الیگزینڈر شیکسپیئر نے اس کو تسلیم بھی کیا کہ اس کا یہ قدم وفادار ہندوؤں کی طاقت مضبوط کرنی تھی یا دوسرے الفاظ میں ہندو اور مسلمان کے درمیان نفاق کو ترقی دینا تھا۔[49] شیکسپیئر کے اس قدم سے بجنور میں برسہا برس کے قائم فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر برا اثر پڑا۔ پہلے عالم یہ تھا کہ محمود خاں اور چودھریوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے یہاں مختلف عہدوں پر مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن اب صورت حال دوسری ہو چکی تھی۔ محمود خاں اور چودھریوں کی آپسی جنگ نے انگریزوں کی خواہش کو پورا کر دیا۔ لارنس لکھتا ہے:

> ''مسلمان اور ہندو جس قدر لڑیں گے وہ ہمارے حق میں مفید ہوگا۔ ان کو ایک دوسرے کو قتل کرنے دیجیے۔ دہلی کی فتح کے بعد یہ ہمارے لیے مشکل نہ ہوگا کہ پورے روہیل کھنڈ پر دوبارہ قبضہ کر لیں۔''[50]

نتیجہ یہ ہوا کہ دن بہ دن مجاہدین آزادی کے حوصلے اور ہمت جس سے ان کی قوت کو یکجا کر کے زیادہ بہتر اور تعمیری کام کیا جا سکتا تھا ضائع ہوتی گئیں۔

گو کہ محمود خاں کو شکست ہو گئی تھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے اپنی فوج کو دوبارہ منظم کیا تاکہ اپنی حاکمیت کو برقرار رکھ سکیں۔[51]

جب کہ یہ ردوبدل ہو رہے تھے، انگریزوں کے حلیف اہلکاران خاموشی سے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ بجنور پر چودھریوں کے قبضہ کے بعد بھی ان کی حالت میں کوئی

تبدیلی نہیں ہوئی۔ چودھریوں کی نگاہ میں بھی وہ مشکوک تھے اور ان کو ضلع سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔[52] انھوں نے بہر حال اپنے برطرف مالکان کو بجنور میں ہونے والے واقعات سے باخبر رکھا۔[53]

دل چسپ بات یہ ہے کہ دوسری جانب انگریز حکام یہ نہیں پسند کرتے تھے کہ ضلع میں چودھریوں کی قوت بڑھے 13 اگست 1857 کو ولسن، ڈسٹرکٹ جج اور اسپیشل کمشنر نے سید احمد خاں اور محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر کو ہدایت دی کہ وہ چودھریوں سے ضلع کے انتظامیہ کا چارج لے لیں۔ اس نے امراؤ سنگھ کو ایک نہایت مفسدانہ خط لکھا جس میں ضلع بجنور کے ہندو رؤسا کی تعریف کرتے ہوئے ان کے مذہبی جذبات کو ابھارا اور صلاح دی کہ وہ سب متحد ہو کر بجنور سے ظالم نواب کی برطرفی کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ بغیر چودھریوں کی مزاحمت کے سید احمد خاں اور رحمت خاں نے ضلع کے انتظامیہ کو لے لیا۔ ان کو ہلدور، تاج پور اور قرب و جوار کے راجپوت زمینداروں کا پورا تعاون ملا۔ اگر راج پوت زمینداران اور محمود خاں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہوتے تو انگریزوں کے وفادار مسلمان حکام کو اتنی آسانی سے ضلع کا چارج نہیں مل جاتا۔ اس واقعہ کی طرف سر سید مسٹر ولسن کے خط کے حوالہ سے اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"رفعت و عوالی مرتبت گرامی قدر چودھری امراؤ سنگھ صاحب سلمہ الرحمٰن عرضی آپ کی مشعر حالات ظلم و بدعت نواب محمود خاں کے پہنچی۔ سب حال معلوم ہوا کمال افسوس و رنج ہے کہ آپ کا اس قدر نقصان عظیم ہوا اور شیو راج سنگھ اور قبیلہ اس کا قتل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کوئی آفت کسی شخص پر نازل نہیں کرتا کہ جس کے بعد تسلی نہ ہو۔ اگر اس قدر ظلم یعنی غارت گری و قتل عزیزان تمھارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب رؤسائے ہنود یک دل ہو کر کیونکر اس کو نکالتے۔ اب تم سب ہنود نے اتفاق کر کے اس ظالم نواب کو نکال دیا۔ اگر سابق سے بھی تمھارے باہم ایسا اتفاق ہوتا تو جس قدر باغی فوج اس نواح میں تھی اس کا مارا جانا کیا مشکل ہوتا اور پھر کیا ضرورت چلے آنے ہم لوگوں کی وہاں سے ہوتی اور ایسی آفات تم لوگوں پر کیوں آتیں۔ خیر سب امور اپنے وقت معینہ پر

منحصر ہیں اب بفضل خدا سب تکالیف تمھاری جلد رفع ہو جاتی ہیں۔ بطلب ہماری جو آپ لکھتے ہیں سو ہم نے واسطے جانے بجنور گورنمنٹ کو لکھا ہے اور شیکسپیئر صاحب بھی پہاڑ سے بلا لیے گئے ہیں اب عنقریب بندوبست فوج کا ہوتا ہے ہم تھوڑی سی فوج معتبر لے کر عنقریب آویں گے اور سید احمد خاں صدر امین اور رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر کو لکھا گیا ہے کہ تا پہنچنے ہمارے وہ انتظام وہاں کا اچھی طرح کریں گے۔"[53] اس خط میں بھی ولسن نے ہندو مسلم منافرت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال انگریز حکام کے فریبانہ رویہ سے چودھریوں نے یہی بہتر سمجھا کہ انتظامیہ کو سید احمد اور رحمت خاں کے حوالہ کر دیا جائے۔ سید احمد نے انتظامیہ کو ہاتھ میں لینے کے بعد رسل و رسائل کو بحال کر انگریز حکام سے میرٹھ اور مظفر نگر میں براہ راست رابطہ قائم کر لیا۔[54]

18 اگست 1857 کو پنڈت رادھا کشن، چودھری پرتاپ سنگھ اور رندھیر سنگھ، نین سنگھ وجودھ سنگھ میرن پور، مظفر نگر سے بیس میل دور جارج پامر سے ملے حسب معمول ان کی پوری ہمت افزائی کی گئی اور مستقبل میں انگریزوں کی پوری مدد کا یقین دلایا گیا۔[55] دریں اثنا یہ افواہ مشہور ہوگئی کہ محمود خاں نے بجنور پر چڑھائی کر دی ہے۔ خبر سنتے ہی رندھیر سنگھ کے علاوہ اور چودھریوں کے حواس جاتے رہے لیکن جلد ہی خبر کی تردید ہوگئی۔ بہر حال انگریز حاکمان بجنور محمود خاں کے خلاف یکے بعد دیگرے لوگوں کو اکسا رہے تھے۔ 19 اگست 1857 کو جارج پامر جاٹوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح سے جاٹ[56] اور راجپوت جن کے پاس ضلع بجنور میں بہت زمینیں تھیں محمود خاں کے خلاف صف آرا کر دیے گئے۔

محمود خاں ضلع کے حالات سے پریشان تھے لیکن وہ انگریزوں کے حلیف کو چین سے بیٹھا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ 27 اگست کو انھوں نے ہلدور پر ایک جنگ کے بعد قبضہ کر لیا۔[57] ہلدور اور تاج پور کے چودھریوں نے مل کر محمود خاں کو ہلدور سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔[58] محمود خاں نے ان کو 30 اگست کو شکست دی۔ اس ہار نے چودھریوں کو کمزور کر دیا اور دوسری طرف محمود خاں نے دوبارہ ضلع کے انتظامیہ پر اقتدار حاصل کر لیا۔ تاہم محمود خاں اس فتح کو پائیدار نہیں سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے چودھریوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کی۔[59] ان کا

اعتماد حاصل کرنے کے لیے وہ احمد اللہ خاں کی جگہ جلال الدین خاں کو مقرر کرنے پر آمادہ تھے کیونکہ چودھریان ماضی میں احمد اللہ خان کی جارحانہ سرگرمیوں سے سخت ناراض تھے[60] یہ انتظام بہر حال احمد اللہ خان کے معاونین کے سخت احتجاج اور مخالفت کی وجہ سے عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔[61] بہر حال احمد اللہ خاں کی قوت کو کم کرنے کے لیے محمود خاں نے ایک کونسل قائم کی جس میں احمد اللہ خاں، محمد احمد یار خاں، محمد شفیع اللہ خاں اور سید احمد شاہ کو مختلف ذمہ داریاں سونپی گئیں، کونسل کے فیصلوں پر بہر حال محمود خاں کی منظوری لازمی تھی۔ حکومت کے نئے نظام کے تحت فوجداری، دیوانی، نظامت اور محتسب فوجداری کی مہریں بنوائی گئیں اور ان کا نفاذ کیا گیا۔[62] ان مہروں سے واضح ہوتا ہے کہ محمود خاں نجیب آباد کو اپنی حکومت کی راج دھانی سمجھتے تھے۔

چودھریوں اور نواب محمود کے درمیان مکمل اتحاد قائم نہیں رہ سکا۔ سرسید لکھتے ہیں کہ چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ نے پھر محمود خاں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنی برادری کو مدد کے لیے خطوط لکھے۔ چودھری پرتاپ سنگھ سے بھی مدد مانگی۔ چنانچہ موضع بھسیڑہ میں پھر میدان کارزار سجا۔ چودھریان کانٹ اور نرائن سہائے مع جزائل چودھری پرتاپ سنگھ کی طرف سے چودھری گلاب سنگھ چکاری والا و دیگر زمینداران معہ بدھ سنگھ کی فوجی کمک کے ساتھ جمع ہوئے۔ ہلدور میں بھی بہت سے ہندو دین چودھریان جمع ہوئے اور نجیب آباد پر حملے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ احمد اللہ نے یہ خبر سن کر نگینہ اور کیرت پور سے فوج روانہ کی۔ 18 ستمبر 1857 کو فریقین کا مقابلہ موضع بڑھاولی کے قریب ہوا۔ چودھریوں کو شکست ہوگئی۔[63]

پیہم شکستوں نے چودھریوں کو گھبرا دیا تھا۔ محمود خاں سے نامہ و پیام کے بعد چودھری پرتاپ سنگھ اور چودھری امراؤ سنگھ رئیس شیرکوٹ سعد اللہ خاں کے ساتھ 26 ستمبر کو نواب محمود خاں سے ملے تھے۔[64]

اگرچہ نواب محمود خاں اور امراؤ سنگھ و پرتاپ سنگھ کے درمیان دوستی کی راہ بن گئی تھی لیکن نواب محمود کے بعض سرگرم اہلکاران جیسے غضنفر علی خاں اور ماڑے خاں غالبًا اپنی ناواقفیت اور بدلے کے جوش میں شیرکوٹ پر حملہ آور ہوگئے اور 26 ستمبر کو باوجود قاضی برہان الدین کی کوششوں

کے اس نے اکتیس ہندوؤں کو بے رحمی سے ہلاک کر دیا۔ [65]

ان واقعات کے بعد ماڑے کو بہت طاقت حاصل ہوگئی۔ اب اس کی نظر بجنور پر تھی۔ اس نے غضنفر خاں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ چاہا کہ احمد اللہ خاں کو بے دخل کر دیا جائے۔ کئی دنوں کی گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا کہ ملک جو محمود خاں کے قبضے میں ہے تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ محمود خاں کو بارہ ہزار روپے ماہانہ نقد دینا قرار پایا۔ تحصیل نگینہ و دھام پور اور چاند پور ماڑے اور غضنفر علی خاں کو دی جائے۔ تحصیل نجیب آباد و بجنور احمد اللہ خاں کے لیے معہ چار ہزار روپیہ ماہانہ طے ہوا۔ چند دنوں تک یہ بندوبست قائم رہا۔ [66]

گو کہ محمود خاں اور چودھریوں کے درمیان 26 ستمبر کو صلح قائم ہو چکی تھی لیکن اندرونی طور پر چودھریان اس مصالحت سے خوش نہ تھے۔ مصالحت کے بعد چودھری بدھ سنگھ اور چودھری مہاراج سنگھ میرٹھ پہنچے اور کمشنر سے کمک کی درخواست کی تاکہ نواب سے مقابل ہو سکیں۔ [67] انگریزوں سے گفت و شنید کے بعد بالآخر 17 اکتوبر کو کمک بھیجنے پر انگریز رضامند ہو گئے۔ چنانچہ رئیسان بجنور کے نام ایڈورڈ ظلپ ولیم کمشنر نے حکم نامے جاری کیے اور انتباہ کیا کہ اگر کوئی بھی باغیوں کی مدد کرے گا یا اس کی نوکری کرے گا تو مجرم سرکار ہوگا اور ان کی ساری جائیداد منقولہ وغیر منقولہ و زمینداری وغیرہ ضبط سرکار ہو جائے گی۔ [68] انگریزوں کی مدد کے وعدہ نے چودھریوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ ہلدور کے چودھریوں نے دوبارہ قرب و جوار اور اپنی برادری کے زمینداروں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بار ان کا ردعمل بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہا۔ شیر کوٹ کے چودھری امراؤ سنگھ خاموشی سے کاشی پور چلے گئے۔ [69] دریں اثنا چودھری بدھ سنگھ اور مہاراج سنگھ ایک فوج کے ہمراہ جس کی قیادت گلاب سنگھ اور گرسہائے کر رہے تھے دھنورہ پہنچے۔ [70] ماڑے خاں، احمد اللہ خاں اور شفیع اللہ خاں نے ان فوجیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ہلدور میں چودھری رندھیر سنگھ کی جمعیت باقی تھی۔ احمد اللہ خاں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ کئی دنوں کی لڑائی کے بعد 3 نومبر 1857 کو احمد اللہ خاں نے رندھیر سنگھ اور ان کے بعض قریبی رشتے داروں کو گرفتار کر لیا اور نجیب آباد لے آئے۔ ہلدور ایک بار پھر لٹا۔ [71]

ہلدور پر قبضہ نے محمود خاں کی پوزیشن مستحکم کردی۔ بظاہر اب ان کا ضلع میں کوئی طاقتور حریف باقی نہیں رہا تھا جو ان کے خلاف آواز اٹھاتا۔ دریں اثنا بہت سی باغی لیڈران جیسے دلیل سنگھ، قدم سنگھ گوجر، رضا حسن خاں قاضی عنایت علی (تھانہ بھون) گنگا پار کر کے بجنور میں پناہ لینے آگئے تھے۔ مرزا حاجی اور مرزا مبارک شاہ، دہلی کے دو مفرور شہزادے بھی نجیب آباد میں نواب محمود آباد کی پناہ میں آگئے تھے۔[72] محمود خاں کی طاقت بظاہر بڑھ گئی تھی اور اس کے ساتھ نئے سرگرم باغی شامل تھے۔ انھوں نے بجنور سے بڑھ کر سہارن کے علاقے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا جو پہلے ان کے دادا نجیب الدولہ کے علاقے میں شامل تھا۔ چنانچہ محمود خاں کی افواج نے کمپنی کے مقبوضہ علاقوں جیسے دھرم پورہ، میرن پور، اللہ آباد، بھوکر ہیرا اور مجاہد پور پر حملہ کر کے محمود خاں کے زیر اقتدار علاقوں میں شامل کرلیا۔[73] اپنی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر محمود خاں کی فوجوں نے میاں پور اور کنکھل (رڑکی کے قریب) تک حملے شروع کر دیے۔ کنکھل میں محمود خاں کی فوج نے میاں پور اور کنکھل کی مواصلاتی لائن منقطع کردی اور ایک یورپی آپریٹر کو گرفتار کرلیا۔[74] محمود خاں کی افواج نے مقبوضہ علاقوں پر ان کی حکومت کے قیام کا اعلان بھی کیا۔ بعدازاں محمود خاں کی فوج عام معافی کا اعلان کر کے ہردوار کی طرف بڑھی جہاں اس نے محمود خاں کی حکومت کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا۔[75] اس طرح باغی فوج نے 8 جنوری 1858 تک محمود خاں کی حکومت کو ہردوار تک وسعت دے دی تھی۔

محمود خاں اور اس کی افواج کی فتح بہر حال عارضی ثابت ہوئی۔ 8 جنوری 1858 کو میجر بارگیسن نے انگریزی فوج کی کمان سنبھالی اور میاں پور تک آ پہنچا۔ 9 جنوری 1858 کو ایک جاسوس کی مخبری پر کیپٹن ڈرمنڈ نے باغیوں کی فوج کو کنکھل نہر عبور کرتے وقت سخت شکست دی۔ بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالنے کے لیے اور مزید فوج تیار کرنے کی غرض سے محمود خاں نے 16 جنوری 1858 کو ضلع بجنور کے لیے حکم جاری کیا کہ وہ تمام معافی کی جاگیریں جو انگریزی کمپنی کے دور میں ضبط کرلی گئی تھیں معافی داروں کو واپس کردی جائیں گی۔[76] لیکن اس حکم کا غالباً کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔

ایک ماہ کے اندر انگریزی بھگوڑے حکام نے یہ فیصلہ کیا کہ ضلع پر طاقت کا استعمال کر کے قبضہ کر لینا چاہیے۔ ایک جانب انگریزی حکام ضلع پر بزور قبضہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے اور ایک کامیاب منصوبہ پر عمل درآمد کرنے کے لیے انھوں نے تمام بڑے زمینداروں اور ہندوستانی اہلکاران سے گفت وشنید کا سلسلہ رڑکی میں 21 فروری 1858 تا 22 مارچ 1858 جاری رکھا[77] تو دوسری جانب مجاہدین آزادی نفاق کا شکار ہو گئے تھے۔ 22 فروری کو محمود خاں نے حکومت کے تمام اختیارات احمد اللہ خاں کے حوالہ کر دیے تھے۔ اب وہ تمام فوج کا سربراہ اور محکمہ فوجداری کا اعلیٰ ترین حاکم تھا۔[78] اس کی مدد کے لیے دو نائب محمد شفیع اللہ خاں اور ماڑے خاں تھے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ماڑے خاں کو شیر کوٹ جس کی سالانہ آمدنی سترہ ہزار روپے تھی التمغا[79] میں دی گئی تھی۔ محمود خاں اور ان کے خاندان کے گذارہ کے لیے ماہانہ گذارہ بھتہ مقرر کیا گیا۔[80]

نئے انتظامات واضح طور پر مجاہدین آزادی کے زوال کی علامت تھے۔ اس وقت دہلی پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا اور ان کو مستقل طور پر پنجاب اور پہاڑی حکمرانوں سے مدد اور رسد مل رہی تھی۔ 13 اپریل سے انگریزی فوج اور اس کی ہمنوا سکھ فوج تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ 17 اپریل 1858 کی امباسوت کی جنگ میں انگریزوں نے مجاہدین آزادی کو شکست دے دی اور ان کی طاقت پر کاری ضرب لگائی۔[81] اٹھارہ اپریل کو برٹش فوج نجیب آباد پر قبضہ کر چکی تھی۔[82]

مجاہدین آزادی نے آخری لڑائی نگینہ سے شروع کی تھی لیکن انگریزوں کی فوجی برتری نے ان کو ناکام کر دیا۔ 26 اپریل 1858 تک ضلع بجنور مکمل طور پر انگریزوں کے قبضہ میں آ چکا تھا۔ جلال الدین خاں اور سعد اللہ کو گرفتار کر کے انگریزوں نے 23 اپریل 1858 کو کوٹ قادر پہ گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ محمود خاں اپنے چند رفقا کے ساتھ نیپال کی ترائی میں پناہ گزیں ہوئے۔[83] بنگال ہرکارو اپنی 28 جولائی 1858 کی اشاعت میں ان کی موت کی خبر دیتا ہے لیکن فصاحت اللہ خاں جو مجاہدین آزادی کے خاص مراسلہ نگار تھے اپنے مراسلہ میں وضاحت کرتے ہیں کہ

نواب محمود خاں کی موت ڈھوکر نزد بٹول نیپال میں ملیریا کی وجہ سے ہوئی تھی ہے۔[83]

انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت اٹھانے کے بعد سے محمود خاں کو چین سے رہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ ان کی قوتیں اور صلاحیتیں آپسی جھگڑوں کو سلجھانے اور حالات کو سنبھالنے میں صرف ہوتی رہیں۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود یہ امر قابل غور ہے کہ اس دوران محمود خاں نے ایک اچھے حکمراں، منتظم اور مستعد آدمی ہونے کا ثبوت دیا۔ باوجود یہ کہ ان کے پاس محدود وسائل تھے، انھوں نے ایک اچھی اور کارگر ج قائم کی جس کی تعریف ان کے مخالفین بالخصوص سرسید احمد خاں نے بھی کی۔ سرسید رقمطراز ہیں:

''نواب (محمود خان) کی فوج میں سب لوگ ملازم تنخواہ دار تھے اور اکثروں کے پاس بندوقیں تھیں اور وہ لوگ بندوق لگانی بھی جانتے تھے بلکہ بہت سے پٹھان بہت اچھے بندوقچی تھے اور تقریباً چالیس تلنگے نمک حرام فوج کے جس کا افسر رام سروپ جمعدار جیل خانہ تھا بہت عمدہ سپاہی قواعد داں تھے......سوار بھی نواب کے بہت اچھے تھے علی الخصوص چند سوار سرکاری رجمنٹوں کے جو وہاں موجود تھے وہ ہر طرح کی لڑائی جانتے تھے اور انھوں نے بہت سے سواروں کو اگر قواعد داں نہ بنایا تھا تو سپاہی ضرور کر لیا تھا۔[84]

1857 میں نواب محمود خاں اور چودھریوں کی لڑائیوں کی وجہ سے دوسرے سوشل گروپس جیسے جاٹ، بنگر اور گوجروں کو بھی اپنی ذاتی رنجشیں نکالنے کا موقعہ ملا۔ جاٹوں نے موضع کھاری کے امیر تاجروں کو اور بنگروں نے سواہیری کے تاجروں کو 6 اگست 1857 میں لوٹا۔ بنگروں نے ماڑے خاں کے ساتھ مل کر چودھریوں سے جنگ کی اور جاٹوں کو لوٹا۔[85] چھناور میں جاٹوں نے ایک امیر اور باعزت اصغر کو ہلاک کر کے پورے گاؤں کو لوٹ لیا۔[86] بنگروں نے نگینہ اور سواہیری کے امیر بشنوئیوں کو لوٹا۔ گوجروں نے بجنور لوٹنے کی کوشش کی اور وہاں کے مسلمانوں سے ان کا تصادم ہوا۔[87] تاہم یہ بات معنی خیز ہے کہ باوجود یہ کہ جانبین کے درمیان بے ہودہ اور بدترین قسم کے تصادم ہوئے دونوں جانب کے اعلیٰ سربراہان نے کافی بہادری، پامردی، استقلال اور برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آتشزنی اور لوٹ مار روکنے کی کوشش کی۔

مثال کے طور پر 17 اگست 1857 کو جب سواہیری اور رکھاری میں لوٹ مار ہوئی چودھریوں کے معاونین نے بجنور کو لوٹنے کی کوشش کی۔ نین سنگھ اور جودہ سنگھ نے مداخلت کرکے بلوائیوں کو روکا۔ [88] اسی طرح بدہ سنگھ نے بلوائیوں کو ہلدور کی مسجد تباہ کرنے سے روکا۔ [89] اسی طرح احمد اللہ خاں نے مسلمانوں کو تاج پور کا مندر توڑنے سے روکا [90] دونوں طرف ایسے افراد موجود تھے جو فریقین کے درمیان میل ملاپ کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ یہ چند مثالیں ہیں جس سے واضح ہے کہ نواب محمود خاں اور چودھریوں کا مناقشہ سیاسی تھا نہ کہ مذہبی۔ [91]

محمود خاں کی انتظامی صلاحیتوں اور ابتدائی کامیابیوں میں اس کا موثر نظام مواصلت اور مخبری بھی تھا۔ سید ظہیر الدین دہلوی لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کے سفر کے وقت وہ دہلی سے فرار کے بعد رات کو گنگا پار کرکے بجنور پہنچے۔ اس کی اطلاع نواب محمود خاں کو ہوئی تو انھوں نے نمبردار سے پوچھ گچھ کی اور بالآخر سب کو ان کے سامنے حاضر ہونا پڑا اور وضاحت کرنی پڑی کہ وہ دہلی کے تباہ حال پناہ گزیں ہیں۔ [92]

محمود خاں کی خوبیاں بہر حال انگریزوں کی منظم قوت کے سامنے بیکار تھیں۔ انگریزوں نے اپنی سیاسی تدبیروں سے بجنور میں 1857 کی جنگ آزادی کو بالآخر ناکام کردیا۔

حواشی:

1 سید احمد، سرکشی ضلع بجنور، مفصلا میسٹ پریس، آگرہ 1858، مرتبہ شرافت حسین مرزا، دہلی 1964، ص-139، آئندہ بحوالہ سرکشی۔

2. سرکشی، ص-139۔

3. سرکشی، ص-91۔

4. مارکس اینگلز، دی جرنل آف مارکس اینگلز، الہ آباد، صفحات 53-250

5 حافظ رحمت خاں کے پوتے خان بہادر خاں صدر امین کے عہدے سے سبکدوش ہو کر سرکاری پنشن پا رہے تھے۔ دیکھیے اٹکنسن، اسٹیٹسٹیکل، ڈسکرپٹیو اینڈ ہسٹاریکل اکاؤنٹ، جلد سوم ص-683، اسی طرح نجیب الدولہ کے خاندان کے احمد اللہ خاں 1857 میں نجیب آباد کے تحصیلدار تھے۔ اٹکنسن جلد سوم ص-683، حاشیہ سرکشی، ضمیمہ اول۔

6. اٹکنسن جلد سوم ص-683، حاشیہ

7. سرکشی، ص ص 35-134

8 سرکشی، صفحات 96-93

9 سرکشی، صفحات 101-100

10. سرکشی، ص-101

11 سرکشی، ص-103

12. لیٹر نمبر-108، مورخہ 12 اگست 1858، بنام کمشنر روہیل کھنڈ، ڈپارلسٹ XXXIV، میوٹنی ریکارڈز، یو۔ پی۔ اسٹیٹ آرکائیوز، لکھنؤ۔ سر سید بہر حال تحریر کرتے ہیں کہ پہلے محمود خاں قیادت کے لیے راضی نہیں تھے۔ سرکشی، ص-105

13 سرکشی، صفحات 07-106

14. سرکشی، صفحات 110-108

15. سرکشی، صفحات 34-133

16 سرکشی، صفحہ 135

17. سرکشی، ص 36-135

18 سرکشی، ص-137

19 ملاحظہ ہو رضوی، فریڈم اسٹرگل، جلد دوم، صفحات 68-438

20 سرکشی، صفحات 41-140

21 سرکشی، ص-141

22 سرکشی، ص -141

23 سرکشی، 141

24. سرکشی، صفحات 42-141

25 سرکشی، صفحات 53-152

26. سرکشی، ص-142

27. محمود خاں کا پروانہ مورخہ 17 جون 1857، سرکشی، ص-144
28. سرکشی۔ 144
29. سرکشی، ص-145
30. سرکشی، ص-46-145
31. سرکشی، ص-110
32. سرکشی، ص-146
33. سرکشی، ص-47-146
34. سرکشی، ص-53-151
35. ماڑے خاں کے اجداد کے پاس شیرکوٹ کی نصف زمینداری تھی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ حالات قلمی ماڑے خاں، بحوالہ سرکشی، صفحات-51-150 نوٹ اور ص-343
36. سرکشی، ص ص-56-155
37. سرکشی، صفحات-58-156
38. سرکشی، صفحات، 61-160، میلی سن اس قضیہ کو فرقہ وارانہ قرار دیتا ہے۔ دیکھیے ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی، جلد سوم لندن 1880-
39. سرکشی، ص 176 پر سرسید لکھتے ہیں کہ چودھریوں کی سرداری کے الفاظ تھے" خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، اور حکم چودھری نین سنگھ اور جودھ سنگھ کا" 40 سرکشی، ص ص 69-168
41. سرکشی، صفحات 72-170
42. سرکشی، ص 176، سرسید کے مطابق، اس لڑائی سے پہلے ضلع میں درمیان ہندو اور مسلمان کے کچھ تنازعہ یا عداوت مذہبی نہ تھی۔ سرکشی، ص ص 65-164
43. سرکشی، ص 176
44. سرکشی، ص 174
45. سرکشی، ص 173
46. سرکشی، ص 174
47. سرکشی، ص 177
48. سرکشی، ص 177، 182
49. خط نمبر 106، میوٹنی ریکارڈز (بجنور) ڈیپارٹمنٹ XXII، یو پی سیکریٹیریٹ آرکائیوز، لکھنؤ، سرکشی، صفحات 63-162، میلسن، جلد سوم ص-411
50. فارن ڈیپارٹمنٹ (انڈیکس نمبر 59-1850) ساسے۔ پی، جلد اول، نمبر شمار 14، بجنور (ایس پی نمبر 8-2، مارچ 1858) نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی۔
51. سرکشی، ص 165
[illegible] سرکشی، صفحات 85-183
53. ولسن کا پروانہ بنام چودھری امراؤ سنگھ مورخہ 14 اگست 1857۔ یہ ایک مفصل خط ہے جس میں ولسن نے امراؤ سنگھ کو ہدایت دی تھی۔ "پٹھان لوگ اس وقت ہر جگہ پر لوٹ مار کے لیے تیار ہیں کہ وہ آدمی چاروں طرف پھیل جاؤ اور بیچ میں بدستور موجود م

کا چھوڑ دو اور چاروں طرف سے ایک ہی وقت گولہ اندازوں پر حملہ کرو جب وہ توپ چلا چکیں۔ جب توپ پچاس قدم رہ جائے تب گویا تمہارے ہاتھ لگ گئی۔" سرکشی، صفحات 191-190

54 سرکشی، ص 198
55. سرکشی، ص 201
56. جاٹوں کے پاس بارہ فیصدی مالکانہ حقوق تھے اور وہ اٹھارہ فیصد زمین پر قابض تھے جبکہ وہ صرف تیرہ فیصدی لگان ادا کر رہے تھے۔ دیکھیے ایٹکنسن جلد سوم صفحہ 342
57 سرکشی، ص ص 255-254۔ اس لڑائی کے بعد محمود خاں کی فوج کی واپسی کے فوراً بعد بجنور میں سخت خون خرابا ہوا۔ سرکشی، صفحات 46-245 اور 48-247
58. سرکشی، صفحات 43-242
59. سرکشی، ص 255، اور صفحات 62-361
60 سرکشی، ص 255
61. سرکشی، ص 57-256
62 سرکشی، ص ص 60-256
63. سرکشی، صفحات 61-260
64. سرکشی، صفحہ 264
65. سرکشی، ص 266
66. سرکشی، صفحات 65-264
67. سرکشی، ص 266
68 سرکشی، صفحات 268-266
69. سرکشی، صفحات 70-268
70. سرکشی، ص 270
71. سرکشی، صفحات 72-271
72 سرکشی، صفحات 74-273
73 سرکشی، ص 275
74 سرکشی، ص 276
75 سرکشی، صفحات 76-275
76. سرکشی، صفحات 282، 91-290
77 سرکشی، صفحات 84-283
78. سرکشی، صفحات 283 اور 287، ملیسن، جلد سوم، ص 416
79. التمغا جاگیر تورہ چنگیزی کے تحت جہانگیر نے ہندوستان میں رائج کیا تھا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، تزک جہانگیری، ترجمہ راجرس اینڈ بیورج، جلد اول، نئی دہلی 1978، صفحات 23۔ بڑے خاں کو التمغا جاگیر کسی بادشاہ نے نہیں بلکہ محمود خاں کی چھوٹی سی حکومت نے دی تھی۔
80. ملیسن، جلد سوم، ص 416، سرکشی، صفحات 89-286

81. سرکشی، ص-300
82. سرکشی، ص 298
83. سرکشی، ص 2-301
84. فریڈم اسٹرگل ان یو۔ پی، جلد پنجم، ص-580
85. سرکشی، ص 178
85. سرکشی، ص 238
86. سرکشی، ص 277
87. سرکشی، ص 177
88. سرکشی، صفحات 78-176
89. سرکشی، ص 165
90. سرکشی، ص 163
91. بجنور کے لوگوں کا بھی یہی خیال تھا اور وہ نواب محمود خاں اور چودھریوں کی لڑائیوں کو ہندو۔ مسلم لڑائی نہیں سمجھتے تھے۔ سرکشی، ص 101
92. طرازِ ظہیری مرتبہ افغان اللہ خاں، گورکھپور-2003، ص 50-149

اقبال حسین

1857 کی جنگ آزادی کا ایک عظیم مجاہد—
کنور سنگھ

1857 کی جنگ آزادی میں کنور سنگھ کا حصہ لینا انگریز افسران کے لیے ایک بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ پروفیسر کے کے دتا جنھوں نے کنور سنگھ کی حیات پر ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ انگریز افسران اور مورخین کی آرا پر تفصیلی بحث کی ہے۔[1] یہاں میں مختصراً ان آرا کا ذکر کرنا چاہوں گا تا کہ یہ سمجھا جاسکے کہ بالآخر کنور سنگھ نے انگریزوں کی وفاداری ترک کر کے بغاوت کا علم کیوں اٹھایا تھا۔ انگریزوں کے اہم افسران میں ولیم ٹیلر، کمشنر پٹنہ، کنور سنگھ سے قریبی تعلق رکھتے تھے، کنور سنگھ کی بغاوت کی خبر سن کر حیران ہوگئے۔ انھوں نے کنور سنگھ کی بغاوت کے لیے بورڈ آف ریونیو کے غلط فیصلوں کو ذمہ دار قرار دیا جن کے ذریعہ کنور صاحب کی ریاست میں ان کے اثرات کو کم کر کے، ریاست کے انتظامیہ پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔[2] مورخ میلیسن اور کے بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔[3]

ای اے سا مویلز جنھوں نے ٹیلر کے بعد پٹنہ میں کمشنر کا عہدہ سنبھالا تھا الزام لگاتے ہیں کہ کنور سنگھ نے ٹیلر کی زیادتیوں کی وجہ سے ہتھیار اٹھائے تھے۔[4]

دتا ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں کہ کنور سنگھ نے جنگ آزادی میں حصہ مجاہدین آزادی کے دباؤ میں آ کر لیا تھا کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو جگدیش پور کے لوٹ لیے جانے کا خطرہ تھا۔

یہاں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ سا سویلز اور ان کے بعد دوسروں کے نظریات پر بہت بھروسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انھوں نے یہ نظریات کنور سنگھ کی بغاوت فرو ہو جانے کے عرصہ بعد پیش کیے تھے۔ دتا سے بھی اتفاق کرنا مشکل ہے کہ کنور سنگھ کا جنگ آزادی میں شریک ہونا ''اچانک'' فیصلہ نہیں تھا اور یہ کہ ''ان کا مقصد انگریز حکمرانوں کی قوت پر حملہ کرنا تھا جس کے لیے وہ جنگ آزادی کے شروع ہونے سے پہلے ہی وہ سوچ رہے تھے۔[6] 1857 کی بغاوت جو فوجیوں کی چربی آمیز کارتوس کے ردعمل میں تھا، مشکل سے ہی کنور سنگھ نے پہلے سوچا ہوگا۔ بلاشبہ ٹیلر کا بیان جو بغاوت کے بعد کا ہے کہ ''کنور سنگھ وفادار اور نمک حلال'' تھا ظاہر کرتا ہے کہ ابتدا میں یعنی 1857 کی جنگ آزادی شروع ہونے سے پہلے کنور سنگھ کے انگریزی حکومت سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ کنور سنگھ نے 27 اگست 1857 تک انگریزوں کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے تھے۔ 27 اگست کو دانا پور سے باغی فوجیوں کی ٹکڑی آرہ پہنچی تھی۔ چندریکا پاٹھک نے ہندی میں ایک مضمون 1922 میں شائع کیا تھا جس میں انھوں نے غالباً روایت کی بنا پر لکھا تھا کہ کنور سنگھ نے باغی فوجیوں کی قیادت اس لیے قبول کی تھی تا کہ وہ جگدیش پور کے عوام کو ان کی لوٹ مار سے بچا سکیں۔[7] اس روایت کو دتا نے تسلیم کرلیا۔ بہرحال 1857 میں باغی فوجیوں نے یہ طریقہ اور مقامات پر بھی اختیار کیا تھا اور سربرآوردہ افراد جیسے بہادر شاہ ظفر اور خان بہادر خاں کو قیادت کے لیے مجبور کیا تھا۔[8] باغی فوجیوں کے اس انتخاب کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایسے افراد کی قیادت چاہتے تھے جن کی شہرت، عزت، وقار اور اثر قرب وجوار کے علاقوں میں موجود ہو اور جن کا احترام بالعموم عوام کرتے ہوں۔ بہار میں بالخصوص آرہ اور قرب وجوار میں کنور سنگھ کی واحد شخصیت تھی جو عوام میں مقبول تھی۔ بہرحال کنور سنگھ نے باغی فوجیوں کے دباؤ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اس مسئلے کو بالکل جمہوری انداز میں ایک مجلس کے سامنے پیش کیا جس میں ان کے دوست، اہل خاندان، اہم افسران ریاست اور دوسرے نمائندین موجود تھے جن میں امر سنگھ (برادر کنور سنگھ) روپ بھنجن سنگھ (بھتیجہ کنور سنگھ) کرشنا پرساد سنگھ، پرمیشور سنگھ، دتا سنگھ، کاشی ناتھ اگروال (دیوان) نارائن داس اگروال (نائب دیوان)، ہرے کرشن بھدوریہ، شوبھ ناتھ سنگھ، رام

دھاری سنگھ، شیو مشرا۔ اور بھیکا اوجھا قابل ذکر ہیں۔ اس مجلس میں آزادانہ بحث ومباحثہ کے بعد، باوجودیکہ امر سنگھ نے مخالفت کی تھی، کنور سنگھ کو ــ آزادی میں حصہ لینے کی قیادت سونپی گئی تھی۔" امر سنگھ کا موقف تھا کہ باغی فوجیوں کا ساتھ نہ دیا جائے۔[9] بہرحال اکثریت کی رائے کا احترام کرتے ہوئے امر سنگھ بھی کنور سنگھ کے شریک ہو گئے۔ امر سنگھ بھی عوام میں مقبول تھے۔ ہر چند کے وہ مجلس کے فیصلہ سے متفق نہ تھے، جمہور کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے وہ انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کو تیار ہو گئے۔ اس کے علاوہ آرہ کے گردونواح کی سماجی حالت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جس نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی راہ ہموار کی۔ غالباً اونچی ذات کے لوگوں میں انگریزوں کی سماجی اصلاحات کی وجہ سے ناراضگی بھی بغاوت کا ایک سبب تھی۔ بخانین (Buchanan) اپنی شاہ آباد کی روداد میں لکھتا ہے کہ وہاں ستی کی رسم عام تھی۔ یہ صرف اونچی ذات کے لوگوں تک محدود نہیں تھی۔[10] وہ مزید لکھتا ہے کہ اس علاقے میں مسلمان اور نچلی ذات کے لوگ جیسے مُسہر بھی ستی کرتے تھے۔[11] اس طرح ہمیں مذہبی اسباب کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ دی ہندو پٹریاٹ نے اپنی 6 اگست 1857 کی اشاعت میں ایک معنی خیز خبر شائع کی تھی:
"وہ (کنور سنگھ) بھوج پور والوں میں بہت اثر رکھتا ہے جن کی بڑی تعداد فوج میں ہے۔ وہ بہار میں ہندو مذہب کا مسلمہ اور تسلیم شدہ محافظ ہے اور اعلیٰ ذات کے ناراض لوگوں کا نمائندہ ہے جسے لوگوں (یعنی باغیوں) نے ساتھ لانے کی تمام کوششیں کیں۔[12] داناپور کے فوجیوں کی ناراضگی بلاشبہ کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی کی آمیزش تھی جس کے استعمال سے ان کی ذات برباد اور مذہب خراب ہو جاتے۔ بہرحال کنور سنگھ کی بغاوت کے لیے اور بہت سی وجوہات تھیں۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ 1857 میں کنور سنگھ نے جب آزادی کا علم اٹھایا تھا تو ان کی عمر اسی برس کی تھی۔ بوڑھاپے کی اس منزل میں کنور سنگھ کا فیصلہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ دنیاوی طمع میں نہیں بلکہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور ملک کے تحفظ کے لیے بغاوت میں شامل ہوئے تھے۔ ان کے استقلال اور پختہ ارادہ کی داد دینی پڑے گی کہ ابتدا سے آخر تک وہ اپنے موقف پر جمے رہے۔

کنور سنگھ نے اپنی طاقت مضبوط کرنے کے لیے قرب و جوار کے راجاؤں اور نوابوں سے رابطہ قائم کرنے کے لیے اپنے بھائی امر سنگھ کو ہدایت دی۔ چنانچہ انھوں نے راجہ ہردت (بوندی) راجہ مہیش سنگھ (کالپی)، راجہ ڈگ وجے سنگھ (مہونہ) راجہ بینی پرساد (شنکر گڑھ) رام بخش سنگھ (ڈوریا کھیری) راجہ درگا پرساد (چھروکا)، گلاب سنگھ (پرتاپ گڑھ)، رام غلام سنگھ (اہٹا)، چودھری داتا سنگھ (اناؤ)، راجہ ارجن سنگھ (دورابارا کھیری)، راجہ تولی سنگھ (تلسی)، راجہ جوت سنگھ (چہروا، بہرائچ)، راجہ دان بہادر ساہی (بنکا اور تلسی پور)، راجہ ادوے پرتاپ سنگھ (اکناوا)، راجہ دیبی بخش سنگھ (گونڈہ) راجہ لال سنگھ (متوفیق آباد)، سلطان پور خاص کے ملکی داران، راجہ ناگر (گورکھپور) راجہ بہادر خاں (تانپارہ) اہٹ (سلطان پور) کے خانہ زادگان، راجہ ستاسی، راجہ نرہر پور، راجہ شاہ پور اور بیگم حضرت محل وغیرہ کو خطوط لکھے۔[13] اس فہرست سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کنور سنگھ کا تعلقہ داروں، نوابوں اور راجاؤں سے کیسا تعلق رہا ہوگا۔ ان میں زیادہ تر 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف محاذ آرا تھے۔

داناپور سے باغی فوج کی ٹکڑی نے آرہ میں داخل ہوکر غیر ملکی علاقتوں پر حملے شروع کیے۔ انھوں نے جیل پر حملہ کرکے چار سو قیدیوں کو آزاد کرادیا اور خزانہ پر حملہ کرکے لوٹ لیا۔ جلدی ہی باغی فوج کے ساتھ مقامی محافظ اور سیکڑوں کی تعداد میں انگریزی فوج سے بغاوت کرکے فوجیوں اور دوسرے فوجی جو رخصت پر آئے ہوئے تھے بغاوت میں شامل ہوگئے۔ اب باغی فوج کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ کنور سنگھ کی اپنی فوج جو تین ہزار افراد پر مشتمل تھی ان فوجیوں کے ساتھ مل گئی۔[14] خزانہ لوٹنے کے بعد باغی فوج نے آرہ میں انگریزوں کی محافظ فوج پر حملہ کردیا جو بہت اچھی طرح اپنا مضبوط دفاعی مورچہ بنائے ہوئے تھی۔ ان کے پاس گولہ بارود اور اشیائے خوردنی کی کمی نہیں تھی۔ اس مورچہ کی دفاع کی کمان ویک، مجسٹریٹ آرہ نے سنبھال رکھی تھی۔[15] باغی فوج نے انگریزی فوج کا محاصرہ کرلیا جس کی وجہ سے کمپنی کے افسران بہت پریشان ہوگئے۔ انھوں نے محصورین کی مدد کے لیے 400 فوجیوں کی ایک ٹکڑی جس میں ڈیڑھ سو انگریز اور یورپین اور پچاس سکھ تھے کپتان ڈنبر کی قیادت میں بھیجی۔[16] لیکن

ڈنبر کو باغی فوج نے 19 جولائی 1857 کو شکست دے دی۔ ڈنبر چند دوسرے انگریز افسروں کے ساتھ مارا گیا۔[17] کنور سنگھ نے شکست خوردہ فوج کا تعاقب کر کے ایک اور شکست دی۔[18]

انگریزی فوج کی شکستوں نے کنور سنگھ کی قیادت کو مزید مستحکم کیا۔ ان کے ساتھ اور بہت سے انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے شامل ہوگئے۔ آرہ سے انگریزوں کے راج کے خاتمہ کے بعد کنور سنگھ نے انتظامیہ کو دوبارہ منظم کرنے کی طرف توجہ دی۔ شاہ آباد کا پورا علاقہ ان کے قبضہ میں تھا۔ انھوں نے اپنی آزاد ریاست کا اعلان کرتے ہوئے نیا انتظامیہ قائم کیا جو بقول سامویلز اسی طرح کا تھا جو انگریزوں نے بنا رکھا تھا۔ انھوں نے ہری کرشن سنگھ کو دیوان مقرر کیا مگر ساتھ ساتھ ان کو فوج کا اعلیٰ افسر برقرار رکھا۔ کنور سنگھ نے نئے تھانے قائم کیے۔ آرہ میں شیخ غلام یحییٰ تھانہ دار اور مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ ملکی ٹولہ کے محمد عظیم الدین کو مشرقی تھانہ کا جمعدار مقرر کیا گیا۔ تراب علی خاں اور خادم علی خان، جو شیخ علی دیوان کے بیٹے تھے دونوں تھانوں کے کوتوال بنائے گئے۔[19]

کنور سنگھ اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد آرہ میں چین سے نہیں رہ سکے۔ انگریزی فوج کے میجر ونسنٹ آیر، 2 اگست 1857 کو محصور انگریز فوج کی مدد کے لیے آیا۔ بی بی گنج میں ایک سخت معرکہ کے بعد آیر نے محصورین کو آزاد کرا لیا۔ اس فتح کے بعد میجر آیر نے آرہ کے لوگوں پر سخت انتقامی کارروائی کی۔ بہت سے مجاہدین آزادی کو پھانسی دے دی گئی۔[20] آرہ سے میجر آیر کنور سنگھ کے گاؤں جگدیش پور کی طرف بڑھا اور 21 اگست 1857 کو کنور سنگھ سے ایک زبردست جنگ کے بعد اس نے جگدیش پور پر قبضہ کر لیا۔[21] کنور سنگھ کے مکان کو مسمار کر دیا گیا اور جگدیش پور کے لوگوں کے ساتھ بربریت کا سلوک کیا گیا۔ تمام اہم عمارتیں معہ نو تعمیر مندر کو جو کنور سنگھ کے مکان میں تھا، ڈھا دیا گیا۔[22]

گو کنور سنگھ کے ہاتھ سے آرہ اور جگدیش پور نکل چکے تھے، اس مجاہد آزادی کی ہمت اور استقلال میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کنور سنگھ کی شخصیت اور شہرت کی وجہ سے ان کے گرد لوگوں کی جماعت جمع ہوتی رہی جس میں زیادہ تعداد فوجیوں کی تھی جو دانا پور کے علاوہ دوسرے مقامات سے

آ رہے تھے۔ [23] اس کے علاوہ کنور سنگھ کا راج پوت ہونا قرب و جوار کے راجپوتوں کے لیے باعث فخر تھا اور نہ صرف گردونواح کے راجپوت بلکہ دور دراز سے راجپوت کنور سنگھ کی حمایت میں یکجا ہو رہے تھے۔ [24] دریں اثنا انگریزی فوج نے کنور سنگھ کو گرفتار کرنے کے لیے ان کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ کنور سنگھ آرہ چھوڑ چکے تھے۔ وہ 24 اگست کو سہسرام میں تھے۔ وہاں سے وہ 26 اگست کو مرزا پور ہوتے ہوئے مورخہ 26 اگست کو باندہ کی طرف بڑھے جہاں 29 اگست کو پہنچے۔ غالباً ان کا ارادہ دہلی جا کر انگریزوں سے جنگ کرنا تھا، لیکن دن بہ دن دہلی میں مجاہدین آزادی کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ 20 ستمبر 1857 کو دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضہ کے بعد کنور سنگھ نے اپنی جنگی حکمت عملی میں تبدیلی کی۔ وہ باندہ سے نکل کر راجہ ریواں کی طرف بڑھے جو غالباً ان کے رشتہ دار تھے۔ راجہ ریواں نے کنور سنگھ کے بجائے انگریزوں کی دوستی کو اہمیت دی اور کیپٹن اوس برن کو اطلاع دے دی جو انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ راجہ نے کنور سنگھ کو کوئی مدد دینے سے انکار کرتے ہوئے اپنا علاقہ چھوڑ کر جانے کی صلاح دی۔ [25]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راجہ ریواں کے دربار میں کنور سنگھ کی حمایت کرنے والا ایک مضبوط گروپ موجود تھا۔ انھوں نے راجہ کو صلاح دی کہ اسے کنور سنگھ سے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کرنی چاہیے۔ [26] لیکن انگریز ایجنٹ اوسبرن، کنور سنگھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا، راجہ ریواں پر بھی اس کا بڑا دباؤ تھا۔ اس نے راجہ ریواں کو صلاح دی وہ بڑھ کر کٹرہ، سوہاگی، ہوپور اور بری گھاٹ کے دروں کے ذریعہ کنور سنگھ کے ریواں میں داخلہ کو روک دے۔ راجہ نے اوسبرن کی ہدایت پر خوشی سے یا مجبوراً عمل کیا اور دروں پر تدارک کی انتظام کر کے ریواں لوٹ آیا۔ اس نے اپنے معتمد ماتحتوں کو جن میں حشمت علی اور ہر چند قابل ذکر ہیں اس کام پر مامور کیا تھا لیکن ان دونوں اہل کاروں نے کنور سنگھ کو بغیر کسی مزاحمت کے ریواں میں داخل ہو جانے دیا اور بعد میں دونوں کنور سنگھ کی فوج میں شامل ہو گئے۔ [27] راجہ ریواں کی انگریز نواز پالیسی کی وجہ سے ریواں کنٹنجنٹ کے فوجیوں کو برہم کر دیا جن کی تمام ہمدردیاں باغی فوج اور کنور سنگھ کے ساتھ تھیں۔ ان لوگوں نے ریواں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن کنور سنگھ نے ان لوگوں کو منع کر دیا۔ راجہ ریواں

ان حالات کو دیکھ کر بوکھلا گیا اور بھاگ کر پہاڑی پر واقع بندوگڑھ کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اوسبرن اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے پاس فوجی طاقت بھی نہیں تھی۔ تاہم اس نے اس بری حالت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سیاسی حکمت عملی سے کام لے کر باغی فوجیوں کے اندر اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ریواں کے دیہی علاقوں میں اپنے کرایہ کے آدمیوں کے ذریعہ کنور سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا کہ کنور سنگھ اور ان کے ساتھی اس علاقہ میں باہر سے گھس آئے ہیں۔ اس کے ایجنٹ کنور سنگھ کی فوج میں بھی شامل ہو گئے اور ریواں پر حملہ کے خطرات کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔[28] کیمبل لکھتا ہے کہ اس پروپیگنڈہ کا اثر کنور سنگھ پر پڑا۔ چنانچہ انھوں نے علاقہ چھوڑ کر شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔[29] راستہ میں کنور سنگھ کی فوج میں ناگوڈ کے باغی سپاہی جن کا تعلق پچاسویں اور باونویں رجمنٹ سے تھا شامل ہو گئے۔[30] ناگوڈ سے پیش قدمی کرتے ہوئے کنور سنگھ کالنجر ہوتے ہوئے باندا کی طرف آئے۔

> کنور سنگھ کی نقل و حرکت دل چسپ اور پر جوش تھی اور کہا جاتا ہے کہ کان پور کے قریب جنرل ونڈھم (31) کی فوج کو شکست دینے میں گوالیار کنٹنجنٹ کی مدد اور کنور سنگھ کی فوج بھی شامل تھی۔ (32) کھلے میدان میں انگریزوں کی یہ سب سے بڑی شکست تھی جو مجاہدین آزادی نے دی۔ ونڈھم کی ہار کے بعد بھی انگریزی فوج کنور سنگھ کے تعاقب میں رہی۔ کنور سنگھ بار بار انگریزوں کو چکما دے کر آگے بڑھتے ہوئے اپنے بھوجپوری فوج کے ساتھ اعظم گڑھ کی طرف بڑھے۔ غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ کنور سنگھ کا یہ قدم اس لیے تھا کہ اودھ کے مشرق میں جتنے علاقے تھے وہ تقریباً انگریزی فوج سے خالی تھے۔ کنور سنگھ فوجی حکمت عملی کے تحت اترولیہ (اعظم گڑھ) کی طرف بڑھے جہاں ان کی فوج میں اور باغی فوجی شامل ہو گئے۔ راستے میں ان کا سامنا انگریزی فوج سے ہوا۔ مجبور ہو کر انگریزی فوج کو ہٹنا پڑا کیونکہ ان کی تعداد کم تھی۔ انگریزی فوج نے کمک کے لیے پیغامات بھیجے۔ (33) انگریزی فوج کی پسپائی نے اعلیٰ حکام کو بوکھلا دیا تھا۔ کنور سنگھ کی نقل و حرکت اتنی تیز تھی کہ انگریز حکام اور فوجی افسران حیران تھے ان کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کنور کب اور کدھر کا رخ کریں گے۔ کنور سنگھ کو ہر طرف سے

گھیرنے کی کوشش کی گئی۔ کلکٹر اعظم گڑھ میں انگریزوں نے مزید کمک طلب کی۔ قرب و جوار کے اضلاع گورکھپور، چھپرہ، جون پور، غازی پور کے انگریز حکام کو ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ کنور سنگھ کی نقل و حرکت پر پوری نظر رکھیں۔ (34) انگریزوں کی کڑی نگرانی کے باوجود عوامی تعاون اور ہمدردی کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے سفر کرتے رہے۔ ان کی فوج ان کے ساتھ تھی۔ گردونواح کے عوام کی پوری مدد ان کو حاصل تھی۔ آر، ڈیوس اپنے 23 اپریل 1858 کے خط بنام کمشنر بنارس لکھتا ہے: "کنور سنگھ کو لوگ بخوشی سامان فراہم کر رہے تھے۔ نچلے طبقے کے لوگ بھی جوش و خروش کے ساتھ اس کو تعاون دے رہے تھے۔(35) بہر حال انگریزوں کی فوجی حکمت عملی نے کنور سنگھ کے گرد حصار تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ کنور سنگھ اس بدلتی صورت حال سے باخبر تھے۔ وہ غازی پور میں انگریزی فوج کی نقل و حرکت سے پوری طرح باخبر تھے۔(36) اس باخبری نے ان کو انگریزوں سے کسی بھی وقت مقابلے کے لیے ان کو تیار رکھا تھا۔ کنور سنگھ کی انگریزی فوج سے زبردست جنگیں غازی پور اور اعظم گڑھ میں ہوئیں۔ یہ امر قابل تحسین ہے کہ کنور سنگھ انگریزوں سے مستقل جنگوں میں باوجود شدید طور پر زخمی ہونے کے اور انگریزوں کی نگرانی کے باوجود 21 اپریل 1858 کو گنگا عبور کر کے اپنے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ کمشنر بنارس نے سکریٹری، گورنمنٹ آف ان ڈبلو پراونسز کو اپنے مراسلہ مورخہ 23 اپریل 1858 یہ اطلاع دی کہ 21 اپریل 1858 کو کنور سنگھ اپنی فوج کے ساتھ شیر پور گھاٹ (یا شیو پور گھاٹ) سے گنگا پار کر کے دوسری طرف چلے گئے تھے۔ گنگا کے دائیں کنارے والوں نے ان کی پوری مدد کی اور گنگا عبور کرنے کے لیے کشتیاں فراہم کی تھیں۔ کنور سنگھ سخت زخمی تھے۔ ان کا ایک بازو جنگ میں کٹ چکا تھا اور وہ بہت زخمی تھے۔ 23 اپریل 1858 کو کنور سنگھ جگدیش پور میں دو ہزار فوج کے ساتھ موجود تھے۔ گو کہ وہ جان لیوا زخم کا شکار تھے ان کی ہمت اور استقلال میں کوئی کمی نہیں تھی۔ بہر حال مستقل جنگی مصروفیتوں، مہلک زخموں، تکان اور ضعیفی نے ان کی زندگی مختصر کر دی۔ انگریزی فوج اب بھی تعاقب میں تھی۔ کنور سنگھ جگدیش پور کے گردو پیش جنگلوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ کپتان لی، گرینڈ اپنی فوج کے ساتھ 23 اپریل کو ان پر حملہ آور ہوا۔

کنور سنگھ گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جب لی گرینڈ ان کی توپوں کی زد میں آیا تو کنور سنگھ کی فوج کمین گاہوں سے باہر آ کر ان پر ٹوٹ پڑی۔ لی گرینڈ کی فوج سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلی۔ آدھے سے زیادہ انگریز مارے گئے اور 199 میں صرف اسی اپنی جان بچا سکے۔ کنور سنگھ اس شاندار فتح کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے اور وہ 26 اپریل 1858 کو مر گئے۔(38)

II

کنور سنگھ کی ہردل عزیزی کا ایک بڑا سبب ان کی فلاحی خدمات تھیں۔ ان کو بہار کے اکثر زمینداروں کی ہمدردی اور مدد حاصل تھی۔ وہ جہاں بھی جاتے انگریزی فوج کو چھوڑ کر فوجی ان کے ساتھ ہو جاتے۔ سب سے زیادہ اور پُر زور حمایت ان کی داناپور کی چالیسویں بٹالین کر رہی تھی جس میں بھوج پور علاقہ کے زیادہ تر فوجی تھے۔[39] پٹنہ کے کمشنر کے مطابق کنور سنگھ کا نام، بنیاد قول کی طرح پورے بہار میں جاری تھا اور وہ بہار کے بڑے راج پوتوں کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔[40]

راجپوت ہونے کے علاوہ، کنور سنگھ کی ہردل عزیزی اور شہرت کا راز ان کی عوام دوستی اور فلاحی کام تھے۔ انھوں نے جگدیش پور میں سڑکوں اور بازاروں کی تعمیر کرائی۔ عوام کے استعمال کے لیے کنویں اور تالاب بنوائے۔ انھوں نے ضلع کے لوگوں میں میل جول اور قربت بڑھانے کے لیے سالانہ میلوں کا نظم قائم کیا۔ ان کے تعمیر کردہ بازاروں میں بابو بازار خاص بازار تھا۔
کنور سنگھ نے آرہ کے اردگرد جنگلات بھی لگوائے تھے جس سے آرہ کی زرخیزی میں اضافہ ہوا۔ یہی جنگلات ان کے آخری ایام میں ان کی پناہ گاہ بنے۔[41] کنور سنگھ نے تعلیم کے فروغ کی طرف بھی توجہ دی۔ انھوں نے ڈمراؤں اور جگدیش پور میں اسکول قائم کیے۔[42]
انگریزوں کے ساتھ جنگوں میں کنور سنگھ نے ایک عظیم جنگ باز ہونے کا ثبوت دیا۔ ان کی فوجی حکمت عملی سے انگریز حیران رہ جاتے تھے۔ بوڑھاپے کے باوجود ان کی نقل و حرکت میں تیزی اور دشمن پر اچانک حملہ آور ہونے کی صلاحیت قابل داد ہے۔ گو کہ انگریزوں کے مقابلہ

میں ان کے پاس ہتھیار اور دوسرے آلات جنگ کی کمی تھی۔ تاہم یہ ان کی قابل فخر قیادت اور ان کے جانباز ساتھی فوجیوں کا کمال تھا کہ کئی مقامات پر انھوں نے انگریزوں کو شکست دی۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے کنور سنگھ مغرور نہیں ہوئے اور نہ ہی جنگی قوانین کی خلاف ورزی کی جیسا کہ انگریز جنرل آیر نے آرہ اور جگدیش پور میں کیا تھا۔[43]

کنور سنگھ کی انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائیوں میں ان کے خفیہ سراغ رسانوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ عوام نے کنور سنگھ کے خفیہ سراغ رسانوں کو انگریزی فوج کی نقل وحرکت کے متعلق مستقل طور پر اطلاعات بہم کیں جن کی وجہ سے کنور سنگھ انگریزوں سے معرکہ آرائیوں میں کامیاب ہوئے۔ گوکہ کنور سنگھ جنگ کی حالت میں شہید ہو گئے تھے۔ شہادت کے بعد بھی وہ عوام کے دلوں کی دھڑکن بنے رہے۔ ان کی بہادری اور کارناموں کا ذکر بھوج پور کے لوک گیتوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ ان کی بہادری کے چرچے گھر گھر میں پھیلتے گئے اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ جاری رکھنے میں معاون بنے۔

حواشی:

1. Biography of Kunwar Singh and Amar Singh, Patna 1957 (اس کے بعد حوالہ درج)
2. Taylor's letter dated 23 July 1857 to the Secretary to Government of Bengal, c.f. Datta, p.84, Campbell, Narrative of Indian Mutiny, London 1858, pp. 136-40 (اس کے بعد حوالہ مکمل)
3. G.B Malleson, History of Indian Mutiny, Vol.I, London, 1878, p. 76, John Kaye, History of Spoy War, Vol. III, London, 1888, p. 100n.
4. Samul's letter dated 29 January 1858 to the Government of Bengal (cf Datta, p 90).
5. Datta, p.90
6. Datta, p.93
7. Datta, p.98
8. عبداللطیف، 1857 کا تاریخی روزنامچہ، ایڈیٹر کے اے نظامی، دہلی، صفحات 119-20، دہلی اردو اخبار، 17 مئی 1857
9. Datta, p.96
10. Francis Buchanan, An Account of the District of Shahabad in 1812-13, reprint New Delhi, 1986, p.213 (آگے حوالہ درج نہیں)
11. ایضاً، ص 213
12. Rizvi, Freedom Struggle in U.P, Vol. IV, Lucknow 1959, p. 405
13. Datta, p.97n
14. Tayler, Our Crisis, pp.14-15, Campbell, p.135
15. Charles Ball, Vol. II, pp. 105-106, Kaye, V.III, p. 120
16. Campbell, p.135
17. Charles Ball, Vol. II, pp.105, 106, Campbell, pp 135-36
18. Datta, p.115
19. Datta p.115
20. Malleson Recreation of an Indian Official, p. 313
21. Charles Ball, Vol. II, p.129, Kaye, Vol. III, p.145, Campbell, p.140
22. Charles Ball, Vol.II, p.129, Kaye, Vol.III, p.145
23. Datta p.117
24. چارلس بال لکھتا ہے کہ آرہ کے باغیوں میں بہت سے فوجی آرہ سے آئے تھے اور ان کا تعلق دانا پور کی چالیسویں رجمنٹ سے تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ کنور سنگھ کے اپنے علاقے کے تھے۔ Charles Ball, Vol. II, p 166

25. Campbell, p.424
26. Ibid. p.209
27. Campbell p.209
28. ایضاً
29. ایضاً
30. ایضاً
31. جنرل ونڈھم انگریزوں کا ایک اہم فوجی افسر تھا۔ 1854-56 کی کریمیا کی جنگ میں اس نے نمایاں کردار انجام دیا تھا اس نے 1857 میں لاہور میں فوج کی قیادت کی تھی۔
32. کارل مارکس بھی اپنے مضمون میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ دیکھیے کارل مارکس آن انڈیا، (ایڈیٹر، اقبال حسین) نئی دہلی، 2006، ص۔137
33. غلام رسول مہر، 1857 کے مجاہد، لاہور 1957، ص 189
34. دتا، ص 144-50، رضوی، فریڈم سٹرگل ۔۔۔ جلد چہارم، صفحات 437
35. رضوی، جلد چہارم، ص 448
36. Charles Ball, Vol. II, p. 287
37. Telegram to Commissioner of Banaras, 23 April 1858 in Rizvi, Vol. IV. p 462
38. Datta, p 151-55
39. رضوی، جلد چہارم، ص۔426
40. رضوی، جلد چہارم، ص 443
41. دتا، صفحات 21-22
42. دتا، ص 158
43. دتا، ص 158

سید امتیاز الدین

طرۂ باز خاں

عام طور پر جب ہمارے ملک کی جنگِ آزادی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے تو سب سے پہلے 1857 کی وہ خونیں داستان یاد آتی ہے جسے عرف عام میں غدر کا نام دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857 سے بھی بہت پہلے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے۔ نہ صرف شمالی ہند بلکہ دکن کے عوام بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرنے لگے تھے۔ ریاست حیدرآباد میں بھی بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ نظام حیدرآباد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین 1853 میں ایک معاہدہ طے پایا تھا جس کی رو سے ریاستِ حیدرآباد کے اضلاع برار، عثمان آباد اور رائچور نظام حیدرآباد کی حفاظت پر مامور فوجوں کے خرچ کی پابجائی کے لیے انگریزوں کو دے دیے گئے تھے۔ انھی دنوں ریاست کے وزیر اعظم سراج الملک کی وفات واقع ہوئی اور سالار جنگ اول ان کی جگہ ریاست کے دیوان مقرر ہوئے۔ نظام چہارم ناصر الدولہ کا انتقال بھی اسی زمانے میں ہوا۔ عوام میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ ناصر الدولہ طبعی موت نہیں مرے بلکہ ان کو سازش کے تحت مارا گیا ہے۔ برار کی انگریزوں کو حوالگی سے بھی عوام میں سخت بے چینی تھی۔ شمالی ہند سے بھی ایسی خبریں مل رہی تھیں کہ انگریزی فوجیں شکست کھا رہی ہیں اور ہندوستانی مجاہدینِ آزادی پیش قدمی کر رہے ہیں۔ حیدرآباد کی مساجد میں مولویوں کی جوشیلی تقاریر ہونے لگی تھیں اور ولولہ انگیز اعلامیے (پوسٹر) دیواروں پر چسپاں کیے جا رہے تھے جن میں عوام کے ساتھ ساتھ فرماں روائے وقت نظام پنجم افضل الدولہ سے بھی کہا گیا تھا کہ ان کو انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا

چاہیے۔ اللہ ورسول کی مدد ان کے ساتھ ہے۔ اس لیے ان کو انگریزوں سے ڈرنا یا خائف ہونا نہیں چاہیے۔ اگر انھیں ڈر ہے تو پھر انھیں چوڑیاں پہن کر گھر بیٹھ جانا چاہیے۔

انھی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو حیدرآباد میں ریزیڈنٹ کی قیام گاہ ریزیڈنسی پر حملے کا باعث ہوا۔ جس میں مجاہد آزادی طرّہ باز خاں اور ان کے ساتھیوں نے داد شجاعت دی اور تاریخ کے صفحات پر ان کا نام ہمیشہ کے لیے رقم ہو گیا۔ ریزیڈنسی پر حملے کا پس منظر یوں ہے کہ اورنگ آباد کی انگریزی چھاؤنی میں بھی انگریزوں کے خلاف سخت نفرت آمیز جذبات پائے جاتے تھے۔ سپاہیوں میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ انھیں شمالی ہند میں پھیلی ہوئی بغاوت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا جانے والا ہے۔ ان فوجیوں نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ ہم کو یہیں خدمات انجام دینے کے لیے رکھا گیا ہے اور ہم اپنے بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے خلاف انگریزوں کی مدد کے لیے شمالی ہند نہیں جائیں گے۔ اورنگ آباد کی بغاوت کا ایک اہم رہنما چیدہ خاں تھا جو انگریزوں کے چنگل سے نکل کر اس امید میں اپنے تیرہ ساتھیوں کے ساتھ حیدرآباد پہنچا کہ شاید یہاں اسے پناہ مل جائے۔ چیدہ خاں کی گرفتاری پر پہلے سے ہی تین ہزار روپے انعام کا اعلان ہو چکا تھا۔ جونہی چیدہ خاں اور اس کے ساتھی حیدرآباد پہنچے وزیر اعظم سالار جنگ نے انھیں گرفتار کر کے انگریز ریزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کے حوالے کر دیا۔ اس واقعے سے شہر حیدرآباد میں سخت تناؤ اور بے چینی پھیل گئی۔

17 جولائی 1857 کو جمعہ کے دن زبردست احتجاجی جلسہ مکہ مسجد میں منعقد ہوا جس میں طے کیا گیا کہ چار مولویوں کو لے کر نظام دکن کی خدمت میں جائیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ چیدہ خاں اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیں اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا جائے۔ جونہی یہ خبر سالار جنگ کو پہنچی انھوں نے عرب جمعیت کا ایک دستہ ریزیڈنسی کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ مکہ مسجد سے یہ جلوس مولوی علاء الدین کی قیادت میں روانہ ہوا جب یہ جلوس بیگم بازار کے محلے کی طرف پہنچا تو طرّہ باز خاں اور ان کے ساتھی بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔

طرّہ باز خاں کے والد کا نام رستم خاں تھا۔ وہ ایک بہادر پٹھان اور ذی حیثیت آدمی

تھے۔ کئی روہیلے اور پٹھان ان کے ملازم تھے۔ قریب ساڑھے پانچ بجے یہ جلوس ریزیڈنسی پر حملہ آور ہوا۔ چونکہ ریزیڈنٹ حالات سے پوری طرح باخبر ہو چکا تھا اس لیے اس نے میجر برگس اور میجر برالیس کی سرکردگی میں اپنی فوج اور اسلحہ کی بہترین صف آرائی کر لی تھی۔ ریزیڈنسی کے سامنے دو مکانات تھے۔ ایک مکان این صاحب (نواب فیاض یار جنگ) کا تھا اور دوسرا جے گوپال داس کا۔ ریزیڈنسی پر حملے سے پہلے ان مجاہدین نے ان دونوں مکانات پر قبضہ کر لیا تاکہ وہاں سے ریزیڈنسی کے اندرونی حصوں اور اہم مقامات پر حملہ کر سکیں۔ طرّہ باز خاں کی سرکردگی میں روہیلوں نے ریزیڈنسی کا دروازہ توڑ دیا اور حملہ کر دیا۔ شام چھ بجے سے دوسری صبح کے چار بجے تک حملے جاری رہے۔ انگریزوں کی فوج تربیت یافتہ تھی اور گولہ بارود کا ذخیرہ بھی ان کا زیادہ تھا۔ کئی مجاہدین ہلاک یا زخمی ہوئے۔ دوسری صبح فجر کے بعد طرّہ باز خاں اپنے ساتھیوں اور زخمیوں کو لے کر بیگم بازار لوٹ گئے۔ عرب جمعیت نے اس موقع پر چشم پوشی سے کام لیا جس کی وجہ سے مجاہدین فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اس حملے کے بعد انگریزوں نے این صاحب اور جے گوپال داس کے مکانوں کو مسمار کر دیا اور ریزیڈنسی کو فوجی لحاظ سے اور مضبوط کر دیا۔

18 جولائی 1857 کو ریزیڈنٹ ڈیوڈسن نے نظام حیدرآباد کو لکھا کہ باغیوں کو جلد از جلد گرفتار کر لیا جائے۔ ریاستِ حیدرآباد کی پولیس اور فوج کو اس سلسلے میں چوکس کر دیا گیا۔ طرّہ باز خاں کو محمد بدھن خاں نامی شخص کے سواروں نے گرفتار کر لیا اور ان کی جائیداد کو ضبط کر لیا گیا۔

22 جولائی 1857 کو سالار جنگ نے ریزیڈنٹ کو مطلع کیا کہ طرّہ باز خاں کو گرفتار کر لیا گیا ہے لیکن وہ ابھی شدید زخمی ہیں۔ کرامت علی مجسٹریٹ فوجداری فضل اللہ مجسٹریٹ دیوانی اور غالب جنگ نے ان کا بیان قلم بند کیا۔ طرہ باز خاں نے بڑی دلیری سے اس بات کا اعتراف کیا کہ انھوں نے اس بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اور باغیوں کو جانتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنے گھر پر تھے۔ جلوس وہاں سے گزرا جہاد کا علم بلند تھا اور وہ اس علم کو دیکھ کر جہاد کی نیت سے اس میں کود پڑے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا انھیں اس بغاوت میں شامل ہونے کے لیے کسی نے ورغلایا تھا تو انھوں نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے اس حملے میں

شریک ہوئے تھے۔اس مجاہدِ آزادی نے شدید زخمی حالت میں بھی دلیری اور حق گوئی کے ساتھ اپنا بیان قلم بند کروایا اور اپنا جرم قبول کیا۔طرّہ باز خاں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ریزیڈنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ طرّہ باز خاں کا جرم اتنا سنگین ہے کہ ان کو سزائے موت دی جانی چاہیے لیکن گورنر جنرل نے سزا کو تبدیل کرنے سے انکار کردیا۔18 جنوری1859 کو طرّہ باز خاں حراست سے فرار ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی جیل کے دو سپاہی بھی جنھوں نے طرہ باز خاں کی فراری میں مدد دی تھی جیل سے فرار ہوگئے۔19 جنوری1859 کو طرّہ باز خاں کی گرفتاری پر پانچ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا گیا۔ایک ہفتے کے اندر قربان علی نامی ایک شخص نے طرّہ باز خاں کو گرفتار کرلیا۔قربان علی، محمد خاں جمعدار اور چند لوگوں کو لے کر اس مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں طرّہ باز خاں چھپے ہوئے تھے۔قربان علی نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے طرّہ باز خاں کو ان کی آنکھ کے نیچے زخم کے نشان سے پہچانا۔قربان علی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر طرّہ باز خاں اور ان کے جاں نثاروں نے تلواریں سونت لیں جس پر قربان علی اور اس کے ساتھیوں نے گولیاں چلادیں۔طرّہ باز خاں اور ان کے ساتھی ہلاک ہوگئے۔طرّہ باز خاں کے تین ساتھی جنگل میں فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔قربان علی نے طرّہ باز خاں کی لاش غلام حیدر، بابو لعل اور ان کے ساتھیوں کے ذریعے حیدرآباد بھیج دی۔طرّہ باز خاں کی لاش کو زنجیروں سے باندھ کر شہر حیدرآباد میں برسرِ عام لٹکایا گیا۔

آندھرا پردیش کے سابق گورنر بھیم سین سچر نے ریزیڈنسی (جہاں آج کل ویمنس کالج قائم ہے) سے متصل سڑک کا نام طرہ باز خاں روڈ رکھا۔یہیں اس شہیدِ آزادی کا مجسمہ بھی نصب ہے۔

سید داؤد اشرف

مولوی علاء الدین

حیدرآباد کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انگریزوں کے دباؤ اور ان سے گہرے تعلقات کی وجہ سے یہاں انگریزوں کے خلاف آزادی کے میلانات کا زور پکڑنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات ایک حد تک درست ہے لیکن پہلی جنگ آزادی 1857 اور اس سے قبل کی جو تحریکیں انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے مختلف حصوں میں چل رہی تھیں ان کا حیدرآباد سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رہا۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جدوجہد آزادی 1857 کی تحریک میں حیدرآباد نے صرف ایک تماشائی کا رول ادا نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر یہاں کے نازک حالات میں عوام نے انگریزوں کے اقتدار کے خلاف جس غم و غصہ کا اظہار کیا تھا اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

افضل الدولہ (1857 تا 1869) اپنے والد ناصرالدولہ آصف رابع (چہارم) کے انتقال پر 1857 کی جنگ آزادی کے دوران تخت نشین ہوئے۔ اس لیے انھیں نازک اور پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد میں بڑے پیمانے پر بغاوت رونما نہیں ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی عوام انگریز مخالف جذبات رکھتے تھے اور شمالی ہندوستان میں ہونے والے واقعات کی تفصیلات سن کر وہ چاہتے تھے کہ افضل الدولہ آصف جاہ (پنجم) اور مدارالمہام (وزیر اعظم) سالار جنگ اول بیرونی تسلط کے خاتمے کے لیے جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ افضل الدولہ کے تخت نشین ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد یہاں

یہ اطلاع پہنچی کہ دہلی میں جنگ آزادی کا آغاز ہو چکا ہے تو دارالخلافہ شہر حیدرآباد میں عوام کی انگریز مخالف سرگرمیاں ظاہر ہونے لگیں۔ شہر حیدرآباد میں چند چھوٹے موٹے واقعات ہوئے لیکن 17 جولائی 1857 کو ریزیڈنسی پر حملہ پہلا اور آخری بڑا واقعہ تھا جو شہر حیدرآباد میں پیش آیا۔ ریزیڈنسی پر حملہ آوروں کے لیڈر طرّہ باز خاں گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ طرّہ باز خاں جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے لیکن توپران دیہات کے قریب پکڑے گئے اور فرار ہونے کی کوشش پر نائب توپران نے انھیں گولی مار دی۔ مولوی علاء الدین جو ریزیڈنسی پر حملہ کرنے میں طرح باز خاں کے ساتھ حملہ آوروں کی قیادت کر رہے تھے حملے کی ناکامی کے بعد بنگلور فرار ہو گئے۔ انھیں بنگلور کے ایک دیہات منگلا پلی میں گرفتار کیا گیا اور وہاں سے انھیں حیدرآباد لایا گیا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں جزیرہ انڈمان میں حبس دوام کاٹنے کی سزا دی گئی جو اس زمانے میں سزائے موت کے بعد سب سے سخت سزا سمجھی جاتی تھی۔ تمام تحقیقی کتابوں Freedom Struggle in Hyderabad جلد دوم، Who is who in Andhra Pradesh جلد اول اور Nizam British Relations میں مولوی علاء الدین کا سنہ وفات 1884 لکھا گیا ہے۔ مزید برآں ان کتابوں سے مولوی علاء الدین کی زندگی کے اس طویل عرصے کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں جو مولوی صاحب نے جزائر انڈمان میں گزارا تھا۔

آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے آصف جاہی ریکارڈ میں راقم الحروف کو ریاست حیدرآباد کی متعدی عدالت کی ایک مسل (مسل نشان 445 بابت 1298 ص، عدالت دمتفرق) دستیاب ہوئی ہے جو مولوی صاحب کی زندگی کے ان پہلوؤں سے پردہ ہٹاتی ہے جو اب تک تاریکی میں تھے۔ اس مسل سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مولوی علاء الدین 1889 تک حیات تھے۔ علاوہ ازیں اس بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ مولوی صاحب نے اپنی رہائی کے سلسلے میں کیا کوششیں کی تھیں، ان کی رہائی کے بارے میں حکومت ہند اور حکومت ریاست حیدرآباد کی جانب سے کیا اقدامات کیے گئے تھے، پورٹ بلیر میں 1860 تا

1889 یعنی تقریباً تیس سال مولوی علاء الدین کی کیا مصروفیات ہیں اور اس دوران ان کی صحت کیسی رہی؟ اس مسل میں حکومت حیدرآباد کے نام مولوی علاء الدین کی پیش کردہ اصل فارسی درخواست، درخواست کے ساتھ منسلک کردہ ڈاکٹروں کے طبی تصدیق نامے اور عہدیداروں کی توصیفی اسناد موجود ہیں۔ مولوی صاحب کی اس درخواست پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے کیا کارروائی کی گئی تھی اس سے متعلق کاغذات بھی اس مسل میں موجود ہیں۔ اس مسل کی تمام کارروائی کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

مولوی علاء الدین اپنی فارسی درخواست مورخہ 29 جمادی الاول 1306ھ یکم فروری 1889 میں لکھتے ہیں کہ 1857 میں حیدرآباد ریزیڈنسی پر حملہ کرنے کے جرم میں عمر قید کی سزا دے کر انہیں پورٹ بلیر بھیج دیا گیا جہاں وہ تقریباً تیس سال کا عرصہ گزار چکے ہیں اور یہاں اپنی آمد سے لے کر اب تک وہ کسی قصور کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ تمام حکام ان سے رضامند رہے اور اکثر نے خوشنودی کے تصدیق نامے بھی عطا کیے ہیں۔ چونکہ یہاں قیدیوں کی رہائی مطلق کے لیے بیس سال کی مدت مقرر ہے اس لیے ہزارہا قیدی جو مختلف جرموں کی پاداش میں یہاں سزا بھگت رہے تھے مدت معینہ کی تکمیل کے بعد رہا ہو کر اپنے وطن لوٹ چکے ہیں یا لوٹ رہے ہیں لیکن وہ اپنے حسنِ سلوک اور تقریباً تیس سال کی مدت گزارنے کے باوجود یہاں پر موجود ہیں۔ سابق میں ان کی رہائی کے سلسلے میں جو کارروائیاں ہوئی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ 1877 میں حکومت ہند نے ان کی رہائی مطلق کے لیے حکومت حیدرآباد کو لکھا تھا لیکن بدقسمتی سے اس وقت ریاست کے مدارالمہام سالار جنگ اول نے جو ایک عرصے سے مولوی صاحب سے ناخوش تھے، اس تجویز کو نامنظور کر دیا۔ چنانچہ حکومت ہند نے انہیں اس جزیرے کی حد تک رہائی عطا کی۔ ان کی رہائی کے لیے حکومت ہند کی جانب سے کی جانے والی سرکاری کارروائی کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ تقریباً تین سال قبل حکومت ہند کے معتمد داخلہ مسٹر میکنزی دورے کی غرض سے پورٹ بلیر آئے تھے اور اتفاقاً مولوی صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ چیف کمشنر نے ان کی تمام سرگزشت معتمد داخلہ کو سنائی اور معتمد داخلہ نے

مولوی صاحب سے بھی استفسارات کیے اور وعدہ کیا کہ وہ کلکتہ پہنچ کر مولوی صاحب کی رہائی مطلق کے بارے میں حکومت ہند کو رپورٹ پیش کریں گے۔ چنانچہ معتمد داخلہ نے حسب وعدہ رپورٹ پیش کی جسے گورنر جنرل نے غور وخوض کے لیے کونسل میں پیش کیا۔ جب یہ معاملہ کونسل میں پیش ہوا تو کونسل نے طے کیا کہ مولوی صاحب کو آزادی مطلق دی جانی چاہیے۔ گورنر جنرل نے ان کی رہائی مطلق کی اجازت کے حصول کے لیے کونسل کی تجویز حکومت ریاست حیدرآباد کو روانہ کی۔ لیکن ریاست کے مدار المہام سالار جنگ دوم نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا اور تجویز حکومت ہند کو واپس کر دی۔ اس طرح حکومت ہند کی دونوں تجاویز حکومت حیدرآباد کی جانب سے نامنظور کر دی گئیں۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے چیف کمشنر اور ڈاکٹروں کی سفارشات کے ساتھ حکومت ہند کو درخواست پیش کی تھی جس میں انھوں نے استدعا کی تھی کہ انھیں ہندوستان واپس ہونے کی اجازت مرحمت کی جائے لیکن حکومت ہند نے یہ کہتے ہوئے ان کی درخواست نامنظور کر دی کہ حکومت ریاست حیدرآباد کی اجازت کے بغیر ان کی رہائی مطلق ممکن نہیں۔ حکومت ہند کے اس موقف کے پیش نظر مولوی صاحب کو اپنی رہائی کے لیے براہ راست حکومت حیدرآباد سے رجوع ہونا پڑا۔ چنانچہ اوپر بیان کردہ تفصیلات کے بعد وہ اپنی درخواست میں لکھتے ہیں کہ وہ اس جزیرے میں تقریباً تیس سال کی مدت گزار چکے ہیں۔ جب وہ اس جزیرے پر پہنچے تھے اس وقت وہ جوان، تندرست اور قوی ہیکل تھے لیکن اب وہ کافی ضعیف ہو چکے ہیں اور کئی امراض میں مبتلا ہیں۔ ان کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ پانچ وقت کی نماز بیٹھ کر اشاروں سے پڑھتے ہیں اور کسی کی مدد کے بغیر ان کا حرکت کرنا مشکل ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی درخواست کے ساتھ جو طبی تصدیق نامے منسلک کیے ہیں ان سے ان کی طبی حالت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی درخواست کے آخر میں رہائی مطلق کی منظوری عطا کرنے کی استدعا کی تا کہ وہ اپنی عمر کی بقیہ قلیل مدت گوشہ گمنامی میں خدائے تعالیٰ کی عبادت اور دعائے خیر میں صرف کر سکیں۔

مولوی صاحب نے درخواست کے ساتھ 8 طبی تصدیق نامے منسلک کیے تھے۔ یہ

تصدیق نامے جونیئر اور سینئر میڈیکل آفیسروں کی جانب سے 1886 اور 1889 کے دوران جاری کیے گئے تھے۔ ان تصدیق ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی علاء الدین کئی امراض میں مبتلا تھے مثلاً گٹھیا، double inginal hernia وغیرہ۔ ضعیفی کی وجہ سے ان کی بصارت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ بہت پہلے بندوق کی گولی لگنے کی وجہ سے وہ سیدھے بازو سے معذور ہو گئے تھے۔ ان کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا اور کندھے پر تلوار کے وار کا گہرا زخم تھا۔ تقریباً سبھی ڈاکٹروں کی یہ رائے تھی کہ مولوی صاحب اس مقام سے واپس ہونے کے لیے بے چین ہیں اس لیے انھیں تبدیلی مقام کی اجازت دی جانی چاہیے تاکہ ان کی صحت بہتر ہو سکے، ان کے مصائب میں کمی اور عمر میں اضافہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورٹ بلیر کے تمام عہدیدار مولوی علاء الدین سے بے حد خوش تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ 44 توصیلی اسناد بھی منسلک کی تھیں جو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، اسسٹنٹ پرنٹنڈنٹ، ایگزکٹیو انجینئر اور پولیس ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ کی جانب سے جاری کی گئیں تھیں۔ یہ تصدیق نامے مولوی علاء الدین کے بارے میں اہم اور بالکل نئی معلومات مہیا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مولوی صاحب 22 جنوری 1860 کو پورٹ بلیر پہنچے تھے اور بحیثیت قیدی ان کا نمبر 3708 تھا۔ چونکہ وہاں فارسی جاننے والوں کی کمی تھی اس لیے انھوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور تین مختلف ڈویژنوں میں محرر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس علاقے میں بڑے پیانے پر کاشت کاری کے لیے بھی ان کا تعاون حاصل رہا۔ انھوں نے وہاں آٹے کی گرنی کھولی تھی اور دودھ کی فراہمی کے لیے گلہ حاصل کیا تھا۔ مولوی صاحب نے ساجھے داری میں ایک دکان بھی کھولی تھی۔ انگریز عہدیداروں نے اپنے تصدیق ناموں میں ان کی دیانت داری کی اچھے الفاظ میں تعریف کرتے ہوئے ضرورت کی اشیا ان کی دکان سے خریدنے کی سفارش بھی کی تھی۔ بعض انگریز عہدیداروں نے فارسی سیکھنے کے لیے انھیں اپنا استاد مقرر کیا تھا۔ جن عہدیداروں نے تصدیق نامے جاری کیے تھے وہ سب اس بارے میں متفق الرائے تھے کہ مولوی علاء الدین ایک بے حد بااخلاق، نہایت شائستہ، خاصے پڑھے لکھے اور ذہین شخص تھے۔ بہت سے تصدیق ناموں میں ان کی رہائی مطلق

کے بارے میں بھی سفارش کی گئی تھی۔

مولوی علاء الدین کی اس درخواست پر حکومت حیدرآباد کی جانب سے جو کاروائی کی گئی تھی اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

عماد جنگ معتمد عدالت حکومت ریاست حیدرآباد نے اپنے نوٹ میں مولوی صاحب کی درخواست کا خلاصہ اور ان کی استدعا بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو کاغذات روانہ کیے ہیں ان سے ان کی بیماری کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس مدت میں ان کا رویہ اچھا رہا ہے۔ اگرچہ یہ حکم جاری ہو چکا ہے کہ عمر قید کی سزا بھگتنے والے قیدی بیس سال تک چال چلن نیک رہنے کی صورت میں رہا کر دیے جائیں، مولوی علاء الدین نے تیس سال تک نیک چلنی کا ثبوت دیا ہے لیکن اس مقدمے کا انگریزی حکومت سے تعلق ہے۔ اگر اجازت ہو تو صاحب عالی شان کو لکھا جائے کہ اگر گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کی رہائی میں اعتراض نہ ہو تو ان کی رہائی کا حکم صادر کیا جائے۔ معین المہام (وزیر) عدالت فخر الملک نے معتمد عدالت کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مدار المہام سر آسمان جاہ نے اس نوٹ پر استفسار کیا ''مولوی علاء الدین کی عمر اب کس قدر ہوگی؟''۔ اس استفسار کے جواب میں عماد جنگ نے لکھا کہ مولوی صاحب کی درخواست میں ان کی عمر نہیں لکھی گئی ہے لیکن بعض ڈاکٹروں کے سرٹیفکیٹ سے جو ان کی درخواست کے ساتھ منسلک ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر تقریباً 67 برس کی ہے اور اکثر ڈاکٹروں نے لکھا ہے کہ اب وہ بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور ان کی بصارت میں فرق آ گیا ہے۔ جن کاغذات پر نشان لگائے گئے ہیں اگر وہ ملاحظہ کیے جائیں تو ثابت ہوگا کہ وہ قابل رحم ہیں۔ آسمان جاہ نے ان پر رحم کھانے کے بجائے یہ حکم تحریر کر دیا کہ مولوی صاحب کو جواب دیا جائے کہ جس علاقے میں وہ رہتے ہیں وہاں درخواست پیش کریں۔ اگر وہاں سے کارروائی پیش ہوگی تب لحاظ کیا جائے گا۔ مولوی صاحب کو ایک مراسلہ مورخہ 17 شوال 1306 ہجری مطابق 17 جون 1889 کے ذریعے اس حکم سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس طرح مولوی صاحب آخری کوشش میں بھی رہائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

آرکائیوز کی مسل سے جو نئی معلومات ہوئی ہیں ان کی روشنی میں اب وثوق اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مولوی علاء الدین کا انتقال 1884 میں نہیں ہوا تھا جیسا کہ مذکورہ بالا چند تحقیقی کتابوں میں لکھا گیا ہے بلکہ وہ 1889 تک حیات تھے۔ وہ رہائی مطلق اور اپنے وطن آنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ انھوں نے ابتدائی کوششوں میں ناکامی کے بعد حکومت ریاست حیدرآباد کو ایک درخواست روانہ کی تھی جس کے ساتھ طبی صداقت نامے اور توصیلی اسناد منسلک تھے لیکن اس بار بھی ان کی کوشش رائیگاں گئی۔ مولوی صاحب نے اپنی درخواست کے ساتھ جو منسلکات روانہ کیے تھے ان سے نہ صرف ان کی صحت کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ پورٹ بلیر کی ان کی 30 سالہ زندگی کی مصروفیات اور سرگرمیوں کا ایک خاکہ بھی سامنے آتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشتہار اول منظوم

ضمیمہ

بعد تمہید خدا نعت رسول اکرم
یہ رسالہ ہے جہاد یہ کہ لکھتا ہے قلم
ہے جو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد
ہم بیان کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد
جس کے پردں پہ پڑی گرد صف جنگ جہاد
وہ جہنم سے بچا نار سے ہے وہ آزاد
اے برادر تو حدیث نبوی کو سن لے
باغ فردوس ہے تلواروں کے سایہ کے تلے
زر ہی خرچ کیا اور لگائی تلوار
پھر تو دیویگا خدا اس کے عوض سات ہزار
جو نہ خود جاوے لڑائی میں نہ خرچ کچھ مال
اس پہ ڈالے گا خدا پیشتر از مرگ و بال
مدت العمر کے مٹتے ہیں گناہ شہدا
کیوں نہ ہو جنگ میں کٹواتے ہیں سر بہر خدا

حق تعالٰی کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

مال و اولاد کی گھر کی محبت چھوڑو
راہ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو

دیں اسلام بہت سست ہوا جاتا ہے
غلبہ کفر سے اسلام مٹا جاتا ہے

زور شمشیر سے غالب رہا اسلام مدام
سستی اگلے جو کبھی کرتے تو ہوتا گمنام

اب تو غیرت کرو نا مردی کو چھوڑو یارو
ملو چل چل کے امام اپنے سے کافر مارو

ہے مسلمان پریشاں بغیر از اسباب
شکر سب تو نے دیا اے مرے رب الارب

واسطے دین کہ لڑنا نہ ہے طمع بلاد
اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

فرض ہے تم پہ مسلمانو جہاد کفار
اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

جو مسلمان رہ حق میں لڑا لحظہ بھر
روضہ خلد بریں ہوگیا واجب اس پر

دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیویگا اگر
سات سو اس کو خدا دیوے گا روز محشر

جو کہ مال اپنے سے غازی کو بنا دے اسباب
اس کو بھی مثل مجاہد کی خدا دے گا ثواب

جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
فتنۂ قبر و غم صور و قیام محشر
ایسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں ہے کچھ ڈر
اے مسلمانوں سنے تم نے جو خوبیِ جہاد
چلو اب رن کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد
گر پھر جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے
اور گئے مارے تو جنت کو چلے جاؤ گے
پیشوا لوگ اسی طرح نہ کرتے جو جہاد
ہند پھر کس طرح اسلام سے ہوتا آزاد
کب تلک گھر میں پڑے جوتیاں چٹکاؤ گے
اپنی سستی کا بجز افسوس نہ پھل پاؤ گے
بارہ سو برس کے بعد آئی یہ دولت آگے
حیف اس دولت بیدار سے مومن بھاگے
یعنی اسباب لڑائی کا جو کچھ تھا درکار
سب دیا تو نے ہمیں اور کیا پھر سردار
بات ہم کام کی کرتے ہیں سنو اے یارو
وقت آیا ہے کہ تلوار کو بڑھ بڑھ مارو

Ref. Kanahya Lal, Maharba-i-Azeem, 1861 pp. 199-200 NB: The above was issued by Maulvi Liyaqat Ali of Allahabad.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رسالہ فتح اسلام

ضمیمہ دوم

سب تعریف اللہ رب العالمین کو جو دین اسلام کو فتح دینے والا ہے اور صلوٰۃ اور سلام اس کے رسول محمد پر جن کا دین اجالا ہے اور اس کے اصحاب اور اولاد پر جن کا مراتب اعلیٰ ہے اور سارے مومنوں اور غازیوں پر جن کا بول بالا ہے۔ اے بھائیو اس وقت میں جو نصاریٰ مردود کھلا کھلی ظلم کر رہے ہیں کہ لوگوں کو بے گناہ قتل کر رہے ہیں اور ان کے مالوں کو لوٹ رہے ہیں اور ان کے گھروں کو جلا دیتے ہیں اور کسی مقام میں ان کے بال بچوں کو گھر میں بند کر کے اس گھر میں آگ لگا دیتے ہیں اور کسی مقام میں ان کے بال بچوں کو گھر میں بند کر کے اس گھر کا دروازہ چنا دیتے ہیں اور حافظوں اور عالموں اور دینداروں کو اپنے وطن میں رہنا مشکل ہوا ہے اور بڑے بڑے رئیسوں کو پھانسی دے دیا اور مطلق خوف نہ کیا اور یے (یہ) مردود ایسے ناخدا ترس اور بے رحم ہیں کہ سینکڑوں غریب غربا کو زبردستی بیگاری پکڑ کے ایک کا ہاتھ ایک میں باندھ کر گئی کی طرح بنا کے لڑائی کے میدان میں ان مظلوموں کو اپنی ڈھال بنا کے آگے کرتے ہیں اور پیچھے سے سنگین مار مار کے آگے بڑھاتے جاتے ہیں اور ان کے آڑ میں چھپے ہوئے آپ بڑھے جاتے ہیں اور جو کچھ گولا گولی چھرا آتا ہے سو ان بیچارے مظلوموں پر پڑتا ہے اور ایسی بدعملی کر دیا ہے کہ گاؤں اور مسافر لٹے جاتے ہیں اور سارا ملک بے امن ہو گیا ہے اور آپ بھی لوگوں کو پھانسی دیتے اور گاؤں کا گاؤں لوٹ لیتے ہیں اور حقیقت میں یہ سب باتیں ان مردودوں کی کم بختی کی نشانی ہیں کہ جس طرح سے پہلے فوج کو بے دین کرنے کے ارادے پر ان سے نجس ملا کارتوس کٹوانے پر ضد کیا تھا

اور اس کے سبب سے کتوں کی موت مارے بھی گئے اور فوج بھی گئی اور ملک بھی گیا اسی طرح سے
اب ان حرکات سے رعیت بھی دشمن ہو گئی۔ غرض یہ مردود فرعون بے سامان بن گئے اور فرعون ہی
کی طرح سے بالکل ہلاک ہوں گے انشاء اللہ تعالیٰ اور اب ان کے عمل دخل پھر ہونے میں ہندو
اور مسلمان رعیت، سپاہ، بادشاہ، وزیر سب کو بڑا خطرہ ہے اور ان کے قتل میں دیر کرنے سے بھی
سینکڑوں جان بے گناہ قتل ہوتے جاتے ہیں اس سبب سے اس وقت میں ان نصاریٰ مردود سے
جہاد کرنا خدا رسول کے واسطے سے فرضِ عین ہو گیا ہے اور الحمدللہ کہ اس فرضِ عین کے ادا کرنے
میں سامان بھی مدد غیبی سے اب موجود ہو گیا ہے یعنی اس سے سابق توپ وغیرہ سامان جنگ کا جو
جہاد کے واسطے ضروری ہے ہندوستانیوں کے پاس موجود نہ تھا اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے توپ
وغیرہ سامان بھی اسلام کے بادشاہ کے پاس دہلی اور لکھنؤ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ بادشاہ اسلام کو
سلامت اور فتح مند رکھے اور اب انگریزوں کی فوج بھی تھوڑی سی رہ گئی ہے اب اس وقت میں جو
جہاد نہ کرے گا سو پچھتاوے گا ایسا وقت ملتا کہاں ہے۔ دیکھو آگے بڑے بڑے نواب اور
رجواڑوں کو طاقت نہ تھی کہ انگریزوں کے ایک ادنیٰ سپاہی کو ماریں اور اب بڑے بڑے
انگریزوں کو چماروں اور پاسیوں نے قتل کیا سو سپاہ نے جیسا پہلے ان کا قتل شروع کیا ہے اور اس
کے سبب سے یہ مردودوں بے گناہوں کو قتل اور خانہ خراب کر رہے ہیں ویسا اب بھی ہر ملک اور ہر
شہر میں پہنچ کے ان کو قتل کریں تا کہ قیامت کو جواب دہی میں نہ پڑیں اور اب سپاہ لوگ ایک ہی
مقام میں جمے نہ رہیں آخر انگریز مردود بھی تو ہر مقام میں پہنچ کر لڑتے ہیں باوجود یہ کہ وے لوگ
اپنی ذات کے کمینہ ہیں۔ چمار پاسی کی طرح سے اور ان کی فوج بھی تھوڑی ہے مگر ہر مقام کی خبر
لیتے ہیں اور تم کو دھوکہ دے کے چاہتے ہیں کہ تم ایک ہی مقام میں قید بنے رہو اور تم کو آگے بڑھنے
کا حوصلہ نہیں، اس واسطے کہیں تھوڑے سے گورے آجاتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں چلا ہوتا ہے یا
کسی عضو میں سیندور لگا ہوتا ہے تا کہ تم کو وہم آجاوے کہ جادو کرتے ہیں اور حقیقت میں تم کو دھوکا
دیتے ہیں، جادو وادو کچھ بھی نہیں ہے اور جادو ہوتا ہے تو کیا کریں اللہ اکبر کی آواز سے رد ہو جاتا
ہے اور کہیں جھوٹی خبر اڑا دیتے ہیں کہ فلانے مقام سے گورے اتر آئے فلانے مقام میں گورے
آپہنچے اور اس گیدڑ بھبکی سے لوگ گھبراتے ہیں سو لازم ہے کہ تم نہ گھبراؤ اور دیکھو کہ آتے ہیں تو کیا
مضائقہ سب مارے جاویں گے اور تم خود اس مکان میں جس کا تیور وغیرہ کے بڑھ جاؤ کا تیور جاتا

کون مشکل ہے اگر کانپور کے رمس سے ڈرو گے تو الٰہ آباد اور کلکتہ کے قلعہ کے فتح کرنے کے واسطے کس کو تجویز کیا ہے۔ آخر تم ہی سپاہیوں نے آگ لگائی اور تمہارے ہی بجھائے یہ آگ بجھے گی، سو تم بسم اللہ کرو جو کل کرنا ہے سو آج کرو اور جو آج کرنا ہے سو ابھی اسی دم کرو۔ تو اب سپاہیوں کو لازم ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کی محافظت کو مقدم سمجھیں کیونکہ یہ دونوں سپاہ اور خاص و عام رعایا کے پناہ کی جگہیں ہیں اور انہیں دونوں پر دشمنوں کا دانت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دانت کھٹے کیا اور کرے گا۔ سو ان دونوں شہروں کی محافظت کے لائق سپاہ لوگ ان دونوں شہروں میں رہیں اور چار چار پانچ پانچ کوس شہر کی حد سے آگے بڑھ کر چاروں طرف مورچے قائم کریں اور باقی سپاہ بادشاہ کے حکم سے بلکہ خود درخواست کر کے پورب کو روانہ ہوں اور غازی لوگ بھی ساتھ جاویں اور جیسے روم شام کی گھٹا اٹھتی ہے اسی طرح سے کافروں کو مارتے بھگاتے کلکتہ تک چلے جاویں تاکہ دہلی اور لکھنؤ کی پوری محافظت ہو جاوے اور سب تدبیروں پر مقدم غازیوں کا جمع کرنا اور اس کے فائدے لکھنے کی کچھ حاجت نہیں فائدے اس کے ظاہر ہیں اور اس کا عمدہ فائدہ دالی ملک سے بیان کرنے کے قابل ہے اور اگر پورب کو روانہ ہوئے تو اس کا نام بہتر نہیں نظر پڑتا اس کے نقصان کے لکھنے کی حاجت نہیں اس کے نقصان ظاہر ہیں۔ اب بسم اللہ کرو، جلدی اٹھو، کافروں کے مارنے کو روانہ ہو جاؤ اللہ تعالیٰ تم کو زور و قوت دے، اللہ تعالیٰ تم کو ہمت اور فتح دے۔ اب بسم اللہ کر کے ایک حکم منادی کرادو کہ کوئی سپاہی کسی کو نہ لوٹے اور جہاں فتح ہو وہاں کی رعیت کو کوئی ہرگز نہ لوٹے ان کو دشمن نے لوٹا ہے اور تم ان کی محافظت کو گئے ہو اگر تم نے بھی لوٹا تو پھر وہ کس کی پناہ پکڑیں گے اور کوئی لوٹے تو فی الفور اس کو سزا دو اور وہ مال اسباب سب پھرا دو لوٹنا تو ٹھگوں کا کام ہے اور ٹھونگی جنازے کی نماز درست نہیں، ہاں دشمن کا مال لوٹنا درست ہے اس کو غنیمت کہتے ہیں اس کا مسئلہ امیر بتادے گا اور لوٹنے سے مظلوم لوگ بددعا کرتے ہیں اور بددعا جلدی اثر کرتی ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مظلوموں کی دعا اور اللہ تعالیٰ کے بیچ میں کوئی آڑ نہیں ہوتا اسی بددعا کی شامت ہے کہ پہلے بڑے بڑے انگریزوں اور ہزاروں گوروں کو تم نے قتل کر ڈالا اور اب تھوڑے سے گوروں کو دیکھ کے جن کو چمار پاسی بھی مار لیتے ہیں، بھاگتے ہو اور جس دشمن سے لڑائی لگی ہے اس کے سوا کوئی کسی کو ہرگز قتل نہ کرے، بغیر لڑائی کے کسی گناہ کی سزا میں کسی کو قتل کرنا تو جلاد کا کام ہے اور کسی کے قتل کا حکم دینا بادشاہ کا کام ہے اور لڑائی میں کفار کو قتل کرنا غازیوں اور سپاہ کا کام ہے

اور لوگ اس وقت میں اللہ کا شکر کریں اور خوب لڑیں کیونکہ ان کو اچھا اچھا کھانا ملتا ہے آنحضرت کے زمانے میں تو درخت کی پتیاں کھا کھا کے ایک ہزار مسلمان اسی ہزار کافروں سے لڑتے تھے اور جو قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ایک سو مسلمان جو ثابت قدم رہیں تو دو سو کافروں پر غالب رہیں اللہ کے حکم سے یہ نعمت تب ہی حاصل ہوگی جب کسی کو امام مقرر کر کے جہاد قائم کریں گے تو اب بسم اللہ کر کے سب کوئی آپس میں متفق اور ایک دل ہو کے اس کفار کے غلبہ کے وقت میں اگر قریش نہ ملے تو مضائقہ نہیں ایک شخص مسلمان حکومت اور ریاست کو امیر یعنی مومنوں کا سردار مقرر کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور اس کے تابع بن جاؤ تاکہ بموجب شرع اس کا حکم تم میں اور سارے لوگوں میں جاری ہو جاوے تب اس وقت البتہ اطمینان ہوگا اور ایک ہزار غازی کو چونکہ دو ہزار کافروں کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا واجب ہے اور بھاگنا حرام اور زیادہ سے زیادہ لڑیں تو زیادہ ثواب ہے اس واسطے غازی لوگ اگر ایک ہزار ہوں گے تو دس ہزار لوگوں سے بھی نہ بھاگیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ قرش ایک جانور دریائی ہے کہ اس سے (1) سارے دریائی جانور ڈرتے ہیں اسی قرش کو تصغیر کے صیغہ سے قریش بولتے ہیں اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے دادوں میں سے غالب ابن فہر جو ہیں سو ان کا نام قریش پڑ گیا تھا۔ اس واسطے کہ تمام قوم کو انھوں نے دبا لیا تھا اور تمام قوم ان سے ڈرتی تھی انھیں کے فرزند قریشی کہلائے سید لوگ اور صدیقی اور فاروقی اور عثمانی اور علوی اور عباسی شیخ سب قریشی ہیں اور عرب لوگ تمام دنیا کے لوگوں سے بڑھ کر شجاع ہوتے ہیں اور عربوں میں سب سے بڑھ کر قریشی لوگ شجاع ہوتے ہیں اسی واسطے اللہ سبحانہ نے خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قریشی قوم میں عرب میں پیدا کیا اور قریشیوں اور سارے عربوں کو ان کے دین پر قائم اور ان کے تابع کیا ہے اسی واسطے کہ جب عرب اور قریشی دین پر مضبوط ہوئے تب تمام جہان میں میں یہ دین پھیلا۔ اسی واسطے شریعت میں امامت کی شرطوں میں بعضوں نے قریشی ہونا داخل کیا ہے۔ کہ امیر قریشی ہو مگر کفار کے غلبہ کے وقت ضرورت اور لاچاری کے سبب سے اگر قریشی نہ ہو بلکہ اور بھی شرطیں امامت کی اس میں موجود نہ ہوں مگر مسلمان شرع کا تابع ہو اور دنیا کی ریاست اس کو حاصل ہو تو اس کو امیر کرنا درست ہے اور وہ امیر امام اکبر کہلاوے گا اور اس سے دین کا کام خوب نکلے گا تو یہ امیر ان مکاروں سے بہت افضل ہے جو جہاد کے بہانے مال کھاویں الغرض مسلمان امیر خواہ کیسا ہی ہو اس کی تابعداری کتاب سے بھی درست ہے اور عقل

اور دین کا کام خوب نکلے گا تو یہ امیر ان مکاروں سے بہت افضل ہے جو جہاد کے بہانے مال
کھاویں الغرض مسلمان امیر خواہ کیسا ہی ہو اس کی تابعداری کتاب سے بھی درست ہے اور عقل
اور دین کی شرم بھی یہ کہتی ہے کہ وکٹوریہ کی کافرہ اور دین کی دشمن انگریزوں کی تابعداری سے
مسلمان امیر کی تابعداری اور بادشاہ کے تابعدار راجہ لوگوں کی تابعداری کروڑوں درجے افضل
ہے بعد اس کے جب امیر مقرر ہو جاوے تب وہ امیر لشکر اسلام میں اپنی طرف سے امیرین مقرر
کرے۔ کسی کو سریہ پر امیر کرے۔ سریہ کہتے ہیں ان لوگوں کو جو دن کو کسی کمین گاہ میں چھپے رہتے
ہیں اور رات کو چھنتے ہیں یعنی چھاپا مارتے ہیں اور سریہ چار سو آدمی سے کم کا نہیں ہوتا زیادہ
جہاں تک ہو چار ہزار سے کم تک اور یہ بھی ہے کہ کم سے کم سریہ سو آدمی کا ہوتا ہے اور کسی کو امیر جیش
مقرر کرے اور جیش چار ہزار سے کم کا نہیں ہوتا زیادہ جہاں تک ہو تو یہ دونوں شخص امیر سریہ اور
امیر جیش کہلاویں گے ان کی تابعداری بھی امام کے حکم سے فرض ہے جیسا کہ امام اکبر کی تابعداری
فرض ہے اور ہندو لوگ بھی اپنے دین کی محافظت کے واسطے امیر کے شریک ہو جاویں اور پکا قول
اقرار کریں اور ہندو مسلمان دونوں بھائی انگریزوں کو کاٹیں کیونکہ اس سے سابق اسلام کے بادشاہ
نے ہندو لوگوں کی جان اور مال اور بال بچوں کی محافظت کو مسلمانوں کی جان اور مال اور بال بچوں
کی محافظت کی طرح سے بموجب حکم شرع کے اپنے ذمے پر لازم کر لیا تھا اور سب ہندو دل و جان
سے مطیع الاسلام اور بادشاہ کے خیر خواہ تھے تو اب بھی وہی ہندو اور وہی مسلمان ہیں اور وہی کتاب
ہے اپنے دین پر وے رہیں گے اور اپنے دین پر ہم رہیں گے ہم ان کی مدد اور محافظت کریں گے
وے ہماری مدد اور محافظت کریں گے نصاریٰ مردود نے ہندو مسلمان دونوں کو کرشان کرنا چاہا تھا
اللہ نے خیر کیا کہ الٹے وے آپ ہی خراب ہو گئے اور اب ولایت تک ان کے پاس فوج کی پونجی
باقی نہیں بس کہیں مرکٹ گئے جو ہیں سو اسی ملک میں ہیں وے بھی مار لیے جاویں قضیہ پاک
ہو جاوے سو ان کے جلدی مار لینے کی یہ تدبیر ہے کہ بسم اللہ کر کے یہاں سے ملک بنگالے تک
بالفعل جہاں تک ہو سکے بطور اشتہار کے لشکر میں اور رعایا میں خبر بھیج دیویں کہ ہر شہر کے لوگ ہندو
مسلمان متفق اور ایک دل ہو کے اگر ایک ہی روز اور تاریخ میں ہو سکے تو بہت افضل ہے اور نہیں تو
ایک ہی مہینے میں جس شہر میں جس تاریخ کو اتفاق پڑ جاوے دو چار روز کے آگے پیچھے ہر شہر میں
ایک امیر قائم کر کے ان قوم مردود دین کے دشمن پر لوگ حملہ کریں تا کہ شہر میں یہ مردود پھنس جاویں

اشتہار فتح اسلام

یہ اشتہار ہندوستان کے ہندو مسلمان کے پاس بھیجا جاتا ہے اس میں خوب غور کریں اور اپنے اپنے دین اور دہرم کی محافظت کے واسطے آپ کو سارے ہندو مسلمان عورت مرد انگریزوں کے قتل کرنے میں مستعد ہو جاویں نہیں تو نہ کسی کا دین بچے گا نہ دھرم نہ جان نہ بال بچے نہ عزت آبرو۔ ان انگریزوں مردودوں نے اس کارتوس کے جھگڑے کے پہلے سے اپنی ملکہ وکٹوریہ مردار کو لکھا تھا کہ ہندوستان کے مولویوں سے ہر ایک سو میں سے چندرہ مولویوں کا اور ہر ایک سو پنڈتوں میں سے چندرہ پنڈتوں کا اور پانچ لاکھ ہندو مسلمان سپاہی اور رعیت کا اگر خون معاف کردے تو کئی روز میں ہم لوگ سارے ہندوستان کو کرستان کر ڈالیں سو اس بدبخت کتیا مردار نے اس ناحق خون کی اجازت دی اور مطلق خوف نہ کیا کہ اللہ کے بندوں کے خون معاف کرنے کا ہم کو کیا اختیار ہے تب اس اجازت کے آنے کے بعد ان مردودوں نے کارتوس کا بہانا نکال کے قتل عام شروع کیا پھر اور کسی کو تو ان سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی چند روز میں جو کرستان نہ ہوتا اس کو قتل کرنے کے بارے اس پروردگار کے فضل سے سپاہ بہادر نے انگریزوں کو ہی قتل کیا اور ان کا سب زور مٹی میں ملا دیا اور ان کو ایسا کمزور کر ڈالا کہ اب ان کا مار لینا اور نکال دینا آسان ہو گیا، سو اب سپاہ بہادر اتنے باقی رہے موذیوں کو بھی مار لیں اور سارے رعایا لوگ بھی ان کے قتل کی تدبیر میں لگ جاویں اور سارے ہندو مسلمان ان کی کسی قسم کی نوکری نہ کریں اور ان کی نوکری میں مولوی اور پنڈت کے قتل کی شراکت سمجھیں اور سب مل کے انھیں کے قتل پر مستعد ہو جاویں تو خیر ہے اور نہیں تو خیر نہیں ہے ایسے قتل کے وقت میں مرد و عورت لونڈی غلام پر ان کے قتل کے واسطے نکلنا فرض ہو گیا ہے سو اب اس کی تدبیر یہ ہے کہ سارے مولوی اور پنڈت لوگ ان کے نیچے

اور کسی ایک شہر میں ہجوم نہ کرسکیں اور سب جگہ پر تھوڑے تھوڑے بنٹ جاویں اور مار لیے جاویں
اور یہ جو ہم بار بار امیر مقرر کرنے کی تاکید کرتے ہیں تو اس کے واسطے کہ شریعت کے ظاہر حکم پر عمل
کرنے کا ثواب ملے اور اللہ سبحانہ جلدی سے رحم کرے اور ہم لوگ ظاہر میں بھی بے سردار نہ رہیں
اور حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں کے ظاہر میں تو سردار ہیں مگر ان کی طرف اللہ نہیں ہے اور ہم لوگوں
کی طرف اللہ ہے اور ہم مسلمانوں کے اسباب ظاہر درست ہونے کے واسطے ظاہر میں سردار
بادشاہ بھی عنایت فرمایا ہے مگر چونکہ ہم مسلمانوں کا نیا بندوبست اور کارخانہ ہے اور انگریزوں کا سو
برس کا بندوبست اور کارخانہ جما ہوا ہے اور سارے ملک میں لڑائی مچی ہے پھر وہ اکیلا سردار کہاں
کہاں پہنچے اور اس کو فرصت کہاں جو سرداروں کو بھیجے اس واسطے ہم لوگوں پر واجب ہے کہ جلد ایسے
امام مقرر کر اس کے تابع ہو انگریزوں کے مارنے کی تدبیریں ہو جاویں اور ان کے قتل کی یہ تدبیر
ہے کہ غازی لوگ جو رعایا ہیں اور سپاہ کے غازی لوگ سوار اور پیادے جو بڑے بہادر اور جنگ
آزمودہ ہیں سب مل کر لڑائی کے میدان میں اللہ اکبر کہتے ہوئے قتل کریں اور داؤ گھات میں رعایا
لوگ سپاہ کی تابعداری کریں اور سپاہ نے جو قواعد سیکھا ہے وہ سب ان کے مارنے میں خرچ کریں
اور جس قواعد سے وہ لڑیں اسی طرح کی قواعد سے یہ لوگ بھی ان کا جواب دیں مثلاً وہ بیٹھیں تو یہ
لیٹ جاویں وے فوج کو تین یا زیادہ ٹکڑے بانٹ کے کریں تو یہ بھی اسی قدر یا اس سے زیادہ
ٹکڑے کر ڈالیں اور ان کے ایک ٹکڑے کے مارنے کو دو دو تین ٹکڑے تیار ہو جاویں علی ہذا القیاس
جو قاعدے مقرر ہیں اس پر عمل کریں اور ایسی پلہ وار توپوں سے ماریں کہ ان کا گولا ان کو بچھا دے
اور ان کا گولا ان تک نہ پہنچے اور داؤں گھات سے دھوکہ دے کے چاروں طرف سے گھیر کے قتل
کریں اسی طرح سے جہاں کسی مکان میں گھسے چھپے ہوں تو وہاں جس طرف سے موقع پاویں اس
طرف سے بڑی توپیں قلعہ شکن سے اس مکان کو پست کریں یا اس میں گھسنے کے قابل راہ کر دیں
اور جب توپ مارنی شروع کریں تب مہلت نہ دیں اور کئی توپوں پر موافق یکبارگی بتی دیں اور
گولنداز موافق دستور کے آرام لیتے رہیں مگر توپ چلتی رہے اور ایک پہر لڑنا ہو تو سامان آٹھ پہر کا
موجود رہیں اور جہاں حملہ کریں وہاں ایک بارگی حملہ کریں اپنے تھوڑے آدمی ہر روز قتل نہ
کراتے رہیں اگر ایک بارگی حملہ کریں گے تو بھاری فوج کی ہیبت سے بدحواس ہو کے سب کفار
مارے جاویں گے اور ہمارے دین میں یہ ہے کہ جس وقت پر جو حکم ہو اس پر قائم ہو جاوے جس

طرح سے جب مینہ نہیں برستا استسقا کے واسطے میدان میں نکلنا ہوتا ہے ویسا ہی اب اس وقت میں امیر مقرر کرنے اور جہاد کرنے کا حکم ہے۔ جب امیر مقرر ہوگا تب سارے فساد مٹ جاویں گے اور جہاد قائم ہونے کا غل بڑھ جاوے گا اور ہر طرف سے غازی لوگ چلے آویں گے اور تمھاری فوج مور و ملخ کی سی ہو جاوے گی اور اس بات کی حقیقت یہ ہے کہ توبہ کے واسطے مرشد کے ہاتھ میں بیعت کرنا جیسا کہ سنت ہے ویسا جہاد کے واسطے امیر کے ہاتھ میں بیعت کرنا سنت ہے اور سنت کے بجالانے میں بڑے بڑے فائدے ہیں بڑی بڑی برکتیں اور مصلحتیں اور حکمتیں اور تاثیریں ہوتی ہیں مثلاً مرشد سے جب بیعت کرتے ہیں تو کس قدر اسے اعتقاد ہو جاتا ہے اور اس کی محبت کس قدر دل میں جم جاتی ہے اور اس کے سارے کام پسند معلوم ہوتے ہیں اور مرشد کے حکم سے اللہ کی راہ میں جان مال عزت و آبرو کا فدا کرنا سہل معلوم ہوتا ہے اسی طرح سے امیر بھی چونکہ ایک قسم کا مرشد ہے اس واسطے امیر کے حکم سے اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کو سہل معلوم کرے گا تو اس مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ جس شہر میں جو رئیس ہے اور اس کی حکومت اس شہر میں ہے وہاں پر دوسرے امیر کی تلاش کرنے کی حاجت نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے ایک امیر دے دیا اور ایک مقام میں دوسرا امیر قائم کرنا درست نہیں جیسا کہ عقائد کی کتابوں میں مذکور ہے تو اب سب لوگ اسی رئیس کو امیر مقرر کر کے اسی کے تابعدار ہو جاویں اور مرشد کی طرح سے اس کو سمجھیں اور اس کے حکم پر سب ایک دل ہو کے گوروں کو جلدی قتل کریں اور وہ امیر جس کو سپہ سالار مقرر کر دے دل و جان سے اس کے تابعدار ہو جاویں اور مرشد کی طرح سے اس کو سمجھیں اور اس کے حکم پر سب ایک دل ہو کے گوروں کو جلدی قتل کریں اور وہ امیر جس کو سپہ سالار مقرر کر دے دل و جان سے اس کے تابعدار ہو جاویں اور جس طرح سے ہو سکے ان کافر انگریزوں کو جلدی نکالیں اور امیر جیش یعنی سپہ سالار ساتھ رہے اور جیسا جیسا موقع ہو ویسا داہنے بائیں کی فوج کو حکم کرتا رہے اور دن رات لشکر کو داؤ گھات سے لڑاتا رہے جب لڑانے والا اچھا نہیں ہوتا تب لڑائی بگڑ جاتی ہے اچھا لڑانے والا تو جانوروں کو لڑا کے لڑائی مار لیتا ہے اور اپنی لڑائی کا طور بطور نمونہ کے بیان کرتے ہیں مباتی سپاہ بہادر خوب جانتے ہیں پہلے آدمیوں کو گن لے اور ان کا نام لکھ لے۔

اشتہار فتح اسلام

یہ اشتہار ہندوستان کے ہندو مسلمان کے پاس بھیجا جاتا ہے اس میں خوب غور کریں اور اپنے اپنے دین اور دہرم کی محافظت کے واسطے آپ کو سارے ہندو مسلمان عورت مرد انگریزوں کے قتل کرنے میں مستعد ہو جاویں نہیں تو نہ کسی کا دین بچے گا نہ دھرم نہ جان نہ بال بچے نہ عزت آبرو۔ ان انگریزوں مردودوں نے اس کارتوس کے جھگڑے کے پہلے سے اپنی ملکہ وکٹوریہ مردار کو لکھا تھا کہ ہندوستان کے مولویوں سے ہر ایک سو میں سے پندرہ مولویوں کا اور ہر ایک سو پنڈتوں میں سے پندرہ پنڈتوں کا اور پانچ لاکھ ہندو مسلمان سپاہی اور رعیت کا اگر خون معاف کردے تو کئی روز میں ہم لوگ سارے ہندوستان کو کرستان کر ڈالیں سو اس بدبخت کتیا مردار نے اس ناحق خون کی اجازت دی اور مطلق خوف نہ کیا کہ اللہ کے بندوں کے خون معاف کرنے کا ہم کو کیا اختیار ہے تب اس اجازت کے آنے کے بعد ان مردودوں نے کارتوس کا بہانا نکال کے قتل عام شروع کیا پھر اور کسی کو تو ان سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی چند روز میں جو کرستان نہ ہوتا اس کو قتل کرنے کے بارے اس پروردگار کے فضل سے سپاہ بہادر نے انگریزوں کو ہی قتل کیا اور ان کا سب زور مٹی میں ملا دیا اور ان کو ایسا کمزور کر ڈالا کہ اب ان کا مار لینا اور نکال دینا آسان ہو گیا، سو اب سپاہ بہادر اتنے باقی رہے موزیوں کو بھی مار لیں اور سارے رعایا لوگ بھی ان کے قتل کی تدبیر میں لگ جاویں اور سارے ہندو مسلمان ان کی کسی قسم کی نوکری نہ کریں اور ان کی نوکری میں مولوی اور پنڈت کے قتل کی شراکت سمجھیں اور سب مل کے انھیں کے قتل پر مستعد ہو جاویں تو خیر ہے اور نہیں تو خیر نہیں ہے ایسے قتل کے وقت میں مرد عورت لونڈی غلام پر ان کے قتل کے واسطے نکلنا فرض ہو گیا ہے سو اب اس کی تدبیر یہ ہے کہ سارے مولوی اور پنڈت لوگ ان کے نیچے

کی قباحت اور مارنے کا فائدہ اور ثواب گاؤں گاؤں شہر شہر میں بیان کرتے پھریں اور بادشاہ،
وزیر، رجواڑے نواب ان کو میدان میں ماریں اور انگریز مردود کسی شہر کے اندر آجاویں تو شہر کے
لوگ شہر سے نہ بھاگیں بلکہ دروازوں کو بند کرلیں اور چھت پر سے مرد یں اور عورتیں اور لڑکے اور
لونڈی غلام اور بڑھیاں بندوق قرابین پستول، نیزے اور پتھر اور اینٹ اور ڈھیلوں سے اور
ہانڈی اور ڈوئی اور پرانی جوتیوں سے اور جو کچھ ہاتھ آجاوے اسی سے ان مردودوں کو سنگسار کریں
اور جیسا کہ ابابیل نے اصحاب فیل کو سنگسار کیا تھا ویسا ہی تماشا دیکھیں اور شہر کی گلیوں میں سپاہی
چیشے اور ملا مخدوم پیر فقیر بنیے بقال تیلی تمولی اور سارے دوکاندار اور سارے شہر کے لوگ ایک دل
ہو کے ایکبارگی ٹوٹ پڑیں کوئی بندوق پستول قرابین تلوار تیر چھری و پیش قبض سے ان کو قتل کرے
کوئی ان کو دھرلے کوئی بنکیت تھکی دے کے ہتھیار چھین کے قتل کرے اور کوئی ان کے گلے لپٹ
جاوے کوئی ان کی کمر میں چمٹ جاوے کوئی کشتی کا پیچ چڑھا کے پچھاڑے چکنا چور کر ڈالے کوئی
لاٹھی مارے کوئی سونٹا مارے کوئی دھول دھپا کرے کوئی ان کی آنکھ میں دھول جھونکے کوئی جوتا
مارے کوئی گھونسا مارے کوئی ننگا مارے کوئی نوچے کوئی کھسوٹے کوئی کان مروڑ کے جڑ سے اکھاڑ
لے کوئی ناک توڑ ڈالے غرض جتنے جو بن پڑے لگا نہ رکھے اور یہاں تک تنگ کریں کہ ان کا دم
ناک میں آجاوے اس صورت میں اگر لاکھوں ہوں گے تو ان سے کچھ نہیں بن پڑے گی اور سب
کے سب مارے جائیں گے۔ انشاء اللہ تعالٰی۔ یہ اشتہار سب کو سنانا لازم ہے اور جاسوسی اور
ہرکارے نہایت ہوشیار اور چالاک اور بڑے خیر خواہ اور سچے اور نیک حلال مقرر کرے کہ ہر دن
رات کی بلکہ پہر پہر اور گھڑی گھڑی کی خبر دشمن کے لشکر کی پہنچایا کریں کیونکہ جاسوس ہاتھ پاؤں
ہیں۔ انگریز مردود جو اس بگڑے وقت میں بچے ہیں سو جاسوسوں کے زور سے۔ اور جب ایک فوج
ہند کی کسی مقام میں لڑتی رہے تو دوسری فوج ہر بات سے اس کی مدد کرتی رہے اگر چہ ان سے جان
پہچان نہ ہو یہ نہ جانیں کہ اگر ان کی شکست ہوگی تو ان کی بدنامی ہوگی بلکہ ہندوستان کی کسی فوج کی
شکست ہونے سے سارے اہل ہند کو شرم ہوگی اور جب کسی غنیم کی چڑھائی کی خبر سنے تب ساری
فوج سے مشورہ کرے اور سب کام چھوڑ کر غنیم کے دفع کرنے کی تدبیر میں دن رات غرق رہے اور
بعد مشورہ کے خوب چنے ہوئے جوان جو خود چھاپہ مارنے پر مستعد ہوں ایک ہزار پانچ سو یا زیادہ کم
بقدر حاجت کے چھانٹ کے متعین کرے کہ دے لوگ چھپے چھپے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک

مقام پر پہنچ کے چھپے رہیں اور جاسوس سے پکی خبر پا کے ان کی غفلت کے وقت اچکے میں جا پڑیں اور پہلے سے جو خدمتیں بانٹ پایا ہے اس میں لگ جاویں۔ کوئی لوگ خیموں کی رسیاں کاٹ دیں کوئی گھوڑوں کی اگاڑی پچھاڑی کاٹ دیں کچھ لوگ ہتھیاروں اور توپوں پر قبضہ کرلیں باقی لوگ بندوقوں کی باڑہ مار کے تلواروں سے کاٹ ڈالیں اور کچھ لوگ جنگلوں میں نالے کھوہوں میں چھپے رہیں ان کی رسد کو سائیس کو گھسیارے کو، سوار پیادے کو جاسوس کو دن رات مارا کریں اور کوسوں منزلوں یہی حال کردیں اور جہاں جہاں دریا ہوں وہاں کا بندوبست خوب کریں انشاء اللہ تعالیٰ غنیم دور ہی سے دفع ہوجائے گا اور جب میدان میں مقابلہ کرنا ہو تب مشورہ پکا کر کے اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے پہلے سب لوگ کمال حضور دل کے ساتھ اس خالق کی جانب میں دعا کرلیں پھر سب ہندو مسلمان اس کا نام لیتے ہوئے لڑیں اور چھاپہ مارنے میں میدان میں غنیم کو دھوکہ دینا سنت ہے اس کو نہ چھوڑیں مگر جو قبول کریں اس کو نہ توڑیں اور سب متفق ایک دل ہو کے لڑائی کے میدان میں ہوشیار ہو جاویں اور سپہ سالار اور سردار لوگ کو ولاسے دیتے رہیں اور کڑ خابو لتے جاویں خوب پکار کے میٹھی آواز سے للکاریں کہ ہاں بہادرو شاباش ہے، ہاں بہادرو خوب لڑے، ہاں بہادرو موزیوں کو مار لیا ہے، ہاں بہادرو کیوں نہ ہو تمھاری (ماں) پر صد آفریں جس کے دودھ میں یہ ہمت اور زور ہے، ہاں بہادرو اب فتح ہوئی، بڑھتے جاؤ بہادرو، بڑھتے جاؤ بھائیو بڑھتے جاؤ پہلوانوں، اب مار لیا ہے، تھوڑی سی ہمت اور کرو میرے بہادرو اب مار لیا ہے، دیکھو اب موزیوں کا پاؤں اٹھا، دیکھتے کیا ہو میرے بہادرو مار لو، ہاں میرے شیر وان گیدڑوں کو جھپٹ لو، واہ بہادرو کیوں نہ ہو آج ہماری شرم رکھ لی، بھائیو، آج ہماری ناک رکھ لی، واہ واہ غازیو آج ہماری عزت رکھ لی، ہاں بہادرو اس پگڑی کی شرم تم کو ہے، ہاں غازیو اس واڑھی کی شرم تم کو ہے، مارو بھائیو، مارو بہادرو، مارو غازیو میرے باپ ماں تم پر فدا ہوں، اور کبھی دشمن کو ڈپٹ کے کہے کیوں موزیو اب بھاگتے کہاں ہو، کیوں موزیو اب شیروں سے کام پڑا، کیوں حرام خورو اب نشہ اتر گیا کیوں نامردودوں اب قواعد بھول گئی۔ کیوں بھگوڑو اب تلوار چمکی، وعلیٰ ہذا القیاس، اب ایک اشتہار مفید مطلب سنو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشتہار ثانی

الحمدللّٰہ الذی و کفیٰ و الصلوٰۃ علی نبیہ الکریم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ و صحبہ ناصی لوالھم و جمیع تبعی الدین شریعت الاعظم بعد حمد و صلوٰۃ کے واسطے رفع حجت بروز قیامت و تبلیغ احکام شریعت کہ طریقہ سنت ہے۔ خادم الطلبہ واحقر الفقرا امیدوار رحمت رب غنی محمد لیاقت علی الہ آبادی چند باتیں ضروری فرمان واجب الاذعان الٰہی قرآن مجید و فرقان حمید اور ارشاد فیض بنیاد برگزیدہ لم یزل حضرت نبوی صلعم سے بخوبی ثابت و محقق کر کے مسلمان با ایمان کو سناتا ہے کہ جو بدعات ظلم و فساد ساری سلطنت ہندوستان میں خصوصاً الہ آباد میں کفرہ فجرہ نصاریٰ کا علی العموم اوپر ہر ایک مومنین متبع اسلام کرام کے از قتل غارتگری و آتش زدگی و قتل و پھانسی و کھندگی مکان و چھاپہ زنی و خونریزی علماء مشائخان و احراق کلام اللہ و احادیث و کتب فقہ وغیرہ ہو رہا ہے اظہر من الشمس ہے۔ اس صورت میں ہر ایک مومنین مخلصین کو لازم ہے کہ مستعد جہاد ہو جاویں بموجب ارشاد فیض بنیاد آنحضرت صلعم کے **لکل شئی حرفۃ و حرفتی الجہاد** واسطے ہر شے کے پیشہ ایک مقرر رہا ہے اور پیشہ ہے میرا جہاد۔ فائدہ بے شک جس نے پیشہ اپنا جہاد چھوڑ دیا، وہ ذلیل اور خوار اور فقر و فاقے میں گرفتار ہوا فقط اب بموجب **ان الجنۃ تحت ظلال السیوف** فائدہ اخروی اُٹھاویں اور درجہ شہادت کا جس میں زندگی ہمیشہ کی ہے اور نعماء جنت اور ازواج حوران بہشت پاویں اور کسی طرح کا شک و خطرۂ بد دل میں نہ لاویں اور جان و مال سے اور تکثر سواد و رائے صائب و ہتھیار وغیرہ سے جہاں تک ممکن ہو شرکت بجا لاویں۔ ایسا نہ کریں کہ اوقات سعید و اوان حمید میں شرکت سے محروم رہیں اور پچھتاویں اور جو شخص کہ اس

مقدے میں پیشوائی کرے اسی کو اپنا امام سمجھ کر بموجب الجهاد واجب عليكم مع كل أمير
براً كان أو فاجراً کی تابعداری کریں کیونکہ قرآن مجید و فرقان حمید فضائل جہاد سے بھرا ہوا
ہے۔ ظاہر ہے کہ سورہ توبہ میں جا بجا ارشاد ہے اور احباب سے امید ہے کہ انتظار عامہ بیام نام
بنام جداگانہ نہ کریں۔ صرف اس اعلام کو کافی ووافی بوجھ کر ہر صاحب اپنے ملاقاتی و احباب سے
ارشاد کردیں اور جہاد میں بڑا سامان یہ ہے کہ بندے توکل بخدا کریں اور امداد جانب خالق کون
مکان سے ہو سو امداد غیبی صریح ظاہر و باہر کہ مسلمان ہندوستان کے بسبب بے استطاعتی زر و عدم
موجودگی گولہ بارود و توپ و لشکر مجبور و ناتواں ہو رہے تھے سو اس خالق احد اللہ الصمد نے دین احمد
صلعم کو جیسا کہ باطنا قوی و توانا کیا ہے ویسا ہی ظاہراً ہے سب سامان واسطے تسکین خاطر ناتر نم ضعفا
مسکینان اور امداد دین متین کے انھیں کفار نابکار نصاریٰ بد اطوار سے بلا سبب و کوشش ہم لوگوں کے
دلا دیا۔ چنانچہ لشکر سوار و پیادہ توپ و گولہ باروت و زر کثیر خصوصا قلعہ شقہ عطیہ حضرت فرمانروائے
کشور ہند ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی بادشاہ دہلی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ وعموماً امداد عساکر و
اتواپ و دیگر زین جناب برجیس قدر دام اللہ حشمتہم والی لکھنؤ سے اور ہمراہی تمام مہاراجگان
قلمرو لکھنؤ و راجگان قرب و جوار الہ آباد وغیرہ اور اخلاق و اتفاق سارے ہندوستان میں باوصف
ہونے اختلاف اقوام مذاہب کے سو یہ سب دلائل کامل و براہین مدلل کر بندی اوپر اندفاع اس
قوم نصاریٰ طاغی باغی کے ہے۔ مناسب ہے کہ جو بھائی مسلمان اس خبر فرحت اثر کو سنے وہ فوراً
مستعد ہو کر کمر ہمت جہاد باندھیں اور تا شہر الہ آباد تشریف لاویں اور قلعہ بند کفار نابکار کا قلع قمع
کرکے بزور تیغ بیدریغ انہی کے خاک میں ملادیں اور باقی ماندہ کو اس ملک سے بھگادیں پھر با
اطمینان حکومت عدالت اسلام فرماویں۔ اب بہ سبب خوف طوالت کے تمام کرکے چند آیات
طیبات ذیل عبارت مرقومہ بالا معہ ترجمہ ہندی درج ہے۔

"قال الله تبارك و تعالیٰ فی سورة التوبه: الذين آمنوا و هاجروا و
جاهدوا فی سبیل الله بأموالهم و أنفسهم أعظم درجة عند الله و
أولئک هم الفائزون☆ یبشرهم ربّهم برحمة منه و رضوان و جنّٰت
لهم فیها نعیم مقیم☆ خلدین فیها ابداً، انّ الله عنده أجر عظیم☆ یا

أيها اللذين آمنوا لاتتخذوا آباء كم و اخوانكم أولياءَ إنِ استحبّوا الكفر علی الایمان و من يتولّهم منكم فأولئک هُم الظالمون☆قل إن كان آباء كم و أبناء كم و اخوانكم و ازواجكم و عشيرتكم و اموالٌ ﹰاقترفتموها و تجارة تخشون كسادها و مسٰكنُ ترضونها أحبَّ إليكم مِن الله و رسوله و جهادٍ فی سبيله فتربصوا حتیٰ ياتی الله بامره، و الله لا يهدی القوقوم الفاسقين☆"

(ترجمہ فرمایا خدائے پاک و برتر نے سورۂ توبہ میں جو یقین لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان سے ان کو بڑا درجہ ہے اللہ کے پاس اور وہی پہنچے مراد کو، خوشخبری دیتا ہے ان کو پروردگار ان کا، اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی، جن میں ان کو آرام ہے ہمیشہ کا رہا کریں ان میں مدام، بے شک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔ اے ایمان والوں نہ پکڑو اپنے باپوں کو اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر ایمان سے اور تم میں ان کی رفاقت کرے سو وہی لوگ ہیں گنہگار۔ تو کہہ اگر تمھارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو کماتے ہو اور سوداگری جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور حویلیاں جو پسند رکھتے ہو تم کو عزیز ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو راہ دیکھو جب تک بھیجے اپنا حکم اور اللہ راہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو)

"یا ایھا الذین آمنوا ما لکم إذا قیل لکم انفروا فی سبیل الله اثاقلتم إلی الأرضِ أرضيتم بالحيوة الدنيا من الآخرة، فما متاع الحيوة الدنيا فی الآخرة إلاّ قليل☆إلاّ تنفروا يعذبكم عذاباً اليماً ، و يستبدل قوماً غيركم و لاتضروه شيئاً، والله علی كل شئ قدير☆"

(اے ایمان والو کیا ہوا ہے تم کو جب کہیے کوچ کرو اللہ کی راہ میں ڈھے جاتے ہو زمین پر، کیا ریجھے ہو دنیا کی زندگی پر آخرت چھوڑ کر؟ سو کچھ نہیں دنیا کا نفع برتنا آخرت کے حساب میں مگر تھوڑا، اگر نہ نکلو گے تم کو دے گا دکھ کی مار اور بدل لا دے گا اور لوگ

تمہارے سوا اور کچھ نہ بگاڑو گے اس کا، اور اللہ سب چیز پر قادر ہے۔)

"انفروا خفافاً و ثقالاً و جاهدوا بأموالكم و أنفسكم في سبيل الله، ذلكم خير لكم إن كنتم تعلمون☆ "

(نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے۔)

"قال الله و تبارک في سورة الصف: "إن الله يحب الذين يقاتلون في سبيله كأنهم بنيان مرصوص☆"

(فرمایا خدا برتر و پاک نے سورہ صف میں: اللہ چاہتا ہے ان کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر جیسے سیسہ وہ دیوار میں پلائی۔)

"يا أيها الذين آمنوا هل أدلكم على تجارة تنجيكم من عذاب أليم☆تؤمنون بالله و رسوله و تجاهدون في سبيل الله بأموالكم و أنفسكم، ذلكم خير لكم إن كنتم تعلمون☆يغفر لكم ذنوبكم و يدخلكم جنت تجري من تحت الأنهار و مسكن طيبة في جنت عدن،ذلك الفوز العظيم☆و أخرى تحبونها نصر من الله و فتح قريب و بشر المؤمنين☆"

(اے ایمان والو میں بتاؤں تم کو ایک سوداگری کہ بچائے تم کو دکھ کی مار سے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور جان سے۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر سمجھ رکھتے ہو۔ بخشے وہ تمہارے گناہ اور داخل کرے تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں شیریں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے باغوں میں۔ یہ ہے مراد ملنی اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو۔ مدد اللہ کی طرف سے اور فتح شتاب اور خوشی سنا ایمان والوں کو۔)(1)

1. Kanahya Lal, Maharbal-i-Azeem, pp 199-20